ہبہ الدباغ

ترجمہ

میمونہ حمزہ

# صرف ۵ منٹ!

شام کی جیلوں میں گزارے ہوئے لرزہ خیز مظالم کے ۹ سال

یہ ھبہ الدباغ کے ایامِ اسیری کی خودنوشت ہے، جو شام کے دارالحکومت دمشق میں یونی ورسٹی میں شریعہ کی طالبہ تھیں۔ یہ حافظ الاسد کا ظالمانہ دورِ حکمرانی تھا جس نے اسلامی فکر کے حامل عوام کو بے دردی سے کچلا۔ دسمبر ۱۹۸۰ء کی ایک سرد رات جب وہ فائنل ایر کے امتحان میں مشغول تھیں، انہیں حکومتی خفیہ اداروں نے بلا جرم تحویل میں لے لیا اور نو برس تک الم ناک عذاب میں قید رکھا۔ اسی قید کے دوران ان کے والدین اور بہن بھائیوں کو بھی بد ترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا، کچھ عرصہ ان کی والدہ بھی ان کے ہمراہ قید رہیں، اس حال میں کہ بیٹی کو ماں سے ملنے کی اجازت نہ تھی، اسی عقوبت خانے میں ان کے بھائی نوارف الدباغ بھی قید کیے گئے جنھیں بعدازاں شہید کر دیا گیا۔ یہ اسلام کی اس عظیم بیٹی کی داستان ہے جس کے والدین اور آٹھ بہن بھائیوں کو اس دور کے طواغیت نے شہید کر دیا، مگر اس کے پائے استقلال میں لرزش نہ آئی۔ یہ اشکوں اور لہو کی روشنائی سے لکھی گئی کوڑوں، قہر اور عذاب کی داستان ہے، جو قدم قدم پر اس آزاد مگر محکوم سرزمین پر برپا ظلم وطغیان کا قصہ بیان کرتی ہے، جہاں ایسی سیاہ تاریکی ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔

❖❖❖

# Ebook By
# Anis ul Hassah Shah

https://web.facebook.com/Shah.AnisulHassan/

https://wa.me/message/923142893816

# صِرف ۵ منٹ

ہبہ الدباغ

# صرف ۵ منٹ

شام کی جیلوں میں گزارے ہوئے لرزہ خیز مظالم کے ۹ سال


ہبہ الدباغ

ترجمہ

میمونہ حمزہ



منشورات

نام کتاب : صرف پانچ منٹ!

: ہبہ الدباغ

: میمونہ حمزہ

: راشد الیاس مہر

: اپریل ۲۰۱۲ء

۱۱۰۰

04214

منشورات، منصورہ، ملتان روڈ، لاہور ۔ ۵۴۷۹۰

فون: 3543 4909 - 3542 5356

فیکس: 042 - 3543 4907

ای میل: manshurat@hotmail.com

manshurat@gmail.com

نا پرنٹرز، بندروڈ، لاہور۔

# ترتیب

❖❖

# حرفِ چند

نقشے پر چھوٹا سا ملک شام، ایک سال سے زائد عرصہ ہو گیا ہے، دُنیا کی خبروں کا موضوع اور عالمی طاقتوں کا اکھاڑا بنا ہوا ہے۔ یہاں کے حکمران اپنے عوام کے قتل و غارت اور ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنے میں مصروف ہیں۔

صرف ۵ منٹ! سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی آج کی کہانی نہیں۔ یہ ۸۰ کے عشرے کی، ایک خاتون کی روداد ہے جو پورے ملک میں جو کچھ ہو رہا تھا، اس کی بس ایک جھلک ہے۔ اس کتاب کے مسودے کو پڑھنے تک ایک تاثر سا تھا کہ جمال عبد الناصر کی جیلوں میں اخوان المسلمون کے قائدین اور کارکنوں کے ساتھ جو ظلم و تعذیب روا رکھا گیا اس کی کوئی نظیر نہ ہوگی۔ خصوصاً خواتین کے ساتھ جو کچھ ہوا اور جس کی روداد محترمہ زینب الغزالی نے بیان کی ہے، اسے پڑھ کر تو یقین نہیں آتا کہ انسان اتنا نیچے بھی گر سکتے ہیں۔ آفرین ہے ہماری ان عرب مسلمان بہنوں اور بھائیوں پر جنھوں نے صبر و برداشت اور استقامت کی نئی روشن تاریخ رقم کی۔ خیال آتا ہے کہ تیونس اور لیبیا میں بھی یہی کچھ ہوا ہوگا' جس کی تفصیل ہمارے علم میں نہیں۔ معیاری تراجم کرنے اور شائع کرنے کا کوئی نظام نہ ہونے کی وجہ سے یہ دوریاں ہیں۔

یہ حسن اتفاق تھا کہ محترمہ میمونہ حمزہ کی نظر اس کتاب پر پڑی اور مزید حسن اتفاق یہ کہ اس کی اشاعت کے لیے ان کی نظر منشورات پر پڑی۔ اس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

ہم دورِ رسالت ﷺ کے بارے میں پڑھتے ہیں کہ کفارِ قریش ایمان لانے والوں کو اپنے

ظلم و ستم کا نشانہ بناتے تھے۔ لیکن غالباً یہ انفرادی اقدامات تھے۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں دشمن اپنے پورے لاؤ لشکر اور قہر سامانیوں کے ساتھ تعذیب کے نئے نئے ہتھیار اور طریقے ایجاد کر کے ایمان کے تقاضے پورے کرنے کا 'جرم' کرنے والوں پر جو مظالم ڈھاتے ہیں، عرب جاہلیت کے نمائندے شاید اس کا سوچ بھی نہ سکتے ہوں۔

پوری دُنیا میں اردو پڑھنے والوں کی خدمت میں ہم صرف ۵ منٹ! اس لیے پیش کر رہے ہیں کہ ہم سب اپنے قربانی دینے والے بھائیوں اور بہنوں کے لیے بلندی درجات کی دُعا کریں، اور اپنا جائزہ بھی لیں کہ ہم کلمہ گو مسلمان اسلام کے لیے کیا کچھ کر سکتے ہیں۔

اللہ سے دُعا بھی کریں کہ ہمیں ایسی آزمائش میں نہ ڈالے جو ہم اُٹھا نہ سکتے ہوں، ایمان اور اس پر استقامت عطا فرمائے، دُنیا اور آخرت میں فوز و فلاح سے نوازے۔

حقیقت، کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی کہ یہ کتاب خود آپ سے بولے گی۔

مسلم سجاد

۲۴/مارچ ۲۰۱۲ء

❖❖❖

# تقریظ

ہبہ الدباغ کی خون کے آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی سچی کہانی کا ترجمہ میمونہ حمزہ نے عربی زبان سے سلیس اور رواں اردو میں کیا ہے۔ ترجمہ میں بھی وہی خلوص اور درد قارئین تک منتقل کیا ہے جو میمونہ حمزہ نے خود محسوس کیا۔ شام کے تعذیب کدوں کے نو برس کا ہر دن درد و الم کی ایک نئی داستان لے کر طلوع ہوتا رہا۔ ہبہ الدباغ کا پورا خاندان اس الم ناک داستان کا مرکزی کردار ہے، لیکن اس میں ایسی پاکیزہ روحوں کی کہانیاں بھی شامل ہیں جن میں سے ہر ایک ایمان ویقین کی چنگاریوں کو دلوں میں تازہ کرنے کا پیغام دیتی ہے۔

الاخوان المسلمون کے قائدین اور کارکنوں نے حق کے راستے پر منزل تک پہنچنے کے نشان روشن کر دیے ہیں۔ ان کے مضبوط ایمان اور جادۂ حق پر استقامت کے نتیجے میں ظالم شکست سے دوچار ہیں اور شہادت کی موت کو اپنی سب سے بڑی آرزو کے طور پر دلوں میں بسانے والے اس دُنیا کی زندگی میں بھی منزل سے ہم کنار ہو رہے ہیں لیکن اصل کامیابی تو آخرت کی کامیابی ہے۔ جس کی امید پر عالم عرب کی بے شمار سعید روحوں نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

درد میں ڈوبی ہوئی اس داستان کا ہر ورق اللہ کے راستے میں اپنی نذر پوری کرنے کے لیے عشاق کو مضطرب اور بے چین کرنے والا ہے۔ بعض کردار دلوں پر مستقل نقش قائم کرنے والے ہیں۔ مثال کے طور پر حلب کی ''الحاجہ مدیحہ'' جو ''ہبہ'' کے بقول چٹی ان پڑھ لیکن ایمان کے نور

سے منور تھیں اور تعذیب خانوں میں خواتین اور بچوں کو مسلسل صبر و ثبات کا درس دینے کے لیے بے چین رہتی تھیں۔ انھوں نے ظالموں کے جبر کے ہتھیار کو صبر کے ہتھیار سے کند کر دیا تھا۔

ظلم کے سامنے اسلامی تحریک کے کارکنوں کے ثبات کی یہ سچی داستان جو ہر طرح کے مبالغے سے پاک ہے اور جس کا ہر لفظ صدق و صفا کا رنگ لیے ہوئے ہے، قائدین کے لیے ایک پیغام ہے کہ ان کے کارکن ہر طرح کی تکلیفیں اور مصیبتیں جھیل کر ان سے توقع رکھتے ہیں کہ باطل کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے حق کے راستے میں دی ہوئی قربانیوں کا سودا نہ کریں کہ بقول اقبالؒ

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانہ حق و باطل نہ کر قبول

اے اللہ ہمیں قیامت کے دن ان پاکیزہ روحوں کے سامنے شرمندگی اٹھانے کے عذاب سے محفوظ فرما۔ آمین۔

قاضی حسین احمد

۱۶؍دسمبر ۲۰۱۱ء

# عرضِ ترجمہ کار

یہ پانچ چھ برس پہلے کی بات ہے، میں ''مکتبہ ابنِ کثیر'' کویت میں ایم۔فل کے تحقیقی مقالے کے لیے کچھ کتب تلاش کر رہی تھی، جب میری نظر اس کتاب ''خمس دقائق وحسب'' (صرف پانچ منٹ!) پر پڑی، نام بڑا دلچسپ لگا۔ کتاب کی مصنفہ ''ہبہ الدباغ'' میرے لیے انجان تھیں، مگر زینب الغزالی الجبیلی کا کسی کتاب کا مقدمہ لکھنا ہی اس کی اہمیت بتانے کے لیے کافی تھا۔ گھر جا کر اسے الٹ پلٹ کر دیکھا، مگر پھر ایک عرصے تک میں تحقیقی مقالہ لکھنے میں گم رہی۔ پھر جب میں نے اسے پڑھنا شروع کیا، تو یہ اختتام تک نہ صرف میرے ساتھ رہی، بلکہ میرے دل میں اسے اردو زبان کے قارئین تک پہنچانے کی خواہش بھی پیدا ہو گئی۔ میں نے خواتین کے ایک مجلّے کو اس کی کچھ اقساط بھیجیں، انھوں نے اس کاوش کو پسند بھی کیا، مگر یہ کہہ کر شائع کرنے سے معذرت کر لی کہ ان کے خیال میں کہیں اس کا ترجمہ پاکستان میں خواتین پر تشدد کے لیے مہمیز کا کام نہ دے۔ میں نے ان سے جواباً یہی کہا کہ پھر آپ کے خیال میں تو سمیہ، زنیرہ، فاطمہ اور بلال، صہیب اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنھم کا تذکرہ بھی نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ اس سے بھی آج کے ظالموں کے ظلم کو مہمیز مل سکتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے شائع نہ ہونے کے باوجود لال مسجد اور جامعہ حفصہ کا افسوس ناک واقعہ پیش آیا۔

اس کے بعد ہبہ الدباغ کی یہ خودنوشت مجلّہ ''جہادِ کشمیر'' میں قسط وار شائع ہوتی رہی۔ اب یہ پہلی مرتبہ کتابی صورت میں آ رہی ہے۔ آج شام میں پھر ہنگامی صورتِ حال ہے، طاغوت

پھر سے اپنے لاؤ لشکر اور اسلحے سمیت میدان میں ہیں اور وہ انسانی حقوق اور آزادیوں کو للکار رہے ہیں اور غیر سرکاری اعداد و شمار کے مطابق گذشتہ دنوں میں ۷۰۰ سے زائد بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے ہیں۔ اگر ساری ہنگامی صورتِ حال کے مقتولین کو شمار کیا جائے تو نجانے کتنا نقصان ہو چکا ہے۔ آج بھی نہ جانے کتنی ہمائیں جیل کی کال کوٹھڑیوں میں جوانیاں جلا رہی ہوں گی، اللہ ان کی مدد فرمائے۔ (آمین)

گر چہ تنگ بہت تھیں راہیں شہرِ وفا کو جانے کی
اپنے لہو سے روشن کر دیں گلیاں اس ویرانے کی
جان تھی اک سو حاضر کر دی پھر بھی رہے شرمندہ سے
دل والے خود ہی لکھ لیں گے سرخی اس افسانے کی

اللھم أعز الاسلام والمسلمین
اللھم أید الاسلام والمسلمین

میمونہ حمزہ
اسلام آباد
maimoona-hamza@yahoo.com
rhbhatti@yahoo.com

# پیش لفظ

''اور یہ ظالم جو کچھ کر رہے ہیں، تم اللہ کو اس سے غافل نہ سمجھو۔ وہ تو صرف انھیں اس دن تک ڈھیل دے رہا ہے جس روز آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی، وہ اپنے سر اوپر اٹھائے دوڑ بھاگ کر رہے ہوں گے، ان کی نگاہیں ان کی اپنی طرف بھی نہ لوٹیں گی، اور ان کے دل خالی اور اڑے ہوئے ہوں گے، اور لوگوں کو اس روز سے خبر دار کر دیجیے، جس روز عذاب ان کے پاس آجائے گا، تو ظالم پکار اٹھیں گے، اے ہمارے رب ہمیں تھوڑی سی مہلت اور دے دے، ہم تیری دعوت قبول کریں گے اور رسولوں کی پیروی کریں گے، کیا اس سے پہلے بھی کڑی کڑی قسمیں کھا کر تم یہی نہیں کہتے رہے، اب اس نے ہٹنے کی کوئی صورت نہیں۔ اور تم انھیں لوگوں کے مساکن میں نہیں رہتے تھے جنھوں نے اپنے اوپر ظلم کیا، اور کیا تم پر یہ معاملہ کھلا نہیں کہ ہم نے ان کے ساتھ کیسا کچھ کیا، ہم نے تمھارے لیے بہت سی مثالیں بیان کی ہیں، وہ اپنی چالیں چل رہے ہیں، اور اللہ ان کی چالیں جانتا ہے، اور ان کی چالیں ایسی نہ تھیں کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائیں۔ اور تم ہرگز گمان نہ کرو کہ اللہ اپنے رسولوں سے کیے ہوئے وعدے کی خلاف ورزی کرے گا، اللہ بڑا ہی غالب اور بدلہ لینے والا ہے۔ جس روز زمین اس زمین کے سوا اور ہی بدل دی جائے گی اور آسمان بھی، اور سب کے سب اللہ واحد القہار کے روبرو ہوں گے، اور آپ اس روز مجرموں کو دیکھیں گے کہ وہ زنجیروں میں ملے جلے ایک جگہ جکڑے ہوئے ہوں گے۔

ان کے لباس گندھک کے ہوں گے، اور آگ ان کے چہرے پر چھارہی ہوگی۔ یہ اس لیے ہوگا کہ اللہ ہر شخص کو اس کے کیے ہوئے اعمال کا بدلہ دے، بے شک اللہ کو حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ یہ تمام لوگوں کو پہنچانے کے لیے ہے، تاکہ انھیں اس کے ذریعے سے خبردار کیا جائے، اور انھیں بخوبی معلوم ہو جائے کہ وہ ایک ہی معبود ہے، اور عقل مند لوگ نصیحت حاصل کریں۔" صدق اللّٰہ العظیم۔ (سورہ ابراہیم ۴۲۔۵۲)

امابعد...... یہ آج کے دور کی کتابِ زندگی کی کچھ سطور ہیں، جس میں ہبہ نے اپنے اور اپنی ساتھیوں پر گزرنے والے الم اور عذاب کو بیان کیا جب وہ شام (Syria) کی جیلوں میں بند کر دی گئی تھی، جہاں اس پر اس قدر سختیاں توڑی گئیں اور اتنا ہول ناک تشدد کیا گیا جو بچوں کو بھی بوڑھا کر دے۔ یہ خون اور آنسوؤں سے لکھی ہوئی سطور ہیں، جو کوڑوں، قہر اور عذاب کی بارش بن لکھی گئیں، یہ اس ظلم اور طغیان کا قصہ ہے جو ہمارے اپنے ہی ممالک میں آزاد بندوں کی آزادی مصلوب کرنے کے لیے بپا کیا گیا ہے اور ظلم کو اس سرزمین پر رہتے ہوئے اتنا عرصہ بیت گیا ہے کہ اب اس نے انڈے بچے بھی دے دیے ہیں اور ظلم در ظلم نے اتنی تاریکی پھیلا دی ہے کہ اس رات میں ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہیں دیتا!

ظالم کیا چاہتے ہیں؟ کیا وہ ایسی مملکت کے خواب دیکھ رہے تھے جس میں وہ سرگرداں [illegible] رہیں اور بلا روک ٹوک مزے کرتے رہیں، اور عیش و آرام سے جئیں؟ اور اگر انھیں یہ [illegible] مترقبہ مل بھی جائے، تو کیا وہ ہمیشہ جی لیں گے، یہ دنیا انھیں ہمیشہ یوں ہی ملی رہے گی، [illegible] طور پر ایک روز ان کے اقتدار کا سورج غروب ہو جائے گا اور یہ شان و شوکت [illegible] کسی اور کو منتقل ہو جائے گا، اور ایک بار یہ کسی اور کے ہاتھ میں پہنچ گیا تو انھیں اس [illegible] ملے گا [illegible] یا وہ مال چاہتے ہیں جسے وہ اپنی لذات و شہوات کی تسکین پر لگا دیں، [illegible] خوش [illegible] ہے، اور وہ انھیں ان کے امراضِ نفسانیہ سے نجات دلا سکتا ہے، [illegible] سکتے ہیں؟ یا وہ چاہتے ہیں کہ اصول پسندوں کو ان کے

اصولوں سے دور کر دیں اور اصحاب عقیدہ کو ان کے عقائد سے پھیر دیں، تو کیا ایسا کرنا ان کے بس میں ہے؟ کیا ایسا نہیں کہ جب سے انھوں نے جبر کا کوڑا چلانا شروع کیا ہے اہل ایمان کا ایمان اور سپردگی کچھ اور بڑھ گئی ہے، انھوں نے زیادہ مضبوطی اور عزم سے ان اصولوں کو تھام لیا ہے، انھوں نے عزیمت کی راہ اختیار کر لی اور روشنی کے راستے کا انتخاب کر لیا ہے، اللہ کی راہ میں انھوں نے اپنی روحیں، جسم اور خون سستے کر دیے ہیں (بلاشبہ اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں)۔

اللہ نے اپنے اوپر ظلم کو حرام ٹھہرایا ہے، اور اسے اپنے بندوں کے بیچ بھی حرام قرار دیا ہے، پھر اس ظلم کی سختی اور قساوت کیا ہوگی جب وہ آپ جیسوں (مسلمانوں) کے ہاتھوں سرزد ہو رہا ہو، خاص طور پر جبکہ ان کے نام بھی ہمارے جیسے ہی ہیں، وہ بھی اسی مٹی کے اناج اور پھل کھاتے اور اسی کے چشموں سے پانی پیتے ہیں...... پھر وہ دشمنوں سے بھی بڑھ کر ہمارے دشمن بن گئے!

مجھے خود بھی جمال عبدالناصر کی سرکش جیلوں میں زندگی کے کئی پر ہول برس گزارنے کا تجربہ ہوا ہے، میں نے جیل کی تلخی اور قساوت سہی ہے، یہ کتاب اسی ظلم کی تکرار کی داستان ہے، جو کسی اور سرزمین کی سرکش جیلوں میں ننگا ناچ ناچتا رہا...... آہ۔ اس دور میں سرکشی کس قدر بڑھ گئی ہے...... لیکن اللہ مہلت دیتا ہے، بھولتا نہیں۔ میں مزید کچھ نہیں کہنا چاہتی، اس کتاب کے واقعات پر مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں کہ اللہ اپنے فیصلے کو غالب کرنے والا ہے۔

زینب الغزالی الجبیلی

❖❖❖

# مقدمہ

''ہم دنوں کو لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں''

ہماری زندگی رنگ برنگ دائروں سے عبارت ہے جو کبھی انسان کی زندگی کو اپنی سفیدی سے روشن بنا دیتے ہیں اور کبھی اسے تاریکی کے سیاہ رنگ میں رنگ دیتے ہیں۔ میں اپنی زندگی کے بارے میں سوچتی ہوں تو وہ کسی تروتازہ پھول سے بھی زیادہ دل کش تھی، جس میں میرے پیارے والدین کی محبت اور شفقت کی خوشبو رچی بسی تھی۔ ہمارے گھر میں محبت کی گرمی کا احساس ہوتا اور نیکی اور اللہ کی رضا حاصل کرنے میں بھاگ دوڑ کی فضا نظر آتی، اور ہر جانب خوشی اور سعادت کے پھول کھلتے تھے۔ میں نے اس چمن میں باپ کی چہیتی اور ماں کی رازدار کی حیثیت سے زندگی بسر کی، میں اپنے سات بھائیوں اور چار بہنوں کے بیچ کسی شہزادی کی مانند رہتی تھی۔ میں ان کی ہم نوالہ و ہم پیالہ تھی۔ پھر کیا ہوا؟ میرے سارے خواب امیدوں کے سرہانے پر دھرے رہ گئے۔ ذرا سی دیر کو جاگی تو سب کچھ مٹ چکا تھا۔ اور میں راحت کے ان لمحوں اور انسیت اور رضا کے کھو جانے پر چلا بھی نہ سکی۔

میں کبھی بھی کسی پارٹی میں شامل نہ ہوئی۔ اس کے باوجود کہ میری پرورش دینی ماحول میں ہوئی تھی، میں فقہ و تجوید کے دروس میں شریک ہوتی تھی اور مجھے کتاب اللہ کو حفظ کرنے کا شدید اشتیاق تھا۔ اور اس کے باوجود کہ تعلیم کے مراحل میں اگلے مرحلے پر پہنچی تو میرا انتخاب شریعہ کالج تھا، یونیورسٹی کے شریعہ ڈیپارٹمنٹ سے منسلک ہونے کے باوجود میں کسی تنظیم یا حزب

میں شامل نہ ہوئی۔ ایسا نہیں تھا کہ میں ان تنظیموں اور پارٹیوں کو جانتی نہ تھی جو ظالم شامی نظام کے خلاف صف آرا تھیں، یا میں ان حکومتی اعمال سے بے خبر تھی جو وہ ان جوانوں کو دبانے کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ قید خانے میں میرے ہمراہ جہاں اصحابِ سیاست کی ایک بڑی تعداد تھی وہیں ہمارے ہم وطن غیر سیاسی لوگ بھی تھے۔ یہ سب بھی میری ہی مانند جبر کے کوڑے تلے زندگی گزار رہے تھے۔ اور خود اس نظام کو چلانے والے بھی کسی حد تک ظلم کا شکار تھے، یعنی وہ بھی ظلم و قہر سے مستثنیٰ نہ تھے۔ میں اپنے وطن کی ہزاروں بیٹیوں ہی کی مانند زندگی گزار رہی تھی اور انھیں کی مانند مختلف مراحل سے گزرتی میں یونیورسٹی میں پہنچ گئی۔ شوقِ علم نے میرے اور ان کے درمیان پہلی مرتبہ فراق پیدا کر دیا۔ میں انھیں حمات چھوڑ کر دمشق چلی آئی۔ میں اس قوی ذات پر بھروسہ کرتے ہوئے ان سے الگ ہوئی...... لیکن یہ وقتی فراق اور محدود و متعین جدائی، جبر اور ظلم کے کوڑے اور قہر کی بارش میں تبدیل ہوگئی، جس نے مجھے تنگ و تاریک قید خانے میں پھینک دیا اور کتنے ہی برس بیت گئے، پھر انھیں ظالموں نے مجھے اس شقاوت بھری دُنیا سے کھینچا اور الرؤوف الرحیم کی رحمتوں کے مستقر میں داخل کر دیا...... جبکہ یہ دُنیا بھی میرے لیے اجنبی ہو چکی تھی...... اس کی صورت مسخ ہو چکی تھی اور میری یہ دُنیا بھی تاریک ہو گئی تھی...... یہاں امیدوں کے پھول پھل لانے سے پہلے ہی مرجھا کر سوکھ چکے تھے۔

میں اتنا عرصہ جیل کی کال کوٹھڑی میں اپنے بھائی کی ''رہین'' کے طور پر رہی، جو پرجوش سیاسی کارکن تھا۔ میری زندگی کے بہترین سال قاتل وحشتوں کی نذر ہو گئے، میرے اعضا شل ہو گئے، اور میری روح نے بڑھاپے کی چادر اوڑھ لی۔ صرف ایک افترا کے سبب جو مجھ پر باندھا گیا، ایک جھوٹ جو مجھ سے منسوب کیا گیا، مجھے ظالم تحقیقات کے بہانے لے کر گئے، لیکن انھوں نے جان بوجھ کر اس حقیقت پر پردہ ڈال دیا، اور اپنے کرائے کے مخبروں کی کوششوں کو رائیگاں نہیں جانے دیا، نہ اپنی گاڑیوں کے اس کاروان کی محنت کو، جو رات کی تاریکی میں خاموشی سے مجھے لینے آیا تھا، بے ثمر جانے دیا!! میں نو برس تک جیل کے ایک سیل سے دوسرے اور ایک بلاک

سے دوسری اور ایک جیل سے دوسری جیل میں منتقل ہوتی رہی۔ نو بجر برس..... ان برسوں میں انسانی رحم کا ہر دروازہ مجھ پر بند کر دیا گیا۔ ان کی سزاؤں نے میرے اندر اٹھنے والی ہر امید کا دم توڑ دیا اور بنی نوع انسان سے متعلق ادنیٰ سی آس بھی معدوم ہو گئی۔ صرف اللہ سے اُمید زندہ رہی، میرے دل میں اس امید کا شعلہ نہ بجھا، اگرچہ وقت گزرنے کے ساتھ یہ بھی دھیما ہو گیا۔ لیکن یہ امید کتنی باقی رہی؟ میں کچھ نہیں کہہ سکتی، بلکہ ایسا لگتا ہے کہ کچھ عرصہ تو آلام ومصائب نے اسے بالکل ہی محدود کر دیا تھا۔ میری التجاؤں کا مخاطب تب بھی میرا رب تھا۔ میں اسی میں پناہ لیتی، جبکہ مخلوق مجھ سے غافل ہوتی اور کوڑا تھم چکا ہوتا۔ میں اپنے دل کی گہرائیوں سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو پکارتی اور اس کے حضور حاضر ہوتی:

"اے اللہ، اے وہ ذات کہ جب دلوں پر مایوسی کی چادر تن جائے تو وہ کسی ضرر کے بغیر ان کی مایوسی دھو کر اپنے جلال کا نور روشن کر دیتا ہے اور غم کو زائل کر دیتا ہے۔

اے مصیبت زدوں کی مصیبت دور کرنے والے!

اے نجات کے بند راستوں میں اپنا سفینہ بھیجنے والے!! مجھے ڈوبنے سے بچا لے، اپنا سفینہ ایسی جگہ سے بھیج جس کا کسی کو خیال بھی نہ ہو۔

اے رب، اے وہ ذات جس کے پاس امان ہے! جس کی آغوش میں اطمینان واستقرار ہے!! اور جس کے سائے میں سلامتی ہے!

اے اللہ، جب تو ہماری آزمائش کرے تو صبر سے ہمیں امداد دے۔ اور تو جس چیز کا ارادہ فرمائے اپنی مشیت کو اسی کا ہم نوا بنانا اور جب تو ہمارے لیے فیصلہ فرمائے تو ہمارے دلوں کو اس فیصلے کو قبول کرنے کی توفیق عطا فرمانا۔

اے اللہ آسانی اور تنگی دونوں حالتوں میں ہمیں حمد وشکر کی توفیق دینا اور صبر میں ہمارے نفوس کی تربیت فرمانا، اور شکر میں ہمیں اعترافِ نعمت کی توفیق دینا، اور تکبر اور انانیت سے محفوظ رکھنا اور ہر بھلائی کے صلے میں ہم میں اعلیٰ اخلاق اور دلوں کی سلامتی عطا فرمانا، بے شک

تو ہر چیز پر قادر ہے۔ (آمین)

پھر عطا کرنے والے نے ایسی نعمتیں عطا کیں جنھیں گنا جا سکتا ہے نہ شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس نے مجھے ثابت قدمی عطا فرمائی اور میری حفاظت فرمائی۔ اور ان ظالموں کے بیچ میں میرے لیے ایسے لوگ بھیجے جنھوں نے میری آزمائشوں کو کم کر دیا اور میرے غم کو دور کر دیا۔ اس ذاتِ پاک نے مجھے جیل میں ایسی ساتھی دی جو فقط میرے جیل کی تنہائیوں کی ساتھی ہی نہ تھی بلکہ میری روح کی رازداں بھی تھی۔ جی ہاں! ماجدہ۔ وہ مجھ سے زیادہ صابرہ و مطمئنہ تھی، وہ قربانی اور عطا کی مثال تھی۔ اور کتنی ہی محسنات تھیں جنھوں نے بہنوں کی مانند ہم پر رحم کیا۔ ہم ان کے فضل اور محبتوں اور مدد کو بھلا نہیں سکتے۔ اگرچہ اس قید و بند، غم اور ابتلا میں وہ بھی ہماری شریک تھیں۔ میں ان سب کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں اور اللہ تعالیٰ سے اپنے اور ان کے لیے مغفرت اور ثواب کی طلب گار ہوں۔ میں ان سے بھی عفو و درگزر کی التجا کرتی ہوں، کیونکہ اس کتاب میں میں نے ان کا تذکرہ بھی کیا ہے اور انھیں پہنچنے والے مظالم کا بھی ذکر کیا ہے، ہو سکتا ہے ایسے ذکر سے کسی کو تکلیف پہنچی ہو، یا یہ انھیں پسند نہ آیا ہو۔ لیکن میرا یہ سب لکھنے کا مقصد صرف ان طاغوتوں کی سرکشی کو بیان کرنا تھا، جو نظامِ حکومت کو چلانے والے کر رہے تھے، انھوں نے کس طرح شہریوں کے حقوق پامال کر رکھے تھے۔ ہاں اس مرحلے پر حق امانت ادا کرنا مجھ پر لازم تھا۔ اس راستے میں مجھے بھی کسی قدر دشواری اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑا ہے، مگر میں نے اسے بڑے فائدے کے لیے برداشت کیا ہے، تاکہ جو ظلم و عذاب ہم نے سہے اور جو مصائب اور ذلت آمیز سلوک ہم سے روا رکھا گیا وہ یوں ہی ضائع نہ ہو جائے، بلکہ اس تاریکی سے روشنی کی نوید ملے۔

میں شام کی حکومتی جیلوں کے جہنم میں نو برس تک بلاقصور کسی اور کی رہین کے طور پر جلتی رہی۔ میں بتا نہیں سکتی کہ عمرِ عزیز کے نو برس اس ملعون نظام میں کس طرح بیتے۔ جو کچھ پیش آیا اس کی حقیقی تصویر گری سے یہ قلم عاجز ہے۔ ظالم اسی طرح لوگوں کو برے عذاب کا مزا چکھا رہے ہیں، لیکن کل۔ کل ہم بھی عادل و کریم رب کے سامنے فیصلے کے لیے ان کے ہمراہ

پیش ہوں گے۔ اگرچہ جیل نے مجھ سے برا سلوک روا رکھا اور مجھے بے حساب دکھ دیا، میں بے قصور نو برس تک جیل کے سیلوں میں اپنی عمر ضائع کرتی رہی..... تو آج میں اللہ کی نعمتوں میں جی رہی ہوں۔ ہاں، میں محسوس کرتی ہوں کہ میرے زخمی دل کو رب کی رحمت نے چھو لیا ہے اور دل کی بے قراری کو چین مل گیا ہے اور محرومی کے وہ تاریک سال نور، عطا اور فضل میں بدل گئے ہیں۔ یہ ہیں میرے محسوسات۔ اور میرے شوہر نامدار، وہ تو ہمیشہ سے محروم دلوں میں امید کی کرن جگاتے رہتے ہیں، انھوں نے مجھے وہ سب کچھ لوٹا دیا ہے جو مجھ سے چھن گیا تھا۔ اب ہم اپنی بیٹی ''وفا'' کی جانب دیکھتے ہیں جو ہماری بہترین ساتھی ہے اور جس نے ہماری زندگی کو خوشی اور شادمانی سے بھر دیا ہے۔ اور ہمارے دو اور بچے جابر اور سارہ، جنھیں ان کی ماں ''حنان'' نے جہاد اور شرف کی دعوت قبول کرتے ہوئے ہمارے حوالے کیا تھا، وہ بھی ہمارے ساتھ ہیں، ان کی ماں دین اور دُنیا کا بہترین نمونہ ہے۔

میں پہلے بھی یہی سمجھتی تھی اور آج بھی کہ ابھی انجام نہیں آیا، حساب کتاب کی فصل آ گئے ہے۔ ظالم و جابر آج بھی اللہ کے ہاتھ میں ہیں، کل کے لیے ان کا معاملہ موقوف کر دیا گیا ہے..... اور دونوں جہانوں کا مددگار اور ساتھی کون ہے۔ ان جیسے کتنے ہی لوگ صفحۂ ہستی پر نمودار ہوئے، انھیں دُنیا میں سربلندی ملی اور وہ ظالم شمار ہوئے:

''جن لوگوں نے مومن مردوں اور عورتوں کو آزمائش میں ڈالا، پھر توبہ نہ کی، تو ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور ان کے لیے جلنے کا عذاب ہے۔'' (البروج ۸۵:۱۰)

یہ افسوس کا مقام ہے..... اور امید صرف اللہ سے ہے۔ میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور میں اسی کی جانب رجوع کرتی ہوں..... اور تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے۔

زینب الغزالی

اپریل ۱۹۹۵ء

❖❖❖

# باب اول

## صرف پانچ منٹ!

## دسمبر ۱۹۸۰ـ دسمبر ۱۹۸۹

یہ اکتیس دسمبر بروز بدھ ۱۹۸۰ء کی رات تھی، دمشق میں اس رات بڑی ٹھنڈ تھی۔ گھر میں اکثر لوگ خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے تھے، میں آدھی رات گزرنے کے بعد بھی فقہ کی کتاب پر جھکی ہوئی تھی اور ابھی تک رقص کرتی سطور سے معنی تلاش کرنے میں لگی ہوئی تھی، بلکہ زیادہ سے زیادہ معلومات ذہن میں بٹھانے کی کوشش کر رہی تھی، کیونکہ صبح میرا سالِ آخر کا امتحان تھا۔ اونگھ، سردی اور بستر کی گرماہٹ بار بار میری توجہ اپنی جانب پھیر رہی تھی اور میں ہر بار ان کا خیال جھٹک کر پھر کتاب پر جھک جاتی تھی۔ شدید خوف کی ایک لہر میرے پورے بدن میں سرایت کر گئی اور میرے اندر کوئی ڈر پرورش پانے لگا۔ میں خود بھی نہ جانتی تھی کہ یہ انجانا خدشہ کیا ہے۔ نہ معلوم میں کب ماضی میں چلی گئی اور گزشتہ کئی دنوں کے واقعات کسی فلم کی طرح میرے ذہن کے کینوس پر ابھرنے لگے۔ میں اپنی یادداشت میں اس خوف واضطراب اور پریشانی کا جائزہ لینے لگی۔

شریعہ کالج میں میرا پورا سال بڑے مزے سے گزرا تھا یا کم از کم پچھلے سال جیسا ہی تھا، جب میں امتحانات کے بعد اپنے شہر ''حمات'' چلی گئی تھی اور چھٹیاں اپنے خاندان اور اپنی دوستوں کے درمیان بسر کی تھیں۔ اسی دوران اچانک ایک روز میری والدہ میرے پاس آئیں اور مجھ تک صفوان بھائی کی خواہش پہنچائی کہ میں فوراً سلسلہ تعلیم منقطع کر دوں اور اس شہر کو بھی چھوڑ دوں اور اردن کے دارالحکومت عمان چلی آؤں، جہاں وہ کچھ مہینوں سے مقیم تھے؛ کیونکہ

حکومت ان پر اخوان المسلمون کی تنظیم سے تعلق کا الزام لگا رہی تھی اور وہ چھپتے پھر رہے تھے۔ میری والدہ رحمہا اللہ صفوان کے پاس گئی تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ بھائی میرے بارے میں خدشات کا شکار ہیں۔ انھیں ڈر ہے حکومت کہیں ان کی جگہ مجھے گرفتار نہ کر لے یا مجھے ان کے بدلے رہن کے طور پر نہ رکھ لے۔ تاہم میں خود کو ان کی جگہ جواب دہ نہ سمجھتی تھی، نہ ہی مجھے زندگی میں کبھی اس صورتِ حال کا سامنا ہوا تھا، اسی لیے میں نے یہاں سے کہیں اور جانے سے انکار کر دیا۔

میں نے معمول کے مطابق چھٹیاں گزاریں اور دوسرے سال کے آغاز میں دوبارہ دمشق آ گئی۔ ہم طالبات نے مل کر حی البرامکہ میں اسی رہایشی فلیٹ کو دوبارہ کرائے پر لے لیا جس میں ہم گزشتہ سال رہے تھے۔ میں نے یونیورسٹی جانا شروع کر دیا اور میں اس معاملے کو مکمل طور پر بھول گئی ہوتی اگر ہمارے اردگرد پولیس نفری بڑھ نہ جاتی۔ مسلح اہل کاروں کی تعداد اچانک بڑھنے لگی، اور ماضی میں جس قسم کے ناکے حمات میں لگتے اور شخصی تفتیش ہوتی تھی بعینہٖ دار الحکومت دمشق میں شروع ہو گئی، بلکہ اس کا دائرہ جامعہ دمشق تک پھیل گیا۔ اچانک ہی امن فورسز یونی ورسٹی کے شریعہ ڈیپارٹمنٹ کے دروازے پر شناختی کارڈ چیک کرنے لگیں اور ایک ایک طالب کا نام پکار کر تفتیش کی جانے لگی۔ باہم سرگوشیاں ہوتیں اور کسی کی گرفتاری کی خبر آ جاتی اور کسی کے قتل کی، کسی سے تصادم کی اور کسی پر تشدد کی، بلکہ اب تو بہت کچھ علانیہ ہونے لگا۔ دن دہاڑے گولیاں چلنے کی آوازیں آتیں اور آئے روز دمشق میں بم دھماکے ہوتے۔ ریڈیو اور سرکاری اخبارات عموماً اس قسم کے واقعات پر رائے زنی سے احتراز کرتے کہ ان فورسز نے کہاں کہاں سے کون "مجرم" پکڑے اور کہاں پر ان کے ٹھکانوں کو نشانہ بنایا گیا۔ اس ساری گڑبڑ میں ہر شخص پریشان ہو کر رہ گیا اور ایک نامعلوم خوف ہر دل میں سرایت کر گیا۔ مجھے بھی اپنے اردگرد غیر فطری حرکات و سکنات محسوس ہونے لگیں۔

## اللہ تمھارے ساتھ ہو

مثال کے طور پر میں دو روز پہلے اپنی سہیلی اور کلاس فیلو ماجدہ ل کے ساتھ سوق الحمیدیہ گئی،

مجھے اپنی بیمار چچی کے لیے ایک تحفہ خریدنا تھا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ کوئی شخص ایک دکان سے دوسری اور ایک سڑک سے دوسری سڑک پر مسلسل ہمارا پیچھا کر رہا ہے، بلکہ جب ہم چچی کے ہاں جانے کے لیے انجیم کی بس میں سوار ہوئے تو میں نے اس شخص کو اپنے پیچھے بس میں سوار ہوتے دیکھا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے ماجدہ کو بتانے کی کوشش کی مگر خوف سے میری آواز بند ہو گئی۔ میں نے بمشکل سرگوشی کی۔ ماجدہ مسکرا کر بولی: یہ محض تمھارا وہم ہے اور اگلی صبح جب میں معمول کے مطابق اپنے ڈیپارٹ منٹ کے داخلی دروازے پر پہنچی، گارڈز نے مجھے روکا، معمول کے مطابق میرا شناختی کارڈ لیا اور اسے اچھی طرح جانچ پڑتال کے بعد واپس کیا۔ لیکن لیکچرز مکمل کر کے واپسی پر جب میں ماجدہ کے ساتھ گھر جا رہی تھی، مجھے محسوس ہوا کوئی مسلسل ہمارا پیچھا کر رہا ہے۔ میں نے ماجدہ کو بتایا تو اس نے یہ کہہ کر مجھے ٹال دیا کہ میں وہمی ہوں اور سب کچھ نارمل ہے اور مجھے فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، لیکن میرا اضطراب بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ بلکہ اس ٹھنڈی پر سکون رات میں اور بڑھ گیا تھا، اور مجھے سوئیاں چبھو رہا تھا۔ ابھی تک یہ معاملہ میری سمجھ میں نہ آیا تھا۔ ہمارے فلیٹ سے نیچے سڑک پر اچانک گاڑیوں کے دروازے کھلنے کی آوازیں آئیں اور خفیہ والوں کی گاڑی کا مخصوص ہارن بھی سنائی دیا۔ میرے خیالات کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور میں نئی صورتِ حال پر غور کرنے لگی۔ اب نئے سرے سے دروازے دھڑ دھڑائے جائیں گے، اور آج ہمارے محلے سے مطلوب افراد کی پکڑ دھکڑ ہو گی۔ میں تجسس کے مارے کھڑکی کی جانب بڑھی، تاکہ حقیقت کا مشاہدہ کروں۔ ابھی میں کھڑکی تک پہنچنے بھی نہ پائی تھی کہ ہمارے فلیٹ کے دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ میں نے کھڑکی کے کنارے سے دیکھا تو باہر خفیہ والوں کی لاتعداد گاڑیاں کھڑی تھیں۔ سڑک پر تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ ہمارے دروازے پر کوئی کڑک دار آواز میں گرجا:

''اگر تم نے دروازہ نہ کھولا تو ہم تالے کو گولی سے اڑا دیں گے''

میں نے مشینی انداز میں اپنی نماز کی چادر کھینچی اور سر پر اوڑھ لی اور فوراً دروازے کی

جانب بھاگی، لیکن مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کیا کروں۔ میں دروازہ کھول دوں، جبکہ سب طالبات گہری نیند سو رہی ہیں؟ مجھے شدید حیرت اور اضطراب گھیر چکے تھے۔ میں بھاگ کر معلّمہ فاطمہ کے پاس چلی گئی، وہ عمر میں ہم سے بڑی تھیں اور فلیٹ کے معاملات کی نگران بھی۔ میں نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں انھیں جگانے کی کوشش کی:

آیئے۔ خفیہ والے آپ کے پاس آئے ہیں۔

مجھے فوراً ہی فلیٹ میں اپنی دوسری ساتھی کا خیال آیا جن کا نام سوسن تھا۔ وہ BDS کا امتحان پاس کر چکی تھیں اور آج کل دمشق میں ہاؤس جاب کر رہی تھیں۔ ان کا بھائی قید میں تھا اور اسے آج ہی عدالت نے سزائے موت سنائی تھی، جس کی انھیں کہیں سے خبر ملی تو ہمیں بھی بتا دیا۔ مجھے دوسرا خیال یہ آیا کہ یہ لوگ ان کے لیے آئے ہیں۔ اسی دوران خفیہ والوں نے دروازے پر ضربیں لگانی شروع کر دیں اور اس پر گن پاؤڈر چھڑکنا شروع کر دیا، فاطمہ نے جلدی سے حجاب پہنا اور دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر داخل ہو گئے۔ یا ربی۔ کتنی نامعقول حرکت ہے۔ ایک چھلانگ لگا کر گیلری میں جا پہنچا اور چیزیں الٹ پلٹ کرنے لگا۔ دوسرا کھڑکی کی جانب بھاگا۔ تیسرا باورچی خانے میں اور چوتھا......اور دسواں۔ ایک دوڑ کر ہمارے کمرے میں داخل ہو گیا، اس نے دیواروں پر لگی ہر چیز کو اتارنا شروع کر دیا، وہ ہر چیز زمین پر پھینک کر انھیں قدموں تلے روندتا چلا جا رہا تھا، بالکل پاگلوں کی طرح۔ کچھ دوسرے لوگوں نے ہماری ایک ایک چیز کو کھنگالنا شروع کر دیا۔ گویا ہمیں اس سے کچھ سروکار نہ تھا کہ وہ کون ہیں اور کیوں اور کسے تلاش کر رہے ہیں۔ اسی حیرت کے سمندر میں میں نے ہال میں کسی کو اپنا نام پکارتے سنا:

''وہیبہ دباغ۔''

میں دہشت زدہ آگے بڑھی جیسے وہ میرے بجائے میرا سایہ ہو، اور گھٹی ہوئی آواز میں بولی:

ہمارے ہاں اس نام کا کوئی نہیں۔

لیکن میرا دل اسی وقت گھٹ کر رہ گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ وہ میرے لیے ہی آئے ہیں۔
انھیں ان کا انچارج کہنے لگا:

ان سب کو ان کے کمروں میں لے جا کر ان کے شناختی کارڈ چیک کرو۔

ہم اس کے پکارنے پر پیچھے چلنے لگے۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے تو ہمارے پسینے چھوٹ رہے تھے اور کانپ رہے تھے۔ ایک سپاہی میری جانب بڑھا گویا وہ خدمت پر مامور ہو۔ اس نے کارڈ پر میرا نام پڑھا، اور میری جانب دیکھا تو اس کی آنکھیں بھر آئیں، وہ رقت سے بولا:

تم تو میرے شہر کی بیٹی ہو۔ اللہ تمھاری مدد کرے۔

میں نے اس سے استفسار کیا: کیوں؟ کیا کوئی بات ہے۔

وہ بولا: اللہ تمھیں صبر دے۔ تم کیا کر سکتی ہو؟ اللہ تمھارے ساتھ ہو۔

میں نے اس سے سوال کیے مگر مجھے ایسے لگ رہا تھا، جیسے میں کسی کنویں کی گہرائی میں اترتی چلی جا رہی ہوں: کیوں؟ کیا وہ میرے لیے آئے ہیں؟

وہ میری جانب دیکھے بنا بولا: ہاں۔

وہ چلا گیا اور اس نے کارڈ ہیڈ کو دے دیا، جس نے اس سے نام پکارا "وبیہ دباغ" اور پھر مجھے دیکھ کر غصے سے کہنے لگا:

تم تو پورے یقین سے کہہ رہی تھی کہ اس نام کی کوئی لڑکی تمھارے ہاں نہیں۔

پھر وہ دوسرے سپاہی سے کہنے لگا:

اسے اکیلے میں کمرے میں لے جاؤ اور اس سے اچھی طرح چھان بین کرو۔

## قہوہ۔ یا چائے

سپاہی مجھے دوسرے کمرے میں لے گیا اور ایک اور لڑکی سے کہنے لگا:

اس کی تلاشی لو۔

میں نے اس سے کہا: میرے پاس کیا ہو سکتا ہے؟ آپ پورے گھر کی تلاشی لے چکے ہیں، اور انھوں نے آتے ہی ہم سب کی بھی تلاشی لی تھی۔

لیکن میری کپکپاتی آواز آپریشنل ہیڈ کی کھردری تیز آواز میں دب کر رہ گئی، وہ کسی شخص سے وائرلیس پر کہہ رہا تھا:

اسے لے آؤ۔

اس نے مجھ سے کہا: چلو اپنے کپڑے پہن لو۔ تمھیں ہمارے ساتھ جانا ہوگا ..... صرف پانچ منٹ کے لیے۔

میں نے نماز کے لباس کے اوپر اپنا جلباب پہن لیا، میرے پاس کچھ رقم تھی، میں نے اپنی ساتھی کے حوالے کرنا چاہی تو وہ مجھ سے کہنے لگا:

نہیں۔ انھیں اپنے پاس ہی رہنے دو، ہو سکتا ہے کبھی ان کی ضرورت پڑے۔

میں نے اپنا توازن درست کرتے ہوئے کہا: مجھے ان کی ضرورت نہیں، آپ ہی تو کہہ رہے ہیں کہ مجھے صرف پانچ منٹ کے لیے جانا ہوگا۔ پھر مجھے ان کی کیسے ضرورت پڑے گی؟

لیکن اس نے اپنی رائے پر اصرار کیا اور تاکیداً کہا کہ مجھے ان کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے، میں نے اس کی پروانہ کی، اور رقم قریب کھڑی ساتھی کے حوالے کر دی۔ انھوں نے مجھے فوراً باہر دھکیلا، آپریشنل ہیڈ کسی سپاہی سے کہہ رہا تھا: اس کو بازو سے پکڑ کر لے جاؤ۔

سیڑھیوں پر اندھیرا تھا اور بجلی کٹی ہوئی تھی۔ میں نے انکار کر دیا کہ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر لے جائے، وہ بولا: مجھے یہی حکم ہے۔

میں نے اس سے کہا: مجھے ہتھکڑی لگا دو لیکن ہاتھ نہ پکڑو۔

اس نے ہاتھ چھوڑ دیا، لیکن جب میں دروازے سے باہر نکلی وہ پھر قریب آ گیا تا کہ مجھے

گاڑی تک لے جائے، ایسا لگا جیسے بھیڑیوں کا غول منہ کھولے اپنے شکار کا منتظر ہو۔ میں نے وائرلیس پر کسی کو پوچھتے سنا:

اس کے ساتھ کمرے میں اور کون تھی؟

اس نے کہا: فلاں اور فلاں۔

وہ بولا: ان کو بھی ساتھ لے آؤ۔

وہ دوبارہ اوپر گیا اور میری روم میٹس ماجدہ اور ملک کو لے آیا۔ گاڑی نے اس وقت تک حرکت نہ کی جب تک تمام خفیہ والوں نے سڑک پر کافی دور تک اپنی پوزیشنیں نہ سنبھال لیں۔ پھر ساری گاڑیاں بڑے رعب داب کے ساتھ مختلف سمتوں میں روانہ ہو گئیں۔ پلک جھپکتے میں ہم عباسیہ تشرین گراؤنڈ پہنچ گئے جہاں خفیہ والوں کا ذیلی دفتر تھا، جس کا نام ''الساوات'' تھا۔ وہ ہمیں ایک کمرے میں لے آئے جہاں مسلسل تیز سبز اور سرخ روشیاں جل بجھ رہی تھیں، جیسے وہ ٹیلیفون یا وائرلیس کے آلات ہوں۔ ابھی ہم بیٹھے بھی نہ تھے کہ وہاں موجود افسر پوچھنے لگا:

آپ کیا پسند فرمائیں گی۔ قہوہ یا چائے؟

مارے خوف کے ہمارے منہ سے کوئی بات نہ نکلی، وہ بولا:

میں آپ کے لیے کڑک قہوہ لاتا ہوں تاکہ آپ کا سر درست ہو جائے۔

وہ گیا اور ہم سب کے لیے ایک ایک پیالی قہوہ لے آیا، اور ہمیں غور سے دیکھنے لگا، جب اس نے دیکھا کہ ہم میں سے کسی نے پیالی منہ کو نہیں لگائی، تو مجھ سے پوچھا:

تم پی کیوں نہیں رہیں؟ چلو پیو تاکہ تمھارا سر درست ہو جائے۔ اس وقت رات کے دو بج رہے ہیں اور یقیناً تم نیند محسوس کر رہی ہو گی۔

میں کانپتے ہونٹوں سے بولی: میں پی لوں گی۔

وہ بولا: نہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں۔

میں نے اس سے کہا: کیا آپ ہماری نگرانی کررہے ہیں؟ مجھے ابھی اس کی خواہش نہیں۔

وہ تمسخرانہ انداز میں کہنے لگا: تمھیں پینا پڑے گا، تاکہ تمھاری عقل ٹھکانے آجائے اور تم اچھی طرح بیان کرسکو۔

میں خاموش ہوگئی۔ میں نے پیالی اٹھا کر ہونٹوں سے لگالی جیسے میں پی رہی ہوں۔ میں نے دوبارہ پیالی ہونٹوں سے لگائی تو وہ قریب آکر کھڑا ہوگیا۔ میرا تمام جسم کانپنے لگا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ اگلے لمحوں میں کیا ہونے والا تھا۔

## کمرۂ تحقیق میں

پہلے کمرے میں میرا قیام زیادہ دیر نہ رہا۔ تھوڑی ہی دیر میں کسی نے میرا نام پکارا اور سپاہی مجھے اس برانچ کے ہیڈ کے پاس لے گیا۔ اس کا نام معین ناصیف تھا۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ وہ صدرِ مملکت کا بھانجا تھا۔ اندر بیٹھے ہوئے شخص کی آنکھوں میں خون تیر رہا تھا اور اس کے پپوٹے پھولے ہوئے تھے۔ اس نے نہایت پتلے کپڑے کا رقیق جلباب پہن رکھا تھا۔ اس نے دولوگوں کو ایک دوسرے پر اس طرح ڈال رکھا تھا کہ انتہائی کریہہ منظر نظر آرہا تھا۔ اس نے حکم دیا:

یہاں بیٹھ جاؤ۔

اس نے سخت کھردرے اور اجڈ لہجے میں کہا، اور میں ابھی کمرے کے وسط میں پڑی کرسی تک پہنچ بھی نہ پائی تھی کہ اس نے سوال داغ دیا:

تم آرگنائزر ہو، کیا ایسا ہی نہیں؟

میں نے کہا: نہیں۔

وہ بولا: تو پھر تمھارا اخوان سے کیا تعلق ہے؟

میں نے کہا: میرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

وہ اپنی کرسی پر جھولتے ہوئے کہنے لگا: پھر تمھیں مجلات 'النذیر' کو تقسیم کرنے کی ذمہ داری کیوں سونپی گئی ہے اور پھر یہ رسالہ ہم نے کہاں سے برآمد کیا ہے؟

اس نے اپنی انگلیوں میں کاغذ کا ایک ورق لہرایا۔ میں نے پہچان لیا، یہ میرے بھائی صفوان کا خط تھا جو انہیں شام سے جانے سے قبل والد صاحب نے وصیت کے طور پر لکھا تھا، جب وہ بڑے بھائی کے ہمراہ علاج کے لیے عمان جا رہے تھے، کیونکہ صفوان کے بارے میں مسلسل خوف اور پریشانی نے ان کی صحت پر برا اثر ڈالا تھا، لیکن بارڈر پر کاغذات میں سقم کی بنا پر انھیں واپس لوٹا دیا گیا۔ میں نے اس خط کو اپنے بھائی کی یادگار کے طور پر محفوظ کر رکھا تھا۔ انھوں نے گھر کی تلاشی لی تو یہ ان کے ہاتھ لگ گیا، اور اس پر لکھا ہوا تھا کہ "حامل مکتوب فلاں مجاہد کے والد ہیں"۔ انھیں یہ بہت بڑی بات لگی اور برانچ کا نگران بڑے تمسخرانہ انداز میں اسے پڑھنے لگا اور بولا:

......ہوں۔ فلاں مجاہد کا والد، کیا یہی نہیں لکھا ہوا؟ تمھارا باپ خود اشتراکی ہے اور یہ دوسرا شخص اخوان کے زعماء سے ہے اور میں اس کے فرار کے بارے میں بھی جانتا ہوں۔ اللہ کی قسم میں اس کے (والد) جسم کو چھلنی کی طرح چھید دوں گا۔

اس کے یہ جملے میرے ذہن سے چپک کر رہ گئے، حتیٰ کے کئی برس بعد جب میں نے حمات کے واقعات سنے۔ مجھے پتا چلا کہ انھوں نے میرے والد پر بہیمانہ تشدد کیا، حتی کہ ان کا جسم بالکل چھلنی کی طرح ہو گیا۔

## الزام تراشی

میں نہ تو اخوان کی آرگنائزر ہوں نہ میرا ان سے کوئی تعلق ہے۔

میں نے کہہ تو دیا لیکن ابا جان اور اپنے بارے میں سوچ کر میرا بدن لرزنے لگا۔

وہ بولا: اور اس خط کے بارے میں کیا کہو گی؟

میں نے کہا: میں نہیں جانتی۔ ہو سکتا ہے کوئی اسے میرے کمرے میں رکھ کر بھول گیا ہو یا کسی نے اسے میرے لیے رکھا ہو۔

اس نے اپنا مقصد دوسرے انداز میں پورا کرنا چاہا، وہ خط کو الٹتے پلٹتے ہوئے پوچھنے لگا:

اپنے بھائی کے دوستوں میں سے کس کس کو جانتی ہو؟

کسی کو نہیں۔ میں بہت عرصے سے اپنے بھائی سے نہیں ملی، اور اس کے دوستوں سے میرا کیا واسطہ؟

وہ شعلے اگلتی آنکھوں سے گھورتے ہوئے بولا: عبدالکریم رجب کے بارے میں کیا کہو گی؟

میں نے کہا: یہ کون ہے۔ میں اسے نہیں جانتی۔

تو پھر تم یہ بھی تسلیم نہیں کرتی کہ تم آرگنائزر ہو۔

میں نے کہا: نہیں۔ جب میں آرگنائزر نہیں ہوں تو اس کا اعتراف کیسے کرلوں؟

اس نے پاؤں میں پڑا اپنا کوڑا اٹھایا اور میری جانب گھمایا، میں نے سر نیچے کرلیا، تو وہ پیچھے کھڑے کاتب (رجسٹرار) کو جا لگا۔ وہ مجھے گالیاں دیتے ہوئے بولا:

تم کہتی ہو کہ تم اخوانی نہیں ہو، لیکن اخوان کے بالکل یہی انداز و اطوار ہوتے ہیں۔

اس نے خط میرے سامنے لہرایا اور دوبارہ اس خط کے بارے میں پوچھنے لگا۔ وہ جب اچانک کمرے سے باہر نکلا تو میں سمجھی کہ وہ جلاد یا کسی کو مجھ پر تشدد کرنے کے لیے بلانے گیا ہے۔ واپس لوٹا تو دوبارہ خط مجھے دکھانے کو جھکا، تاکہ پھر تفتیش کرے۔ وہ کاغذات کی ٹوکری میں سے ہمارے گھر سے برآمد کیے گئے اوراق نکال کر ٹٹولنے لگا۔ وہ ہر چیز کا تنقیدی انداز میں جائزہ لے رہا تھا تاکہ میرے خلاف ثبوت کے طور پر پیش کر سکے۔ اسی تگ و دو میں وہ یہ خط نجانے کہاں رکھ بیٹھا تھا۔ وہ میرے پیچھے کھڑے کلرک سے پوچھنے لگا:

کیا اس کمرے میں کوئی آیا تھا؟

کلرک صاف گوئی سے بولا: نہیں سر۔

اس نے کرید کر پوچھا: کیا محترمہ...... نے اپنی جگہ سے حرکت کی ہے؟ کیا تم کمرے سے باہر گئے تھے؟

اس نے دوبارہ جواب دیا: نہیں۔

وہ اوراق الٹنے لگا، اس نے سب کو چھان پھٹک کر دیکھا لیکن کچھ نہ ملا۔ نجانے خط اس نے کہاں کھو دیا تھا۔ اس کا غصہ دو آتشہ ہو گیا اور اس نے چیخم دھاڑ شروع کر دی، اور بڑے کمینے انداز میں مجھے دھمکانے لگا:

تمھاری ساتھی نے دوران تحقیق میرے سامنے اعتراف کر لیا ہے کہ تم آرگنائزر ہو، اگر تم نے سیدھے طریقے سے اعتراف نہ کیا تو ہمیں منوانا آتا ہے۔ اس کی دھمکیوں اور فضول باتوں نے مجھے رنجیدہ کر دیا مگر میں نے کہا:

آپ جو بھی وسائل آزمالیں میں آرگنائزر نہیں ہوں۔

## رجسٹرڈ ملزمہ

انھوں نے مجھے کمرۂ تحقیق سے نکال کر ایک اور کمرے میں داخل کیا جو استقبالی کمرے کی مانند آلات اور مشینوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کمرے کی روشنیاں مسلسل جل بجھ رہی تھیں۔ میری ساتھی ماجدہ کو وہ برانچ کے سربراہ کے پاس لے گئے۔ ابھی میں سانس بھی نہ لینے پائی تھی کہ وہ دوبارہ آ گئے۔ انھوں نے میرا نام پکارا اور مجھے دوبارہ باہر لے گئے، جہاں تین افراد پر مشتمل کمیٹی الزامات سنانے کے لیے میرا انتظار کر رہی تھی۔

تم پر الزام ہے کہ تم (اخوان المسلمون کی) آرگنائزر ہو: تم مجلّہ "النذیر" بانٹا کرتی تھی

اور دمشق کی مساجد میں سید قطب کے افکار پر مشتمل دروس دیتی تھی۔ تم نے تنظیم کے لیے ایک مکان بھی خریدا اور تم نے ایک گاڑی کے ذریعے معلومات کے نیٹ ورک کو مہاجرین کے علاقے میں بھجوایا۔ تمھاری ایک ساتھی ان سب الزامات کا اقرار کرچکی ہے۔ تمھاری ساتھی نے ان باتوں کو کامل یقین سے بیان کیا ہے اور وہ تمھیں بھی اچھی طرح جانتی ہے۔ وہ تمھاری کلاس فیلو بھی ہے اور تمھارے ساتھ رہائش پزیر رہی ہے، اس نے تمھارے بارے میں کبھی جھوٹ نہیں بولا۔

وہ جھوٹ کہتی ہے، میرا ان الزامات سے کوئی تعلق نہیں جو اس نے بیان کیے ہیں، نہ ہی میں نے یہ سب کیا ہے، نہ ان کاموں میں شریک رہی ہوں۔

یہ کہتے ہوئے میں کچھ کچھ حقیقت کی تہہ تک پہنچ رہی تھی۔ ان کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہی الزامات دوسروں پر بھی عائد کیے گئے ہیں اور یہی جھوٹ کا پلندہ ان کے لیے بھی تیار کیا گیا ہے۔ یہ وہی عبدالکریم رجب تھا: خفیہ والوں کا جاسوس، وہ اخوان کی صفوں میں ان کے لیے کام کرتا یا ان کے بیچ سازشیں کرتا تھا۔ اس شخص سے ہم ہمیشہ چوکنا رہتے تھے اس کے باوجود کہ میں نے اسے دیکھا تک نہ تھا۔

اس سے میری کچھ ہمت بندھی اور مجھے یقین ہوگیا کہ انھوں نے محض خانہ پری کے لیے یہ سب الزام تراشی کی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ میرا یہ احساس پختہ ہوگیا۔ اور جب میں نے برانچ کے انچارج کی دھمکیوں کا کوئی جواب نہ دیا تو وہ نئے سرے سے الزامات دہراتے ہوئے بولا:

اگر تم اعتراف نہیں کرتی۔ تو ہمارے پاس ایسے طریقے ہیں کہ تم خود اعتراف کروگی۔

## موت کے انتظار میں

تفتیشی نگران کے اشارے پر خفیہ کا ایک اہل کار مجھے ایک تاریک کمرے میں لے گیا۔ فوراً ہی وہ میری ساتھی ملک کو لے آیا۔ وہ غریب نئی نئی دمشق آئی تھی اور میرے ہی ادارے میں سال اوّل کی طالبہ تھی۔ وہ نہ تو اس علاقے سے زیادہ واقف تھی نہ ہی میرے سوا کسی کو جانتی

تھی۔ ہمیں ایک اہل کار کی زیرِ نگرانی کمرے میں چھوڑ کر وہ ماجدہ سے تفتیش کرنے لگے۔ اسے فارغ کیا تو اس کے بعد دوبارہ میری باری آئی۔ رات کا بیشتر حصہ گزر چکا تھا، وہ ان ہی گھسے پٹے الزامات کو دہرانے لگا:

تمھارے پہلے ساتھی (اس کا اشارہ عبدالکریم رجب کی جانب تھا) نے سب سے پہلے تمھارے خلاف بیان دیا اور ماجدہ نے بھی اس سب کی تصدیق کی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ تم منتظمہ ہو، تمھارے پاس اسلحہ ہے، تم تنظیم کے لیے کئی قسم کے کام کرتی ہو، اور مجلہ ''الدعوۃ'' سرکولیٹ کرتی ہو۔

اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے اہل کار سے کہا کہ وہ مجھے باہر لے جائے۔ وہ میرے پیچھے چلتا رہا، پھر اس نے میرا رخ دیوار کی طرف کر دیا اور کہنے لگا کہ میں اپنا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں اوپر اٹھا لوں۔ میں نے اپنے دل میں کہا:

قصہ ختم۔ انھوں نے مجھ سے تفتیش مکمل کر لی ہے۔ اب گولی لگے گی یا پھانسی۔

تھوڑی دیر میں ایک اہل کار میری ساتھی ملک کو ہانکتا ہوا اسی کمرے میں لے آیا اور اسے بھی میری طرح کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ میرا احساس پختہ ہو گیا کہ وہ اب ہمیں گولی مار دیں گے۔ مجھے وقت گزرنے کا کچھ پتا نہ چلا۔ میری پوری توجہ اس انجام کی جانب تھی جو قریب تر آ رہا تھا۔ اب کیا ہوگا: عقب سے سنسناتی ہوئی گولی یا پھانسی کا پھندا یا کچھ اور؟ مجھے ایسا لگا جیسے تکمیلِ آرزو کا وقت آ گیا ہو۔ میں نے بڑے تحمل سے اپنی ساری توانائیاں جمع کر کے نہایت نرمی سے اپنی نگرانی پر مامور اہل کار سے پوچھا:

تم نے ہمیں اس طرح کیوں کھڑا کر رکھا ہے۔ ہم نے کیا کیا ہے؟

وہ لاپروائی سے بولا: آپ کو اچھی طرح پتہ ہے کہ آپ نے کیا کیا ہے۔

میں نے پوچھا: تم یہ کہہ رہے ہو کہ وہ ہمیں مار ڈالیں گے۔

وہ سختی سے بولا: نہیں۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ موت اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے آ جائے گی۔

## ہاتھ پاؤں باندھ کر تشدد

آدھے گھنٹے سے زائد وقت گزر گیا۔ ایسی جگہ پر گھڑی کی سوئیوں کی کیا وقعت؟ انھوں نے مجھے دوبارہ کمرۂ آلات میں داخل کیا اور بیٹھ جانے کا حکم دیا، میں بیٹھ گئی۔ وہ فوراً ہی ملک کو بھی لے آئے اور اسے میرے سامنے دروازے کی جانب رخ کر کے صوفے پر بٹھا دیا جو کسی قدر کھلا ہوا تھا، وہ مسکین صوفے پر بیٹھتے ہی سو گئی اور اسے اردگرد کا کوئی ہوش نہ رہا۔ اضطراب مجھے کاٹ رہا تھا۔ کمرہ تحقیق سے کبھی ماجدہ کی آواز سنائی دیتی، مگر میں باوجود کوشش کے اسے نہ سن پاتی۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آرہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی تھی یا اس پر کس نوع کا تشدد ہو رہا تھا۔ میں ملک کی جانب متوجہ ہوئی اور سرگوشی کی، مگر اسے سنانے کے لیے تو پوری توانائی درکار تھی:

ملک......ملک۔ دروازے سے باہر دیکھنے کی کوشش کرو اور مجھے بتاؤ کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔

لیکن وہ گھوڑے بیچ کر سو رہی تھی۔ اس نے مجھے کوئی جواب نہ دیا اور صبح تک اسی طرح بے سدھ سوتی رہی۔ میرے اعصاب اس قدر کھنچ چکے تھے کہ میرے لیے کرسی پر بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا۔ نیند تھکاوٹ اور خوف اکٹھے ہو چکے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ایک اہل کار آتا اور دوسرا چلا جاتا۔ کوئی بے مقصد سوال کرتا اور کوئی معنی خیز نظروں سے دیکھ کر مسکرا دیتا۔ حتیٰ کہ ایک صبح ہوتے ہی پوچھنے لگا:

آپ کچھ کھانا چاہتی ہیں؟ آپ کو بھوک تو نہیں لگ رہی؟

میں نے کہا: نہیں۔

پھر بولا: آپ کیا پئیں گی؟

میں نے جواباً کہا: کچھ نہیں۔ شکریہ۔

بولا: میں آپ کے لیے چائے کا کپ لاتا ہوں، آپ کا سر درست ہو جائے گا۔

وہ چلا گیا اور چائے کا کپ لا کر میرے سامنے رکھ دیا، لیکن مجھے اس قدر پریشانی اور

تھکاوٹ تھی کہ اسے ہونٹوں تک لانا دشوار لگ رہا تھا۔ آٹھ بجے وہ دوبارہ اندر آ گئے اور ملک کو جگا دیا۔ اس مرتبہ تحقیق کے لیے ہمیں ایک سرنگ نما جگہ میں لایا گیا۔ ہم سیڑھیاں اتر رہے تھے میں نے ملک کو سرگوشی میں کہا:

بہن۔ اب یہ لازماً ہمیں ہاتھ پاؤں باندھ کر تشدد کرنے لے جا رہے ہیں۔

اس کی رنگت پیلی پڑ گئی گھبرا کر بولی: یہ تو نہ کہو۔

میں نے کہا: اور تم سے کس نے کہا تھا کہ پوری رات سوتی رہو؟ تم نے کیوں نہیں سنا کہ وہ ماجدہ سے کیا کہہ رہے تھے؟ ہم اس سے کچھ استفادہ کرتے یا ہمیں یہ اندازہ تو ہو جاتا کہ کیا ہونے والا ہے۔

## تم وطن دشمن ہو

اس تاریک راستے کو پاٹتے ہوئے وہ مجھے ایک دوسرے کمرۂ تعذیب میں لے گئے، جہاں میں نے ایک نیا چہرہ دیکھا۔ وہاں ایک ترکی النسل نگران تھا۔ اس نے مجھے کمرے کے ایک جانب پڑی فوجی چارپائی پر بٹھا دیا اور تقریباً نصف گھنٹے تک ان ہی الزامات کو سوالاً جواباً دہراتا اور ڈائری میں نوٹ کرتا رہا۔ میں اس قدر خوف زدہ اور تھکاوٹ کا شکار تھی کہ اس کی باتوں کا جواب دینا مشکل ہو رہا تھا۔ نیند سے میری آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ مجھے اونگھ آ جاتی اور پھر میں چونک کر اپنے آپ کو درست کرتی۔ اس کی سخت کھردری ثقیل عربی لہجے کی گرج دار آواز میرے کانوں میں پڑتی تو ایسا لگتا جیسے میری آنتیں حلق میں آ جائیں گی۔ جب اس نے بات مکمل کی تو میری ایک ہی خواہش تھی کہ مجھے کھردرا فرش بھی مل جائے تو میں اس پر اپنا تھکاوٹ سے چور بدن ڈال کر کچھ دیر کے لیے سو جاؤں ... لیکن فوراً ہی اہلکار آ گیا اور اسی سرنگ نما راستے پر چلتا ہوا مجھے ایک دوسرے کمرے میں لے آیا۔ وہاں ایک اور افسر منتظر تھا جس نے گالیوں کی بوچھاڑ سے میرا استقبال کیا۔ اس کا ٹھیٹھ علوی لہجہ واضح تھا۔ وہ تقریباً ایک گھنٹے تک

ایک ہی جملہ بازگشت کی طرح دہراتا رہا:

"تم اخوان سے ہو اور سب تمھارے بارے میں اعتراف کرتے ہیں کہ تم منتظمہ ہو اور تم وطن کو نقصان پہنچانے کے کاموں میں شریک رہی ہو، اس لیے تمھیں کم از کم سزائے موت ملنی چاہیے۔"

اس کی باتیں ایک کیسٹ کی طرح مسلسل دہرائی جارہی تھیں۔ وہ الفاظ کی تبدیلی کے بغیر بات ختم کرتے ہی پھر نقطۂ آغاز سے شروع ہو جاتا، بس گالیوں یا استہزائیہ الزامات کے لب و لہجے میں تبدیلی ہوتی۔ میری حالت یہ تھی کو گویا سر میں زوردار گھنٹیاں بج رہی ہوں اور اس کے بات مکمل کرنے کے بعد بھی اس کی کریہہ آواز کی گونج سر کو چکراتی رہتی۔ اس کی باتیں شور بن کر میرے سر میں ہتھوڑے برسانے لگیں:

سب نے تمھارے بارے میں اعتراف کیا ہے۔ سب نے تمھارے بارے میں اعتراف کیا ہے کہ تم منتظمہ ہو۔ وطن دشمن ہو۔ سزائے موت...... سزائے موت...... سزائے موت......

شاید اس کے بعد میں بے ہوش ہوگئی، بس مجھے اتنا یاد ہے کہ ایک اہل کار ملک اور ماجدہ کو لیے ہوئے داخل ہوا اور پوچھنے لگا:

لڑکیو تمھیں بھوک نہیں لگی؟

ہم نے کہا: نہیں، ہمیں بھوک نہیں۔

وہ بڑے معنی خیز انداز میں بولا: لیکن ہم تمھیں مرغ مسلم تو ہر حال میں کھلائیں گے۔

میں سمجھ گئی کہ اس کا اشارہ تعذیب کی طرف ہے۔ میں نے کہا: ہمیں تمھارے کسی قسم کے کھانوں کی پروا نہیں۔

وہ ہم تینوں کو لے کر اسی زینے سے چڑھتا ہوا اس کے مرکزی دروازے کی جانب لے آیا، میرا اضطراب بڑھ گیا میں نے پوچھا:

کہاں لے جارہے ہیں؟

وہ بولا: خود ہی دیکھ لوگی۔

ہمیں ایک فوجی گاڑی میں آمنے سامنے بٹھادیا گیا اور دو مسلح اہل کار ہمارے پیچھے آ بیٹھے۔ گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی چلنے لگی۔ ایسا لگتا تھا وہ سامنے سے آنے والی کسی بھی رکاوٹ پر چڑھ دوڑے گی؛ حالانکہ ہمارے آگے ایک گاڑی سیکیورٹی ہارن بجاتی راستہ صاف کروا رہی تھی، تیسری گاڑی پیچھے سے ہماری نگرانی کررہی تھی۔ گاڑی کے اونچے نیچے جھٹکوں سے ملک کا سر چکرانے لگا اور اسے قے آنا شروع ہوگئی اور اس کی بدبو سے ہمارا دم گھٹنے لگا۔ ملک سارا راستہ قے کرتی رہی اور یوں ہم عباسین کی عسکری تحقیقی شاخ سے ''سجن امن الدولہ'' کفر السوسہ منتقل ہوگئے۔

❖❖❖

باب دوم


کفر السوسہ: ماورائے زمانہ سفر!

# جنوری ۱۹۸۱ء۔ اکتوبر ۱۹۸۲

تینوں گاڑیاں بڑی عمارت کے گیٹ پر پہنچیں اور اس کے خودکار دروازے پر ہمیں اتار دیا گیا۔ یہاں پر ہمیں کچھ اور ہاتھوں نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ یہ خوف کی ایک اور دُنیا تھی جس کا ان دو دنوں میں ہم نے غیر اختیاری طور پر مشاہدہ کیا تھا۔ ظالم ہاتھ ہمیں تاریک زینے پر دائیں بائیں گھماتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ ہر طرف خاموشی تھی اور اس عمارت سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ ایک زوردار آواز نے ہمارے دل دہلا دیے:

منیرہ!

ہم نے آواز کی سمت دیکھا، سامنے سے چوٹیاں باندھے مخصوص جلباب پہنے ایک خاتون نظر آئی۔ وہ ہمارے قریب پہنچی تو قیدیوں کے شفٹ انچارج ابو عادل نے اس سے کہا:

آؤ اور ان سب کی الگ الگ تفتیش کرو۔

مجھے سب سے پہلے اس کے ساتھ کمرے میں بھیجا گیا، مجھے بعد میں پتا چلا کہ وہ کمرۂ تفتیش و تعذیب ہے۔ منیرہ میرے پیچھے چلی آئی اور پوچھنے لگی:

تمھارا نام کیا ہے؟

میرا اضطراب انتہائی حد تک پہنچ چکا تھا، میں نے کہا: تمھیں میرے نام سے کیا غرض؟

مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں غصے میں اسے مار ڈالوں گی۔ وہ نرمی سے بولی:

اتنی درشتی سے کیوں بول رہی ہو؟

میں نے کہا: بخدا میں نہیں جانتی۔ تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟ کیا انسان یہاں آرام محسوس کر سکتا ہے؟

اس نے اسی نرمی اور دل نشیں انداز میں کہا: بس غصہ نہ کرو۔ میں بھی تم جیسی قیدی ہی ہوں۔

میں قدرے غصے سے بولی:

تم جھوٹ کیوں بول رہی ہو؟ تم شکل ہی سے قیدی نہیں لگتی۔

وہ بولی: واللہ العظیم میں قیدی ہوں اور سیل اخوانی خواتین سے بھرا ہوا ہے۔

مجھے اس کے لہجے میں سچائی محسوس ہوئی، میں نے بلاخوف اس سے پوچھا:

تمھارے ساتھ اور کون کون اخوانی ہیں؟

وہ بولی: ایک حاجہ حلب سے ہے دوسری کا نام ام شیما ہے اور ...... وہ مجھے سب کے نام بتانے لگی۔ کہنے لگی، میں اکیلی کمیونسٹ ہوں، باقی سب اخوانی ہیں۔

اس نے میری اور پھر ماجدہ اور ملک کی تلاشی لی۔ ایک اہل کار انتظار میں کھڑا تھا، وہ مجھے لے کر اوپر کی منزل پر چلا گیا اور مختلف راستوں سے گھماتا ہوا جنوبی شاخ (Section) لے آیا، تاکہ ضابطے کے مطابق تفتیش شروع کی جاسکے۔

## جلادوں کا سامنا

میرے اردگرد کا ماحول میری گھبراہٹ اور اضطراب بڑھا رہا تھا۔ ایک اندر آتا اور دوسرا باہر چلا جاتا۔ دروازہ بند ہو جاتا اور دوسرا نجانے اسے کہاں سے کھول کر آ جاتا۔ ہر آنے اور جانے والا وائرلیس اور زنجیریں اور دوسرے آلات تعذیب تھامے ہوئے ہوتا۔ سب سے پہلے انھوں نے مجھے ادارے کے سربراہ ناصیف خیر بک کے کمرے میں داخل کیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے

میں کسی اور دُنیا میں داخل ہوگئی ہوں۔ وسیع وعریض کمرے میں عمدہ قالین بچھے تھے اور اس کی زبردست زیبائش وآرائش کی گئی تھی۔ یہاں پر سردی کا کچھ احساس نہ رہا۔ کمرے کا فرنیچر اعلیٰ معیار کا تھا۔ حافظ الاسد کا تانبے کا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ افسرِ اعلیٰ ناصیف وائرلیس پر کسی سے بات کر رہا تھا اور کبھی کبھار آنکھوں کے گوشوں سے مجھ پر بھی نظر ڈال لیتا تھا۔ اس نے اہل کار کو اشارہ کیا کہ اس کے بات مکمل کرنے تک مجھے باہر لے جائے۔ وہ مجھے اس کے سامنے والے کمرے میں لے آیا۔ وہاں پر ایک شخص زنجیروں سے بندھا ہوا تھا اور کچھ لوگ اسے مار رہے تھے اور کچھ اگلوانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ ناصیف اپنا وائرلیس تھامے وہیں آ گیا، اور کبھی نوجوان، کبھی اہل کاروں اور کبھی وائرلیس پر گفتگو میں مصروف رہا۔ اس نے اہل کار کو اشارہ کیا، تو اس نے مجھے کندھے سے پکڑ کر باہر بھیج دیا۔ مجھے نیند آ رہی تھی، مجھ میں اتنی سکت نہ تھی کہ ان گالیوں، مکوں، لاتوں اور چیختی کراہتی اور مدد کے لیے پکارتی آہوں کو برداشت کر سکوں۔ اہل کار نے پھر مجھے اندر بلا لیا، شاید وہ چاہتے تھے کہ میں اس نوجوان کی تعذیب کا خود مشاہدہ کر لوں اور جو کچھ وہ چاہتے ہیں وہ سب انھیں بتا دوں۔

وہ چار یا پانچ اشخاص تھے جو اسے زنجیروں، ڈنڈوں اور لاٹھیوں سے مار رہے تھے اور اسے بجلی کا کرنٹ لگا رہے تھے۔ ان میں ناصیف، عبدالعزیز اور ایک اہل کار جس کا نام مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ حسین ہے اس تعذیب میں پیش پیش تھے۔ میں نہ تو اس نوجوان کو جانتی تھی نہ اس کا قصور۔ لیکن وہ مسلسل کراہ رہا تھا اور ایک ہی جملہ دہرا رہا تھا:

اللہ العظیم مدد فرمائیے۔

آخر کار اس نے اعتراف کر لیا۔ میں نہیں جانتی کہ اس نے ناقابلِ برداشت تشدد کی بنا پر اعتراف کیا یا کسی اور سبب سے۔ اس نے اقرار کیا کہ اس نے ایک سپاہی کو قتل کیا ہے۔ اور جس وقت اس پر بے تحاشا تعذیب ہو رہی تھی اور اس کی چیخیں عمارت کو لرزا رہی تھیں، میں نے اس اہل کار سے پوچھا:

تم مجھے کیوں یہاں لائے ہو؟

وہ تمسخرانہ انداز میں بولا: معلوم نہیں۔ ان ہی سے پوچھ لو۔

میں ان سے نہیں پوچھ سکتی، مگر میرے پاس اعتراف کرنے کو کچھ نہیں۔

وہ تقریباً آدھا گھنٹہ اسے مارتے رہے۔ پھر جب اسے اٹھایا تو وہ زخموں سے چور تھا۔ انھوں نے اس کے ہاتھ پاؤں اتنی سختی سے باندھے کہ وہ بلبلا اٹھا۔ اسے سیل میں بھجوا کر ایک اہل کار نے میری طرف اشارہ کیا، مجھے اس کی جگہ کھڑا کر دیا گیا۔ سب اچانک باہر نکل گئے اور برقی دروازہ بند ہو گیا اور وہ مقام بالکل دیوار کا حصہ بن گیا، لیکن چند ثانیے بعد وہ نجانے کہاں سے داخل ہو گئے۔ مجھ سے بلا کوئی سوال کیے یا کچھ بولے اچانک ایک نے میرے منہ پر پوری طاقت سے طمانچہ رسید کیا۔ میرا سر زور سے دیوار سے ٹکرایا، مجھے پوری دُنیا گھومتی ہوئی نظر آئی، اچانک میری ان سب پر نظر پڑی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میرا سر نیچے اور ٹانگیں اوپر ہیں۔ ایک شخص کرختگی سے بولا:

سنو۔ تمھیں سب کچھ سچ سچ بتانا ہوگا۔

## ہوا کی بساط

اچانک رائد شلیجہ باہر گیا اور ناصیف اور آپریشنل ہیڈ کو لے آیا۔ یہ وہی شخص تھا جو مجھے ہاسٹل سے یہاں لایا تھا۔ ناصیف بولا:

تیرا ناس ہو۔ تم سچ سچ بتاؤ گی؟ تمھیں اقرار کرنا ہوگا، بتاؤ تمھارا بھائی کہاں ہے؟

میں نے کہا: میرا بھائی یہاں نہیں۔

بولا: پھر وہ کہاں ہے؟

میں نے کہا: مجھے نہیں معلوم، بظاہر وہ تعلیم مکمل کرنے گیا ہے۔

اور حقیقت بھی یہی تھی کہ امی جب صفوان سے ملنے اردن گئی تھیں تو اس نے ان سے کہا تھا، وہ تکمیلِ تعلیم کے لیے پاکستان جا رہا ہے۔ اس وقت تک مجھے معلوم نہ تھا کہ میری امی کو بھی اسی عقوبت خانے میں لایا گیا ہے اور چند ثانیے پہلے وہ ان سے بھی یہی سوال کر چکے ہیں اور ان کا بھی یہی جواب تھا اور ہمارے بیان کی اس مطابقت نے ہی مجھے اس وقت تعذیب سے بچا لیا تھا۔

وہ درشت لہجے میں بولا:

تم جانتی ہو کہ تمھارا بھائی یہیں ہے اور ہم اسے ضرور پکڑ کر تمھارے سامنے لے آئیں گے یا اس کے کسی ساتھی کو...... اس گھر کا سراغ بھی لگا لیں گے جہاں وہ چھپا ہوگا۔

میں نے کہا: میں اس کے بارے میں نہیں جانتی۔

اس نے کسی کو پکار کر کہا، اسے لے جاؤ اور لٹکا دو۔

ایک اہل کار نے مجھے لکڑی کے تختے پر لٹا کر میری گردن، کلائیاں، پیٹ، گھٹنے اور پاؤں اس سے باندھ دیے، اور مجھے الٹا لٹکا دیا، میرے پاؤں فضا میں تھے اور ان سے کپڑا ہٹ چکا تھا، صرف جرابیں ان کو ڈھانپ رہی تھیں، میں اپنے جسم کو حرکت نہ دے سکتی تھی۔ اہل کار پوری قوت اور غضب سے چلایا:

سر دیکھیے۔ آپ نے نوٹ کیا؟ یہ کہتی ہے یہ اخوانی نہیں لیکن اس نے اپنے آپ کو مکمل ڈھانپ رکھا ہے ان ہی کی طرح۔ اس ٹکٹکی پر بھی اس کا ستر قائم ہے۔

انھوں نے ٹکٹکی کو چھت سے لٹکی زنجیر کے ساتھ ٹانگ دیا۔ آپریشن ہیڈ ایک لمبا ڈنڈا پکڑے ہوئے آگے بڑھا اور اسے بلند کر کے دھمکاتے ہوئے بولا:

تمھیں سب کچھ بتانا پڑے گا۔

میں نے کہا: میرے پاس بتانے کو کچھ نہیں۔

رائد شلچہ میرے سر کی جانب آیا، اس کے ہاتھ میں مربع شکل بجلی کا بورڈ اور پلگ تھا،

اور ایک ہاتھ نما چیز تھی جس پر کلپ لگے ہوئے تھے، اس نے کلپ میری ہاتھ کی انگلی کے ساتھ لگا کر اس میں کرنٹ چھوڑ دیا اور ڈنڈے سے میرے پاؤں کے درمیان میں ضرب لگائی۔ ایسا لگا جیسے میرے پورے بدن میں آگ لگ گئی ہو۔ وہ میری چیخوں کو خاطر میں لائے بنا بولا:

ہوں .... تمھیں بکواس کرنی پڑے گی؟

میں چلائی: میں کہہ چکی ہوں میرے پاس اعتراف کرنے کو کچھ نہیں۔

وہ سرد مہری سے بولا: تم نے دیکھا نہیں کہ بجلی کی طاقت کیا ہوتی ہے؟ یہ ہمارے پاس سب سے ہلکا ٹارچر شمار ہوتا ہے۔

میں نے کہا: اگر ایسا ہی ہو تو بھی کیا، میں ان چیزوں کا اعتراف کرلوں جو میں نے نہیں کیں۔

اس پر وہ بولا: نہیں۔ تم جھوٹ کہہ رہی ہو اور ہم سے چھپا رہی ہو۔ تمھیں ابھی ہمارے ساتھ جانا ہوگا اور اس گھر کی نشان دہی کرنا ہوگی جہاں تمھارا بھائی اور اس کے ساتھی رہتے ہیں، ورنہ ہم تمھیں ہلاکت تک پہنچادیں گے۔

ثلجہ ایک تصویر میرے منہ کے قریب لا کر پوچھنے لگا:

تم اس نوجوان کو پہچانتی ہو؟

میں نے کہا: نہیں۔

بولا: کیسے؟ کیا تم اپنے بھائی کے دوستوں کو نہیں پہچانتی؟

میں نے کہا: نہیں۔

بولا: لیکن یہ تمھارے بھائی کا جگری دوست ہے۔ یہ عبدالکریم رجب ہے۔ تم نہیں جانتی؟

میں نے اعتماد سے کہا: نہیں، بالکل نہیں۔

رائد ثلجہ نے مجھ پر لگائے گئے الزامات باآواز بلند دوبارہ پڑھنے شروع کیے: ہبہ الدباغ۔ منتظمہ .... میں زور سے چلائی: یہ جھوٹ کا پلندہ ہے۔

میرے انکار کے بعد تعذیب کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوگیا۔ آپریشنل ہیڈ پوری قوت سے میرے پاؤں پر کوڑے برسانے لگا۔ پاؤں پر ضرب پڑنے سے پہلے ہی اس کی سنسناہٹ سنائی دیتی۔ ایک اور اہل کار اپنے بید کے ساتھ تعذیب دینے میں شریک ہوگیا اور عبدالعزیز میرے سر کی جانب کھڑا ہو کر میری انگلیوں پر ننھے سہرے سے کرنٹ لگانے لگا۔

اتنی شدید تکلیف ہوئی کہ اس کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔ شروع میں چیختی رہی اور میری زبان پر "یا اللہ" کا کلمہ جاری رہا، لیکن کچھ دیر بعد آواز نکالنا بھی میرے بس میں نہ رہا۔ میں سر پٹختی رہی اور مجھے کسی بھی چیز کا احساس نہ رہا۔ دس منٹ مسلسل تعذیب کے بعد وہ اچانک رک جاتے اور گالی گلوچ اور توہین آمیز کلمات کے بعد یہ کہہ کر دوبارہ شروع ہو جاتے:

چلو جاؤ موت کے منہ میں۔

کچھ دیر بعد انھوں نے میری رسیاں کھول دیں اور ایک اہل کار مجھے دھکیلتا ہوا مختلف راستوں اور زینوں سے اترتا ہوا بیرونی دروازے کے پاس کھڑی گاڑی کی جانب لے آیا، اچانک ہی ایک اور اہل کار ماجدہ کو گھسیٹتا ہوا لے آیا۔ انھوں نے ہم دونوں کو اس میں سوار کرا دیا، ہم میں اتنی ہمت نہ تھی کہ ایک دوسرے کا حال ہی پوچھ لیتے۔ گاڑی بڑی تیزی سے باہر کی جانب لپکی، ایک اہل کار پوچھنے لگا:

سچ سچ بتاؤ گی؟

مجھے ایسا لگا کہ میرا رواں رواں چیخ کر کہہ رہا ہے:

میرے پاس بتانے کو کچھ نہیں۔ میرا کسی سے کوئی تعلق نہیں۔ کیا تم مجھ سے جھوٹ کہلوانا چاہتے ہو؟ کیا تم یہی چاہتے ہو۔

گاڑی رک گئی، ڈرائیور ہمیں عمارت کی جانب لے کر نہ گیا بلکہ دوبارہ عقوبت خانے میں لے آیا اور وہی سوالات، الزامات اور تہمتیں دہرائی جانے لگیں، لیکن اس مرتبہ تعذیب اور تشدد

پہلے سے بھی بڑھ کر تھا، حتیٰ کہ مجھے یہ بھی خبر نہ رہی کہ کتنے لوگ مجھ پر تشدد کر رہے ہیں اور کتنے کوڑے اور ڈنڈے میرے پاؤں پر برس رہے ہیں۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ پورا کمرہ ڈنڈوں اور کوڑوں پر مشتمل ہے اور اہل کاروں کے سوالات بیک آواز مینڈکوں کی ٹرٹراہٹ میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ پھر میں نے ان کو جواب دینا بھی چھوڑ دیا۔

رائدِ شلجہ بولا: تم اخوان کی مسلح کارکن ہو۔

میں اس بڑے الزام کو سہار نہ سکی اور چیخ کر بولی:

میرا نہ کسی سے تعلق ہے اور نہ ہی میرے پاس اسلحہ ہے۔

وہ بولا: تمھاری ساتھی ماجدہ اس کا اعتراف کر چکی ہے۔

میں نے کہا: مجھے اس کا یقین نہیں۔ اسے لاؤ تاکہ وہ میرے سامنے یہ کہہ دے۔ ہوسکتا ہے اس نے تعذیب سے بچنے کے لیے ایسا کیا ہو۔

بولا: نہیں۔ تمھاری ساتھی جھوٹ نہیں کہتی۔ وہ تم سے زیادہ سچی ہے۔ میں نے بس اس سے بات کی ہے، اسے ٹارچ نہیں کیا اور تم بھی جب تک اعتراف نہیں کرو گی اسی طرح مار کھاتی رہو گی۔

شلجہ آگے بڑھا اور اس نے بجلی کی ننگی تار میری زبان پر رکھ دی اور دھمکاتے ہوئے کہنے لگا:

کیا اب بھی نہیں بولو گی؟

میں نے کہا: میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں۔ تم مجھے کرنٹ لگاؤ یا کوڑے مارو، میں کچھ نہیں جانتی اور میں جھوٹ نہیں بول سکتی۔

اس وقت ناصیف چلا کر بولا:

آؤ اسے اٹھا لاؤ اور اسے کاغذ قلم دو، تاکہ یہ جو کچھ جانتی ہے اس پر مبنی اپنا تحریری بیان لکھے۔ اس کے بعد ہم اسے دیکھ لیں گے۔

وہ جاتے ہوئے مجھے دھمکاتے ہوئے کہنے لگا:

اگر تم نے سچ سچ نہ لکھا تو جان رکھو کہ ہمارے پاس ایسے وحشی اہل کار ہیں جو درواذہ بند کر دیتے ہیں۔ پھر بولا: تم نے کبھی چلے کاٹتے سادھوؤں کو دیکھا ہے ان کی شکلیں کیسی ہو جاتی ہیں؟ اگر تم نہیں جانتی تو ہم تمھیں ان کا چہرہ دکھادیں گے۔

## موت مومن کی راحت ہے

انھوں نے مجھے ٹکٹکی سے اتارا تو میرے کپڑے بھیگے ہوئے تھے، شاید میں دوران تعذیب بے ہوش ہو گئی تھی اور انھوں نے مجھے ہوش دلانے کے لیے پانی ڈالا تھا۔ میں اونگھتے ہوئے ارد گرد کا جائزہ لے رہی تھی۔ کمرے سے تقریباً سب لوگ جا چکے تھے۔ کمرے کی کھڑکی سے مجھے اندازہ ہوا کہ رات ہو چکی ہے، گویا دو یا تین گھنٹے سے مجھے ٹارچ کیا جا رہا تھا۔ میں ابھی اپنے حواس بھی درست نہ کر پائی تھی کہ ایک اہل کار کاغذ قلم لے کر آ گیا اور بولا:

سنو۔ اگر سچ لکھو گی تو اپنے آپ کو عذاب سے بچا لو گی، ورنہ تمھارے نام و نشان کی بھی کسی کو خبر نہ ہو گی۔

میں نے کہا: لیکن میرے پاس کہنے کو کچھ ہے ہی نہیں۔

بولا: یہاں کوئی بھی معصوم نہیں آتا، اس کے پاس ضرور کچھ ہوتا ہے۔ یہاں جو بھی آئے وہ گناہوں کے سبب ہی پکڑا جاتا ہے۔

میں نے کہا: لیکن میرے پاس واقعی کچھ نہیں۔

بولا: تم اپنے فیصلے میں آزاد ہو۔

میں نے کاغذ پر اپنے بارے میں سب کچھ لکھ دیا، کیا تعلیم حاصل کی اور کہاں پر حاصل کی، میرا اخوان کی تنظیم سے کیا تعلق ہے۔ میں نے جو کچھ حقیقت تھا۔ لکھ کر ورقہ اہل کار کو تھما دیا۔ وہ اسے لے کر چلا گیا، ذرا دیر بھی نہ گزری تھی کہ رائد علیجہ ورق ہاتھ میں تھامے آ گیا اور چلانے لگا

کیا یہی کچھ لکھنے کو تمھیں کہا گیا تھا بہن!

پھر اس کی زبان سے گالیوں اور مغلظات کی بوچھاڑ ہونے لگی، گویا کہ وہ یہ سب کہنے کا پہلے سے منتظر تھا۔ آخر میں کہنے لگا:

تمھیں بہت اچھی طرح معلوم ہے کہ تمھارا بھائی اور اس کے ساتھی کس گھر میں رہتے ہیں اور تمھیں ابھی بتانا پڑے گا، لیکن میں جانتا ہوں کہ تم اب تک خاموش کیوں ہو۔ تم ان کو فرار کا موقع دے رہی ہوتا کہ وہ اپنا ٹھکانہ بدل لیں، پھر تم بتاؤ گی۔

اس نے اس ورق پر کچھ لکھا اور اسے لے کر چلا گیا۔ جاتے جاتے کہنے لگا، اس صورت میں تو تم موت تک یہاں سے نہیں نکل سکو گی۔

میں نے کہا: اچھا۔ موت مومن کے لیے راحت ہے۔

وہ غضب ناک ہو کر بولا: تمھارا گھر تباہ ہو، تم جانتی نہیں کہ میں نے کتنوں کو موت کا مزا چکھایا ہے؟ کیا تم سوچتی نہیں کہ اپنے اوپر کچھ رحم کرو اور اس عذاب سے چھوٹ جاؤ؟

ناصیف نے اندر آتے ہی گالیوں کی بوچھاڑ کر دی اور بہت گندے الفاظ استعمال کیے، کہنے لگا:

اگر تم ابھی اور اسی وقت ہر چیز کا اعتراف نہیں کرتی۔ تو میں سب کے سامنے تمھارے کپڑے اتار دوں گا۔

اس دھمکی نے مجھے دہلا کر رکھ دیا، میں نے چیختے ہوئے کہا:

لیکن میں کچھ نہیں جانتی۔

اس نے حاکمانہ لہجے میں کہا: اپنا جلباب اتار دو۔

میں نے اسے پتھرائی نظروں سے دیکھا، میرا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ بولا:

اگر تم اسے خود نہیں اتارتی؟ تو میں اتار دیتا ہوں۔

وہ میری جانب بڑھا اور اس نے جلباب کا ازار کھولنا چاہا لیکن اسے اس کا سرا نہ ملا۔ کیونکہ اس کا ازار اندرونی جانب تھا، اس نے بڑی کوشش کی مگر میں اپنا بچاؤ کرتی رہی۔ میں نے اسے سرے سے مضبوطی سے پکڑے رکھا تا کہ وہ ڈھیلا ہو کر اتر نہ جائے، وہ کوشش کے باوجود مجھے بے حجاب کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس نے جلباب کے نیچے سے میرے بندھے ہوئے بالوں کو پکڑ لیا جو اس وقت کافی لمبے ہوتے تھے۔ اس نے بندھے بالوں سے مجھے اپنی جانب کھینچنا شروع کیا اور میں گھسٹتی چلی گئی۔ اس نے مڑ کر میرا سر پوری قوت سے دیوار سے دے مارا۔ اور اس کے منہ سے گندی گالیوں کا آتش فشاں پھوٹ بہا، لیکن وہ اس چھینا جھپٹی کے باوجود میرا حجاب نہ اتار سکا، وہ زچ آ کر بولا:

تمھارے انکار کے باوجود تمھارا لباس اور جلباب بتا رہا ہے کہ تم اخوانی ہو۔

اس نے کسی کو زنجیر اور کوڑا لانے کے لیے کہا۔ اس وقت تعذیب سے میرے پاؤں سوج کر کپا بن چکے تھے اور جوتے پہننا بھی ممکن نہ تھا۔ میں سزا سے بچنے کے لیے بھاگ کھڑی ہوئی۔ ناصیف نے چڑ کر کہا: اسے میری نظروں سے دور منفردہ (قید تنہائی کے سیل) لے جاؤ۔ میں اس کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔

مجھے یقین نہ آ رہا تھا کہ ان کی ''ٹارچر پارٹی'' اختتام پذیر ہو چکی ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ منفردہ کے معنی کیا ہیں۔ اہل کار مجھے کئی زینوں اور راستوں سے گزارتا ہوا ایک نئی جگہ لے گیا۔ راستے میں کہنے لگا: تم بتا کیوں نہیں دیتی؟ تمھارے حق میں یہی بہتر نہیں؟ کم از کم اپنے حال پر ہی رحم کرو۔ دیکھو تمھارا چہرہ کس قدر سوج گیا ہے، تمھارے ہاتھ نیلے ہو گئے ہیں اور پاؤں جوتا پہننے کے قابل نہیں رہے اور تمھارا حال یہ ہے کہ مر کر بھی راز دبائے بیٹھی ہو۔

میں نے کہا: میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں۔

میرا دل بھر آیا اور میں نے صرف یہ کہا: اللہ ان ظالموں کو عافیت نہ دے۔

ہم سیل کے پاس پہنچے تو حسین وہیں کھڑا تھا۔ یہ وہی اہل کار تھا جو اس نوجوان کو تعذیب دینے میں پیش پیش تھا۔ وہ بڑے تمسخرانہ انداز میں ہتھکڑیاں لیے میری جانب بڑھا:

اھلاً۔ اھلاً وسھلاً۔ زہے نصیب۔

## مرغیوں کا ڈربہ

حسین نے مجھے کندھے سے پکڑ کر پانچ سیڑھیاں نیچے اتار دیا اور مجھے قیدِ تنہائی کے لیے ایک نئے راستے پر میرے آگے چلنے لگا۔ پھر ایک جانب اشارہ کر کے کہنے لگا:

یہ رہا تمھارا کمرہ۔ آباد کمرہ۔ ان شاء اللہ مزے سے سوؤ گی یہاں۔

اس کی تاریکی اور وحشت سے میرا دل گھبرا اٹھا۔ میں بے ساختہ بولی:

نہیں بخدا۔ میں اس میں نہیں جاؤں گی۔

مجھے اسی وقت اپنی روم میٹ فاطمہ ایک سیل میں نظر آئی...... میں بھاگ کر اس کے قریب چلی گئی اور خوشی سے چلائی: فاطمہ......!

اس نے مجھے گھسیٹتے ہوئے کہا: ادھر آؤ۔ چلو۔ تم کسی ہوٹل یا پکنک پوائنٹ پر نہیں آئی ہو۔

وہیں سیل نمبر ۲۴ سے مجھے اپنی امی کی آواز سنائی دی، شاید انھوں نے بھی میری آواز سن لی تھی، انھوں نے بلند آواز میں ان ظالموں کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا اور زور سے بولیں:

ان خواتین پر تم طاقت آزما رہے ہو ظالمو۔ تم رحم سے نا آشنا ہو۔ بخدا میں نے ساری عمر تمھارے بارے میں یہی قصے سنے تھے کہ تمھارے سینوں میں دل نہیں ہوتے لیکن اب میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔

مجھ میں اتنی طاقت نجانے کہاں سے آ گئی۔ میں چھلانگ لگا کر آواز کی جانب بھاگی۔ میں باآوازِ بلند پکار رہی تھی:

امی! آپ بھی یہاں ہیں؟ اللہ تمھیں برباد کرے۔تم ان کو کیوں لے آئے ہو؟ میری بہنیں چھوٹی ہیں اور والد بیمار ہیں۔ان کا کوئی اور مددگار بھی نہیں۔

مجھے حسین کا استہزائیہ قہقہہ سنائی دیا:

ہمیں تمھارے باپ اور بہن بھائیوں سے کیا سروکار؟ ہمیں صرف تمھاری ماں مطلوب تھی۔

اس نے تمام سیلوں کی کھڑکیاں بند کردیں اور بولا: اندر جاتی ہو یا اہل کاروں سے اٹھوا کر اندر پھینکوں۔

میں نے کہا: اندر سیاہ اندھیرا ہے۔

وہ تمسخرانہ انداز میں بولا: تمھارے وجود سے سب تاریکی چھٹ جائے گی۔آؤ اندر آجاؤ۔

میں نے دیکھا تو وہاں ایک تھالی میں چاول اور دوسرے برتن میں پانی رکھا تھا۔

میں نے کہا: بخدا یہ تو بالکل مرغیوں کا ڈربہ ہے اور بعینہٖ جانوروں کا سا معاملہ ہے۔

بولا: یہ تمھارا عشائیہ ہے دل مانے تو کھالو۔

میں نے غصہ دباتے ہوئے کہا: تم جانتے ہو کہ اگر یہ تمھیں پیش کیا جائے تو تم بھی نہ کھاؤ۔

وہاں ایک اور قدرے بڑی عمر کا اہل کار آگیا، جس کا معاملہ بعد میں بھی بہت اچھا رہا۔ وہ دھیرے سے کہنے لگا:

بخدا میری بہن اندر چلی جاؤ اور ان کو ہنسنے کا موقع نہ دو۔

میں فوراً اندر چلی گئی، میری ماں کی آواز اب تک آرہی تھی۔ پھر ان کی آواز اہل کاروں کے قہقہوں، ہاؤ ہو اور دھمکیوں میں دب گئی۔ کچھ ہی دیر بعد ہر طرف شراب کی بدبو پھیل گئی اور تیز شور ہونے لگا۔ ہاں ..... اس روز اہل کار سال نو کا جشن منا رہے تھے۔اس تاریک وحشت کے گھر میں میرا دم گھٹنے لگا۔ میں مسلسل ایک جگہ بیٹھی رہی اور میرے اعصاب کھنچتے چلے گئے۔ خاص طور پر مجھے ماجدہ کا خیال پریشان کررہا تھا کیونکہ وہ میرے بعد ماجدہ کو تعذیب کے لیے

لے گئے تھے۔ میں سوچ رہی تھی اس گھڑی اس پر وہی حربے آزمائے جا رہے ہوں گے۔
آدھی رات گزر چکی تھی جب ایک اہل کار مجھے دوبارہ کمرۂ تفتیش میں لے گیا۔

کمرۂ تفتیش میں رائد شلچہ میرا منتظر تھا، دیکھتے ہی بولا:

تمھارا اخوان سے کوئی تعلق نہیں، کیا ایسا ہی نہیں؟ نہ تم نے ان کے لیے کام کیا ہے، اسی لیے تم اعتراف نہیں کرنا چاہتی۔ لیکن آج اللہ نے ایک شخص بھیج ہی دیا جس نے تمھارے بارے میں اعتراف کر لیا ہے۔ یہ تمھاری ہی سہیلی ہے اس کی مراد ماجدہ سے تھی۔ اس نے بتایا ہے کہ تم مسلح تھیں اور اس نے خود تمھارے پاس اسلحہ دیکھا تھا۔

میں نے چیلنج کے انداز میں کہا: اسے میرے سامنے لے آؤ تا کہ میں خود تسلی کر لوں۔ لاؤ اسے تا کہ وہ یہ سب میرے سامنے کہہ دے۔

بولا: وہ جھوٹ نہیں کہہ رہی۔ وہ تم سے زیادہ سچی ہے، اور تمھارا لیموں کی طرح پیلا رنگ خود تمھارے جھوٹا ہونے کی گواہی دے رہا ہے۔

میں نے کہا: میں دو راتوں سے مسلسل جاگ رہی ہوں، نہ میں نے کھانا کھایا ہے نہ پانی پیا ہے نہ بیت الخلا گئی ہوں، اس کے ساتھ آپ نے جس طرح عقوبت کا نشانہ بنایا ہے اور مجھے قتل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور میرے دل پر جو چرکے لگائے ہیں، اس کے بعد بھی تم کہتے ہو کہ میرا رنگ زرد کیوں ہو گیا ہے۔ اس نے سر ہلایا اور ہونٹ سکیڑ کر دربان کو بلایا تا کہ وہ مجھے دوبارہ میرے سیل میں لے جائے۔ میں دوبارہ اپنی جگہ پر پریشان حال اور مضطرب بیٹھ گئی۔ میں نے خوف کے مارے کمبل بھی نہ کھولا، کہیں ایسا نہ ہو کوئی اہل کار اندر آ جائے اور میں سو رہی ہوں۔ میں سیل کے درمیان میں بیٹھی تھی کہ اچانک میری نظر دیوار پر پڑی، اس تاریکی میں بھی اس پر رینگتے لال بیگ نظر آ رہے تھے۔ شاید وہ اپنی نئی مہمان کے استقبال کے لیے دیواروں پر آ گئے تھے۔ اچانک سکون کی چادر میں دراڑ پیدا ہو گئی اور باہر سے ملی جلی آوازیں

آنے لگیں۔ ساتھ ہی قیدیوں کی چیخیں۔ زینوں اور راستوں پر ہانکنے اور بھاگنے کی آوازیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ گرفتار شدگان کی نئی کھیپ آ گئی ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ چھ یا سات نوجوان تھے، ان کی عمریں بارہ سے پندرہ برس کے درمیان تھیں، وہ سب کسی مسجد میں تھے، جہاں سے گرفتار کر کے انھیں یہاں لایا گیا تھا، جہاں سیل کا رقبہ میٹر یا ڈیڑھ میٹر سے زائد نہ تھا۔ وہ سب خوف زدہ تھے، ان میں سے ایک خوف یا تعذیب سے سخت چلا رہا تھا اور بار بار مطالبہ کر رہا تھا کہ اسے بیت الخلا لے جایا جائے۔ اہل کار سال نو کی تقریبات میں مگن تھے، اس کی چیخ و پکار کے جواب میں ایک ہی آواز سنائی دیتی:

اپنا حلق بند کرو۔

لیکن لڑکا اپنے قابو میں نہ تھا، وہ پھر چیخنا چلانا شروع کر دیتا اور واسطے دیتا اور مدد کی درخواست کرتا:

اللہ کی قسم میرے پیٹ میں بہت درد ہے۔ بخدا۔ میں اپنے اوپر کنٹرول نہیں کر سکتا۔

زیادہ چیخ پکار کے بعد ایک اہل کار آتا، کھڑکی کھول کر اسے دو چار بید رسید کرتا اور چلاتا ہوا واپس چلا جاتا:

اپنا حلق مت پھاڑو، چپ کر جاؤ اوئے .....

ایسی ہی ایک مار کے بعد نوجوان اچانک چپ ہو گیا، مگر اف۔ اتنی تیز بدبو پھیلی کہ پورے سیل میں دم گھٹنے لگا۔ ایک اہل کار لعنت ملامت کرتا ہوا بھاگتا ہوا آیا اور کہنے لگا:

تم نے یہاں ..... کر دی اوئے! اور باہر نکال کر پاگلوں کی طرح اسے پیٹنا شروع کر دیا۔ دوسرے سیل سے میری امی کی ڈانٹ بھری آواز سنائی دی:

اللہ تمھیں برباد کرے۔ تم انسانوں کے سینے میں دل نہیں؟ وہ تمھاری منتیں کرتا رہا کہ اسے بیت الخلا لے جاؤ لیکن تم نے ایک نہ سنی اور اب وہ بے بس ہو گیا تو۔ یہ غریب اور کیا کرتا؟

سیل میں دوبارہ سکون ہوگیا، یہ پہاڑ جتنی لمبی رات کاٹے نہ کٹ رہی تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ مجھے قتل کرنے سے پہلے یہ کتنی بار گھسیٹ کر عقوبت خانے میں لے جائیں گے، میرا لباس نوچیں گے اور کتنا ٹارچر کریں گے۔ فجر کے قریب سیل کی دیوار کسی نے ہولے سے بجائی۔ میں سمجھ گئی، یہ ماجدہ تھی جو ہمیشہ کی طرح مجھے فجر کا وقت ہونے کی اطلاع دے رہی تھی۔ میں نے تیمم کرکے نماز پڑھنے کا ارادہ کیا مگر قبلہ معلوم نہ تھا، میں نے دروازہ بجایا تو حسین آ گیا، میں نے اس سے پوچھا تو کہنے لگا:

میں نے کبھی نماز نہیں پڑھی۔ مجھے نہیں معلوم، لیکن قیدی جوان کمروں میں اسی رخ پر پڑھتے ہیں۔ اس نے ایک جانب اشارہ کردیا۔

میں نماز پڑھ رہی تھی کہ ایک اہل کار آ گیا، بڑے طنزیہ انداز میں کہنے لگا: اب نمازیں یاد آگئیں ہیں۔ اللہ قبول فرمائے۔

بوڑھا اہل کار پھر آ گیا، اس نے ناشتہ رکھا اور بیت الخلا میں جانے کا پوچھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ آگے چلنے لگا۔ ہر طرف سکوت تھا۔ اس نے بتایا کہ میرے، ماجدہ اور امی کے علاوہ سب لوگ رہا ہوگئے ہیں۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی:

انھیں کیوں رہا کر دیا گیا اور ہمیں کیوں نہیں کیا؟ مجھ پر بھی کوئی جرم ثابت نہیں ہوا۔ میں بے گناہ ہوں۔

وہ بولا: میں کچھ نہیں جانتا۔ سب سے پوچھ لو میں تو ادنیٰ سا ملازم ہوں۔

بولا: کھانا کھالو، بھوک لگی ہوگی؟ میں نے اپنے ناشتے سے مکھن، جام وغیرہ بچا کر رکھا ہے۔

میں نے شکریے کے ساتھ معذرت کردی۔ میری بھوک اڑ چکی تھی۔ میں نے اس قیدِ تنہائی میں اسی طرح پریشان حال آٹھ دن گزار دیے۔

## الخط اور چرواہا

بجن کفر سوسہ میں میں نے صبح کے وقت اپنے سیل پر نظر ڈالی تو وہ کسی اور چیز سے زیادہ ایک قبر سے مشابہ تھا، جس کی دیواروں پر لال بیگ رینگ رہے تھے۔ شروع میں تو دیواروں پر سیاہی کا گمان ہوتا تھا مگر جب نظر اندھیرے میں کسی قدر دیکھنے کے قابل ہوئی تو کچھ خطوط بھی نمایاں ہو گئے۔ کئی جگہوں پر ''اللہ اکبر وللہ الحمد'' کھود کر لکھا گیا تھا، اور کتنے ہی لوگوں کے نام بھی تھے جو یہاں اس سے پہلے مکین رہ چکے تھے۔ اسی طرح ایک مسجد کا نشان تھا جس کے گرد ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' اور اس کے نیچے غالباً لکھنے والے کا نام کندہ تھا۔ اسی طرح ایک جگہ فلسطین کا نقشہ بنا کر اس کے نیچے ''اللہ اکبر وللہ الحمد'' لکھا تھا۔

نمازِ فجر کے دو گھنٹے بعد جیل میں دن کا آغاز ہو گیا۔ جلد ہی گالی گلوچ، لعنت ملامت اور کافرانہ کلمات کے ساتھ قیدیوں کی پیٹھوں پر کوڑے اور زنجیریں برسنے کی آوازیں نمایاں ہو گئیں۔ انھیں وہ بیت الخلا یا جیل کی مروج زبان میں ''الخط'' لے جا رہے تھے۔ ایک عسکری یاسین زنجیر کا ایک سرا ہاتھ میں پکڑ کر قیدیوں کو گھسیٹتا اور چھترول کرتا ہوا لے کر چلتا تھا۔ وہ انھیں مسلسل گالیاں بکتے ہوئے جانوروں کی طرح ہانکتے ہوئے لے کر جاتا تھا۔ ایسے میں اگر کوئی کراہ اٹھتا تو بس اس کی شامت ہی آ جاتی اور کوئی دوسرا ایسی جرأت نہ کر پاتا۔ میری امی کی ان کے سیل سے ملائمت بھری مگر طنز کے نشتر چلاتی آواز ابھری:

میرے بیٹے۔ تم کیا سمجھ رہے ہو کہ تم ابھی تک اپنے ریوڑ کے ہمراہ ہو، یہ جیل تمھاری چراگاہ ہے اور یہ گائیں ہیں جنھیں تم ہانک رہے ہو۔ یاسین صبح سویرے کچھ سیکھنے کے موڈ میں نہ تھا۔ اس نے ایک نوجوان پر تعذیب جاری رکھی اور اس خوف ناک منظر سے مزا لینے لگا۔ میری امی دروازہ پیٹتی رہیں اور ان کو تعذیب میں دیکھ کر دکھ سے روتی رہیں، مگر انھیں جواب دینے والا کوئی نہ تھا۔

کچھ ہی دیر میں میرے سیل کا دروازہ کھلا اور ایک اہل کار نے مجھے بیت الخلا جانے کا اشارہ کیا۔ میں فارغ ہوئی تو سوچا فرصت پا کر وضو بھی کرلوں، اچانک کیا دیکھتی ہوں کہ امی میرے سامنے کھڑی ہیں۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر حیران رہ گئیں ۔ وہ مجھ سے لپٹ گئیں اور بڑے اضطراب سے پوچھنے لگیں:

انھوں نے تمھیں مارا؟ تعذیب دی؟

میں انھیں پریشان نہ کرنا چاہتی تھی اس لیے بڑے سکون سے کہا: نہیں۔ میں خیریت سے ہوں۔

میں نے جوں ہی پاؤں دھونے کے لیے آگے بڑھی، ان کی نظر میرے پیروں پڑ گئی، وہ بھانپ گئیں:

لیکن یہ کیا ہے؟ تمھارا پاؤں تو بالکل نیلا ہو چکا ہے اور انگلیاں بھی سوجن کے سبب نظر نہیں آ رہیں۔ کیا تمھیں ٹارچر کیا گیا ہے؟ تمھیں کسی نے مارا ہے؟

میں نے دوبارہ کہا: نہیں۔ الحمدللہ مجھے کسی نے کچھ نہیں کہا۔

وہ فوراً ہی پہلے بولیں: پھر انھوں نے تمھیں کیوں پکڑا ہے؟

میں نے کہا: بخدا میں نہیں جانتی ۔ وہ صفوان بھائی کو تلاش کر رہے ہیں، مجھے ان کا پتا پوچھنے کے لیے پکڑا ہے۔

اتنی دیر میں حسین چیختا چلاتا آ گیا اور دوسرے اہل کار پر ناراض ہونے لگا کہ ایک کی موجودگی میں اس نے دوسری کو سیل سے باہر کیوں نکالا۔ وہ دونوں میری والدہ کو گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ میں امی سے پوچھ بھی نہ پائی کہ وہ ان کو کیوں اور کیسے لائے ہیں۔ کچھ دن بعد جب ہماری جیل کے بلاک میں ملاقات ہوئی تو انھوں نے تفصیل بتائی۔

میں چھٹیوں میں نئی چھوٹی چھوٹی چیزیں گھر بھول آئی تھی۔ میری والدہ صفوان بھائی کے پاس اردن جانے سے پہلے مجھ سے ملنے آ رہی تھیں، ان کے ہمراہ ایک اور خاندان کے لوگ بھی

تھے جن کا بیٹا بھی حکومت سے چھپتا چھپاتا صفوان بھائی کی طرح عمان چلا گیا تھا۔ امی نے بتایا:

جس رات تم گرفتار ہوئیں تمھارے والد نے ایک برا خواب دیکھا تھا، بلکہ اس سے پہلے صفوان کے حوالے سے بھی دیکھا تھا، تبھی انھوں نے مجھے کہا کہ میں اس سے ملنے اردن چلی جاؤں۔ میں دمشق میں تمھارے گھر کے قریب پہنچی اور میں نے اندر جانے کا ارادہ کیا تو مجھے ایک واضح آواز سنائی دی: خالہ جان واپس چلی جائیے، اندر نہ جائیں۔ یہ کوئی پڑوسی تھا، جو مجھے خود تو نظر نہ آیا مگر اس کی آواز آ گئی، وہ مجھے خبردار کر رہا تھا کیونکہ اس سے پچھلی رات تم گرفتار ہو چکی تھیں، لیکن میں نے گمان کیا کہ وہ مجھے نہیں کسی اور کو کہہ رہا ہے، پھر جوں ہی ہم نے دروازہ کھٹکھٹایا برستی گولیوں سے ہمارا استقبال ہوا اور ایک سخت ہاتھ نے ہمیں اندر گھسیٹ لیا، اور کچھ ہی دیر میں ہمیں کفر السوسہ کی جیل پہنچا دیا گیا۔

## أحکم الحاکمین سے شکایت

میری امی کو میرے حال سے بڑھ کر عمر کے گھرانے کے افراد کی فکر تھی جنھیں محض ان کے ساتھ ہونے کی وجہ سے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ ان کی والدہ اپنے اٹھارہ سالہ بیٹے ایمن اور چودہ سالہ بیٹی مجد کے غم بھی نہ بھولی تھیں جنھیں خفیہ والوں نے گھر کی سڑک پر ہی گولیوں سے بھون ڈالا تھا۔ اس وقت سے ان کی والدہ کا ذہنی توازن درست نہ رہا تھا۔ انھوں نے حجاب اتار دیا تھا اور اب وہ درد کی شدت کی وجہ سے اپنا سر سختی سے باندھ کر رکھتی تھیں۔ اس اچانک گرفتاری سے ان کے اعصاب جواب دے گئے اور پہلی رات اہل کار ان کے کان میں زور سے چیختے تو بھی انھیں سنائی نہ دیتا۔ ان کے شوہر کی ان سے بھی بری حالت تھی، وہ ستر سال سے زیادہ عمر کے تھے۔ وہ کمرۂ تحقیق کے دروازے پر ہی بے ہوش ہو گئے اور انھیں ان کی دو بیٹیوں اور بیوی نے سہارا دے کر چلنے میں مدد دی تھی۔ میری والدہ نے انھیں جھنجوڑ کر بیدار کرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ جب اہل کاروں نے اس گھرانے کی بری حالت دیکھی تو انھیں کمرۂ تحقیق سے سیل میں منتقل کر دیا،

لیکن وہاں بھی انھیں کوئی کمرہ نہ دیا گیا بلکہ وہ پوری رات ان بزرگوں کو میرے زنزانے کے سامنے رہ گزر کے کھرے فرش پر گزارنی پڑی۔

میری والدہ سے اہل کار پوچھتے رہے:

ہمیں اپنے مجرم بیٹے کے بارے میں بتاؤ۔ وہ کہاں ہے؟

وہ جواب دیتیں: میرا کوئی مجرم بیٹا نہیں۔ میرا بیٹا تو گھر سے یونیورسٹی اور یونیورسٹی سے گھر کا راستہ جانتا تھا۔

اس نے تمسخر اڑانے کے انداز میں دوسرے اہل کار سے کہا: اگر یہ سیدھی طرح نہیں بتاتی تو ٹکٹکی پر لٹکا دو۔

وہ بولی: کوئی بھلا کام کرو۔ میں تمھاری ماں کی عمر کی ہوں اور تم مجھے ٹکٹکی پر لٹکاؤ گے؟

کہنے لگا: لیکن تم کچھ بتاتی بھی تو نہیں۔

بولی: کیا کہوں؟ جو سچ کہیں تم ان سے یہ سلوک کرتے ہو۔

سبحان اللہ۔ اس نے انھیں بلا تعذیب چھوڑ دیا۔

سیل میں وہ ہر روز محقق (تفتیش کار) کو بلا بھیجتیں اور اس سے پوچھتیں: بتاؤ تم نے مجھے قید کیوں کر رکھا ہے؟

وہ کہتا: میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

وہ کہتیں مگر یہ سارا علاقہ تمھارے اختیار میں ہے۔ میں برانچ کے انچارج کو لکھنا چاہتی ہوں، مجھے کاغذ قلم فراہم کرو۔

وہ اتنا کہتے ہوئے چل پڑتا: ممنوع۔ کچھ نہیں ملے گا۔ اس کی ہمیں اجازت نہیں۔

وہ اس پر خوب غصہ جھاڑتیں اور اسے بددعائیں دیتے ہوئے کہتیں:

میں تمھاری شکایت کسی اور سے کر دوں گی۔ احکم الحاکمین سے۔ وہ تمھیں بھی میری طرح بٹھائے گا اور تم میری طرح صبر بھی نہ کر سکو گے۔

سبحان اللہ۔ ایک دو ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ یہ شخص کار کے حادثے میں مارا گیا۔ سٹیرنگ ویل اس کے پیٹ میں گھس گیا تھا اور میری والدہ نے اپنی موت سے قبل اس کی موت کی خبر سن لی۔

میری والدہ کی گرفتاری کے بعد بھی ہمارے ہاسٹل پر خفیہ والوں کی گھات جاری رہی اور انھوں نے وہاں کی رہائشی اور ملاقات کے لیے آنے والے دس سے زائد افراد کو وہاں سے گرفتار کیا۔ ان میں فاطمہ، سوسن س، منی اور اس کی بہن، یسری، منہا اور لاذقیہ سے ایک طالبہ کے علاوہ اس کا بھائی اور بھائی کا دوست، وغیرہ شامل تھے۔ لیکن جب انھیں گرفتار رکھنے کا کوئی فائدہ نظر نہ آیا تو رہا کر دیا گیا۔

## امّی کی ہڑتال

کوئی دن ایسا نہ گزرتا جب مجھے تحقیق کے نام پر حاضر نہ کیا جاتا، ہر بار پہلے زیادہ سخت ٹارچر کیا جاتا اور دھمکایا جاتا تھا۔ کم و بیش وہی سوالات اور وہی جوابات، اور وہی تھرڈ ڈگری۔ یہی پورے ہفتے کی روٹین ہوتی۔ اگر بدلتا تو صرف ٹارچر کا طریقہ۔ سیل میں واپسی ہوتی تو رات دن دوسرے لوگوں کی کراہیں مزید بے چین کر دیتی تھیں۔ اگر کوئی نماز ادا کرتا پایا جاتا تو بس اس کو بے رحمی سے پیٹا جاتا، اس پر کفریہ کلمات اور گالیوں کی بوچھاڑ کر دی جاتی تھی۔ اسی طرح اگر وہ آپس میں بات کر لیتے تو بھی ان پر تشدد کیا جاتا، مگر الحمدللہ ہم خواتین کو انھوں نے اس پر کبھی ٹارچر نہ کیا۔ ہم ان کے سامنے بھی نماز ادا کر لیا کرتیں۔ ایک مرتبہ اہل کار سامنے نہ تھا تو ماجدہ نے دیوار پر ہاتھ مار کر مجھے متوجہ کیا اور ہم آپس میں بات کرنے لگے، اچانک اہل کار بھاگتا ہوا آیا، کہنے لگا یہ کس کی آواز آ رہی ہے؟

اس خوف سے کہ کوئی نوجوان ہماری وجہ سے تعذیب کا نشانہ نہ بن جائے ماجدہ پورے

اعتماد سے کہنے لگی: میری۔

وہ غصے سے بولا: کس کے ساتھ بات کر رہی تھیں؟

بولی: اپنی سہیلی سے۔ کیا یہ منع ہے؟

اور الحمد للہ اس روز بھی کچھ نہ ہوا۔

میری والدہ مجھ سے ملنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتیں۔ اگر چہ انھیں خود تکلیف ہی کیوں نہ اٹھانی پڑ جائے۔ وہ انہیں بیت الخلا لے جانے کے لیے باہر نکالتے تو وہ میرے سیل کے سامنے آکھڑی ہوتیں، اور اس وقت تک وہاں سے نہ ہلتیں جب تک وہ قفل کھول کر ہماری ملاقات نہ کروا دیتے تھے۔ کبھی وہ طاق کھول کر ان سے کہتے لو دیکھ لو مگر بات نہیں کرنا۔ مگر وہ انکار کر دیتیں کہ دروازہ کھولو۔ اسی طرح کے ایک موقعے پر جب ان کا مطالبہ نہ مانا گیا تو انھوں نے کھانے اور بیت الخلا میں جانے حتیٰ کہ سونے کی بھی ہڑتال کر دی۔ مجھے اس کی اطلاع اس طرح ملی کہ رئیس النوبہ میرے پاس آکر کہنے لگا:

اب جب تمھاری امّی سے ملاقات ہو تو انھیں کچھ دین کا درس بھی دینا۔ ان کو بتاؤ کہ ان کے جسم کا بھی ان پر حق ہے۔ کیا تم نے شریعت نہیں پڑھی؟ ان سے کہنا کہ کھانا کھا لیں۔

میں نے کہا: وہ ماں ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ ماں کا دل کیسا ہوتا ہے اور وہ حق پر بھی ہیں۔

اگلے دن وہ مجھے ان کے سیل میں لے گیا اور کہنے لگا: ان سے کہو۔ جیسا کہ کل ہم نے طے کیا تھا۔

میں نے کہا: میں کیا کہوں ... یہ مختار ہیں۔

کہنے لگا: تم ان کی ہڑتال ختم کرانے میں ہماری مدد نہیں کرو گی؟

میں نے کہا: میں کیا کروں۔ آپ ان کی حالت نہیں دیکھ رہے؟ اللہ ان کی مدد فرمائے۔

وہ ان سے کہنے لگا: تم نے بیٹی کو دیکھ لیا؟

لیکن انھوں نے غصے سے نظر اٹھائے بغیر کہا: نہیں۔

بولا: مجھے حیرت ہے۔ اب کیا چاہتی ہو؟

کہنے لگیں: تم جانتے ہو میں کیا چاہتی ہوں۔ حتیٰ کہ اللہ کا اذن آ جائے۔ وہ تم سب سے اچھا ہے اور وہ احکم الحاکمین ہے۔ اور تمھاری گردنیں توڑنے پر قادر ہے۔

وہ احمقانہ انداز میں ہنسنے لگا۔ انھیں مقفل کر کے وہ مجھے میرے سیل میں لے آیا۔ شاید یہ اسی ہڑتال کا نتیجہ تھا کہ ہمیں دیگر خواتین قیدیوں کے پاس جیل میں اَجنح (بلاک) بھیج دیا گیا۔

## خواتین کے بلاک میں

سیل میں رہتے ہوئے ہم نے منیرہ کے سوا کسی قیدی خاتون کو نہ دیکھا تھا، جب میں بیت الخلا جاتی تو سیاہ لباس میں ملبوس ''الحاجہ مدیحہ'' بلند آواز میں قیدی عورتوں سے بات کرنے لگتیں یا انھیں چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے پکارنے لگتیں تاکہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ ہم تنہا نہیں بلکہ بلاک میں اور بھی قیدی خواتین موجود ہیں۔ مجھے بھی ان آوازوں سے انسیت ہو گئی اور میں طمانیت محسوس کرنے لگی کہ اس وحشت ناک مقام پر ہمارے علاوہ بھی کوئی ہے۔

آٹھ دن بعد جیلر میرے پاس آیا اور مجھے ایک سوال نامہ تھما دیا، جس میں میرا نام، گرفتاری کی تاریخ، اور اس کا سبب اور قید تنہائی (المنبر دہ) میں گزارے گئے ایام کی تفصیل طلب کی گئی تھی۔ میں نے عمومی انداز میں لکھ دیا کہ مجھ پر اخوان کی تنظیم سازی کا الزام ہے۔ تھوڑی دیر بعد حسین آ گیا، میں نے سوچا شاید تعذیب تفتیش اور الزامات کا نیا دور شروع ہونے کو ہے، اس نے مجھے ساتھ چلنے کو کہا:

کہاں؟ تفتیش کے لیے؟

بولا: نہیں۔

گرفتاری کے ایک ماہ بعد انھیں ''سجن المسلیہ حلب'' سے کفر سوسہ منتقل کر دیا گیا۔ ان کے ہمراہ امّ شیماء، بیگم عبدالعزیز شیخ، عائشہ وغیرہ تھیں۔ ان کے ہمراہ ایک اور حاجہ بھی تھی، وہ چھ ماہ کی حاملہ تھیں اور اس کی عمر محض سولہ برس تھی، سامح کیالی ہی کی مخبری پر اس کے شوہر کو گرفتار کیا گیا، اور اس سے القاعدہ کے ٹھکانے کا پتا پوچھتے رہے۔ جب اس نے اعتراف نہ کیا تو عمر حمیدہ کے حکم پر اس کی بیوی کو اٹھا لائے۔ اس کے سامنے اس سے زیادتی کی اور شوہر کو ہلاک کر دیا۔ پھر عورت کو سارے الزامات سے بری کر کے رہا کر دیا۔

الحاجہ مدیحہ امّی اور ہمیں باتوں میں لگائے رکھتیں تاکہ ہم پریشان نہ ہوں۔ اسی طرح اُمِ شیماء اور عائشہ بھی۔ منیرہ (جس نے مجھ سے سب سے پہلے تفتیش کی تھی) دیکھ کر مسکرا دیتی۔ عائشہ حلب سے تھی اور ڈاکٹر تھی۔ اس نے زخمی نوجوانوں کا علاج کیا تھا اور اسی جرم میں اسے گھر سے گرفتار کیا گیا، کیونکہ وہ ان زخمیوں کو نہیں جانتی تھی، بس اس کے پاس کچھ لوگ زخمی نوجوانوں کو لے کر آئے اور اس نے علاج کر دیا، محض انسانی ہمدردی میں۔ لیکن اس جواب نے انھیں مطمئن نہ کیا، ان کا خیال تھا کہ وہ حکومت سے برسرِ پیکار نوجوانوں کے علاج پر مامور ہے۔ اسے تحقیق کے لیے مصطفیٰ التاجر کے سامنے پیش کیا گیا، جس نے اس سے ابتدا میں پوچھا:

کیا تم بلا حجاب رہنا پسند کرو گی؟

وہ بولی: طبعاً نہیں۔

بولا: تمھارا کیا خیال ہے اگر تمھیں بغیر حجاب کے رکھا جائے؟

اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور وہ ان کی منت سماجت کرنے لگی، لیکن اس مجرم نے اس کو موقع ہی نہ دیا، اور کسی وحشی جانور کی طرح اس پر پل پڑا، اس پر تھپڑوں اور گھونسوں کی بارش کر دی، اور اس کے کپڑے پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے، اور وہ زنجیروں میں جکڑی اپنی مدافعت بھی نہ کر پائی۔ اس نے اس کے سارے کپڑے پھاڑ کر اتار دیے۔ جب صرف جرابیں باقی رہ گئیں

تو بولا:

چلوان کو چھوڑ دیتا ہوں تا کہ تمھیں سردی نہ لگ جائے۔

پھر اسے الٹا لٹکا کر مختلف طرح کے ٹارچر کا نشانہ بنایا: کوڑے اور ڈنڈے برسائے، بجلی کے کرنٹ لگائے۔ اس کی نظر کی عینک اتار لی۔ پھر عمر حمیدہ آگے بڑھا اور اس کے ہاتھ پاؤں میں ہتھکڑیاں لگا کر پیچھے کی جانب باندھ دیا، اسے کرسی پر بٹھایا، اور سگریٹ سلگا کر اس کے پوشیدہ اعضاء کو جلاتا رہا۔ اس آگ سے عائشہ کے جسم کے کئی حصے مستقل طور پر سیاہ ہو گئے تھے۔

## فنون تعذیب

امّ شیما اپنی سات ماہ کی بیٹی کے ساتھ گھر لوٹ رہی تھیں، انھیں گھر کے اطراف میں غیر معمولی نقل وحرکت کا احساس ہوا۔ وہ اوپر کے زینے پر تھیں جب انھوں نے دروازے کا قفل کھولنے کے لیے چابی لگائی تو اندر سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ انھوں نے شوہر کو بھاگ جانے کا اشارہ کیا، اسی وقت نے خفیہ والوں نے دروازہ کھول کر انھیں اندر گھسیٹ لیا، اور ان سے تفتیش شروع کر دی۔ ان کی مخبری بھی سامح کیالی نے کی تھی، انھوں نے شوہر اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں کچھ بھی بتانے سے لاعلمی ظاہر کی، تو اہل کار انھیں عزت پر حملے کی دھمکیاں دینے لگے، اور پھر عملاً انھوں نے انھیں زیادتی کا نشانہ بنانے کی کوشش کی مگر امّ شیماء اپنا بچاؤ کرتی رہیں۔ اللہ تعالی نے اہل کاروں کے دل میں ان کا رعب ڈال دیا اور ان کی عزت محفوظ رکھی۔ انھیں عمر حمیدہ کے سامنے پیش کیا گیا، جس نے ان پر تعذیب کا ہر داؤ آزمایا، انھیں چھت سے الٹا لٹکا کر قصاب کی مانند کھال ادھیڑی، وہ انھیں مارتے رہتے اور یہ لاحول ولا قوۃ پڑھتی رہتیں۔ ان کے سینے میں بجلی کے کرنٹ لگائے گئے، شدتِ الم، خوف اور توہین کے احساس سے ان کے پستان سے دودھ جاری ہو گیا۔ تحقیقات کے بعد انھیں بھی کفر السوسہ ای بلاک میں منتقل کر دیا گیا۔

## مقتول کی لاش کو سزا

فوزیہ پانچ بچوں کی ماں تھی، ان کا شوہر شہید کر دیا گیا اور حکومتی اہل کار قتل کے بعد ان کی نعش کو ایک ٹینک پر رکھ کر پورے حلب میں پھراتے رہے اور فوزیہ کو اٹھا کر جیل لے آئے جہاں انھیں شدید عذاب دیا گیا۔ اگرچہ وہ اپنے بارے میں کچھ زیادہ نہیں بتاتی تھیں، بلکہ اکثر بالکل خاموش رہتی تھیں، تاہم ان کے جسم پر تعذیب کے نشانات نظر آتے تھے۔ ان کے پاؤں نیلے ہو چکے تھے اور ان کے ناخن کھینچ کر اکھاڑے گئے تھے۔ کچھ مہینے تک ان کی یہ حالت تھی کہ وہ کسی سے بات نہ کرتیں اور جوں ہی دروازہ کھلتا یا کوئی اندر آتا وہ سر پر کمبل اوڑھ کر دیوار کی جانب منہ کر لیتی تھیں۔

ان سب خواتین پر اخوان سے تعاون یا تعلق کا الزام تھا سوائے منیرہ کے جو اشتراکی تھی (اور اشتراکی نظریات کی حامل حکومت میں بھی قید کاٹ رہی تھی)۔ منیرہ پر جیل میں کوئی خاص پابندی نہ تھی، اس کے ملاقاتی بھی آتے، سیل میں اس کے پاس ریڈیو بھی تھا۔ منیرہ اچھی انسان تھی، ہماری اس سے اشتراکیت کے موضوع پر بات بھی ہو جاتی تھی۔ وہ ہمارے دینی معاملات کا خیال رکھتی اور نماز یا تلاوت کے وقت ریڈیو کی آواز کم کر دیتی تھی۔ ہمارے کئی حقوق کی جدوجہد میں منیرہ ہمارے ساتھ شریک رہی، اور ہمارے ہمراہ ہڑتال میں بھی حصہ لیا۔

ہمارا بلاک درمیانے حجم کا کمرہ تھا، جس کے بائیں جانب بغیر دروازے کے غسل خانہ تھا، جس پر ہم نے رسی باندھ کر کمبل ڈال دیا تھا۔ اس میں گیزر بھی موجود تھا۔ اگرچہ لڑکوں کے کمروں سے متصل غسل خانے تھے نہ انھیں گرم پانی کی سہولت حاصل تھی، بلکہ اندر پانی کی ٹونٹیاں تک نہ تھیں۔ اسی وجہ سے نوجوانوں کو ہر کھانے کے بعد الخط (اجتماعی بیت الخلا) میں جانا پڑتا تھا۔ جبکہ ہمارے بلاک کا دروازہ اکثر اوقات بند ہی رہتا، بلاک میں فقط ایک کھڑکی نما سوراخ تھا، جسے دونوں اطراف سے لوہے کی سلاخیں لگا کر محفوظ بنایا گیا تھا اور اس کے

سامنے لکڑی کے تختے دھرے تھے۔ نہ اس میں سے ہوا کا گزر ہو سکتا تھا اور نہ روشنی کی شعاع کا۔ ہمیں سردیوں کی ٹھنڈک میں بھی حسرت ہوتی تھی کہ دروازہ کھلے اور صاف ہوا کا کوئی جھونکا یا روشنی کی کوئی کرن اندر داخل ہو جائے۔ ہم داروغہ یسین سے التجا کرتے کہ وہ اس طاق نما سوراخ کو کھول دے یا اس میں ایگزاسٹ فین ہی لگا دے یا دروازہ کھلا رکھے لیکن وہ صاف انکار کر دیتا۔

اس تاریک سیل میں آٹھ ماہ گزارنے کے بعد ہمیں ہفتے میں ایک دو بار باہر صحن میں نکلنے کی اجازت ملنے لگی۔۔۔ اور پنکھا لگانے کا مطالبہ ہماری گرفتاری کے دو سال بعد اس وقت پورا ہوا، جب بلاک میں نئی قیدیوں کے آنے کے بعد تل دھرنے کی جگہ بھی نہ رہی، بلکہ گھٹن کی شدت سے بعض کی اموات واقع ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔

## ہم نے قران کا نسخہ مانگ لیا

دن بڑی آہستگی اور بوریت سے گزرنے لگے۔ ہمیں لیل و نہار کی گردش کا کچھ احساس نہ رہا، ہم محض اندازے سے رات اور دن کے اوقات کا تعین کر کے نماز ادا کر لیتیں۔ دن گزرنے کا اندازہ داروغے کی تبدیلی سے ہوتا یا بلاک کے باہر روشنی کے گُل ہونے اور جلنے سے۔ ہمارے قلق و اضطراب میں اضافے کی ایک وجہ یہ تھی کہ ہمیں بات کرنے کی اجازت بھی نہ تھی۔ اہل کاروں تک ہماری آواز پہنچتے ہی وہ دروازے کو زوردار زنجیر سے بجانا شروع کر دیتا کہ ہم اپنی آواز بند کر لیں اور سرگوشی میں بات کریں۔ دو ہفتے بعد میری امی نے طے کیا کہ ہم بلاک کی اس پر رعب اور خوف ناک فضا کو اپنے انداز میں بدلنے کی کوشش کریں گے۔ سو انھوں نے آہستگی سے دروازہ بجایا اور حسین سے درخواست کی کہ وہ ہمیں ایک مصحف قرآنی لا دے۔

وہ حیرت سے بولا:

کیا تم سمجھ رہی ہو کہ تم اپنے گھر میں بیٹھی ہو یا محل میں اور جو چاہو حاضر کرنے کا حکم دے

رہی ہو! کیا تمھیں نہیں معلوم کہ یہاں مصحف فراہم کرنا ممنوع ہے؟ انھوں نے اسی نرمی سے پوچھا کیوں؟ وہ چالاکی سے بولا کیونکہ یہاں قرآن پاک نہیں ہوتے۔

وہ بولیں میں نے اپنی آنکھوں سے کمرۂ تفتیش میں کچھ نسخے دیکھے ہیں۔

غالباً وہ ان لڑکوں کے تھے جنھیں وہ سال نو کی تقریب سے پہلے مسجد سے پکڑ کر لائے تھے اور اُن کے ہمراہ جیبی سائز کے مصحف قرآنی بھی تھے جو اُن سے چھین لیے گئے تھے۔ وہ بڑے تکبر سے بولا:

لیکن وہ مصحف جلانے کے لیے ہیں، نہ کے پڑھنے کے لیے۔ (نعوذ باللہ)

وہ منت کر کے کہنے لگیں:

ہمیں ان میں سے صرف ایک دے دو، کسی کو پتا بھی نہ چلے گا اور نہ ہی کوئی تم سے اس بارے میں احتساب کرے گا۔ اگر کوئی جیبی نسخہ ہی ہو جائے تو ٹھیک ہے۔

اس نے ''ممنوع'' کہہ کر دروازہ دھڑ سے بند دیا۔

انھوں نے دوبارہ دروازہ کھٹکھٹایا تو ایک اہل کار جس کا نام ابراہیم تھا آ گیا۔ اُنھوں نے اس سے بھی وہی سوال کیا۔ اس کا جواب پہلے سے مختلف نہ تھا، یعنی:

ممنوع۔۔۔ مصحف قرآنی کی یہاں اجازت نہیں۔

اُنھوں نے قلم اور ورق مانگا تا کہ وہ اپنا مطالبہ تحریری طور پر پیش کریں۔

وہ بولا ہمارے پاس ورق بھی نہیں۔ بڑی منتوں کے بعد اس نے کاغذ فراہم کیا۔ پھر جب وہ درخواست لے کر جا رہا تھا تو بولا:

آپ کو قرآن کیوں چاہیے؟ تا کہ آپ اسے پڑھ پڑھ کر ہمیں بد دعائیں دیتی رہیں!

امی نے ہار نہ مانی اور کھانے کی ہڑتال کر دی۔ ہم سب بھی ان کے ساتھ ہڑتال میں شریک ہو گئے، غصے میں آ کر اُنھوں نے ہمارا پانی بھی کاٹ دیا۔

اگلے روز پھر امی نے ایک کاغذ لے کر قرآن کا مطالبہ دہرایا۔ اس درخواست کے بعد جیلر ابوعصام آیا اور مطالبہ کرنے کی وجہ پوچھی۔ امی نے بتایا کہ ہمارا دل بہت خفا ہے اور ہم قرآن سے سکون حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ وہ کہنے لگا: آپ دوسری چیزوں میں کیوں دل نہیں لگا لیتیں۔

وہ بولیں: مثلاً کیسے؟

بولا: جیسے نوجوان کا مشغلہ ہے۔۔ وہ آٹے سے دل بہلا لیتے ہیں۔

وہ بولیں: ٹھیک ہے۔ ہمیں بھی سکھا دیجیے۔

وہ بولا: اچھا۔ میں ان سے تکنیک پوچھ کر آپ کو بتاؤں گا۔

ابھی ایک گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا جب وہ ایک پرانا مگر بہت بڑا اور اچھی کتابت وطباعت والا قرآن کا نسخہ لے آیا۔ ہم نے اسے پاروں میں تقسیم کرکے بانٹ لیا اور ہمارے پاس جو ذاتی سامان کے کنستر تھے ان میں محفوظ کرلیا۔ ہم اس کی تلاوت کرنے لگیں اور حفظ کرنا شروع کردیا۔ ایک اہل کار نے جیلر کے حکم سے آکر ہمیں آٹے سے کھیلنا بھی سکھا دیا۔

## فراغت کے مشغلے

نوجوان قیدی روٹی کا پکا ہوا حصہ جس قدر کھا سکتے کھا لیتے اور باقی لی ادھ پکی روٹیوں کو اکٹھا کرلیتے اور اپنے لعاب سے اسے خمیر دے کر اس سے مختلف اشکال، مجسمے اور تسبیح کے دانے بنا لیتے، یہی ان کے فارغ وقت کی مشغولیت تھی۔ ایسا ہی ایک مجسمہ رئیس الفرع نے اپنے دفتر میں آویزاں کر رکھا تھا، میں ابتدا میں اسے چاندی کا مجسمہ سمجھی تھی، کیوں کہ جب وہ خشک ہوجاتے تو اہل کاران نوجوانوں کو مختلف رنگ فراہم کرتے۔ اس سے وہ بے حد خوب صورت اشیا میں ڈھال لیتے، پھر اہل کاران سے باصرار لے لیتے تھے۔ یہ نئی تکنیک سیکھنے سے ہماری زندگی میں بھی دلچسپی کا عنصر داخل ہوگیا اور ہم نے اپنی بنائی ہوئی چیزوں کو رنگنے کے لیے چائے کی فالتو پتی

استعمال کرنے کا تجربہ کیا۔ اسی طرح بچی کھچی دوائیں بھی رنگ سازی کی اس صنعت میں کام آنے لگیں۔ میری امی نے یہاں پر کئی کھیل متعارف کروائے، اُنھوں نے ہمیں ''لعبۃ الکاس'' سکھائی، (یہ پارسل گیم سے مشابہ تھی) گلاس باری باری سب کے پاس جاتا اور جہاں اسے روک دیا جاتا، اس خاتون کو تیزی سے پوچھے گئے سوال کا جواب دینا ہوتا تھا۔ الحاجہ مدیحہ اس کھیل میں شامل نہ ہوتی تھیں بلکہ وہ ہمارا بھی مذاق اڑاتی رہتی تھیں۔ جیل کی اعصاب شکن زندگی میں ہم نے ایک نظام الاوقات ترتیب دے لیا جس کے مطابق تلاوت قرآن کریم، حفظ قرآن، دعاؤں، اذکار و وظائف اور تہجد کے لیے اوقات مقرر کر دیے گئے۔ خواتین کی باہم مقابلہ بازی ہوتی کہ کون قرآن کا زیادہ حصہ نمازِ تہجد میں تلاوت کرتی ہے۔ نمازِ فجر ادا کرنے کے بعد مل کر دعائیں یاد کرتے۔ روشنی گل ہوتی اس کے باوجود ہم چالیس مرتبہ سورہ یٰسین پڑھتے اور رہائی اور معاملات میں آسانی کے لیے قرآن کا کچھ حصہ تلاوت کرتے۔ اسی معمول کا اعادہ شام کے اوقات میں کیا جاتا۔ میں دن کو بھی ماجدہ کو حفظ سناتی رہتی، جب تک کہ مجھے نیند نہ آجاتی اور کبھی تو سارا دن ہی بغیر سوئے گزر جاتا۔ امی بھی صبح سے ظہر تک بیدار رہتیں اور بعد نمازِ ظہر کچھ دیر سو جاتیں۔

## دیوار سے پرے باتیں

ہماری کسی قدر دلچسپی اپنے بلاک کی دیواروں کی دوسری جانب تھی، جب نوجوان کو ''الخط'' میں لے جایا جاتا تو ہمارے کان کھڑے ہو جاتے، کبھی دروازے کی درز سے ہم ان میں اپنے بھائیوں، کزنز یا قریبی رشتے داروں کو تلاش کرتے۔ نوجوانوں اور ہمارے بیچ یہی واحد تعلق نہ تھا، ہمارے آنے سے قبل ان میں ایک اور ہمدری کا تعلق پیدا ہو چکا تھا۔ جب خواتین نے اہل کاروں سے بیت الخلا کی ضرورت کے لیے پائپ کا ایک ٹکڑا منگوایا اور اسے بیت الخلا کے سوراخ سے ان کی جانب گزار دیا۔ اس سے بیت الخلا میں ان کو پانی ملنے لگا۔ تاہم کچھ ہی عرصے بعد ہمارے بلاک میں قید ایک عراقی جاسوسہ نے کسی تلخی کی بنا پر ہمارا پول کھول دیا۔

اس پر انتظامیہ نے اس سوراخ کو سیمنٹ لگا کر مکمل طور پر بند کر دیا لیکن جب سب سو جاتے تو الحاجہ مدیحہ پھر بھی ٹونٹی پر ہاتھ مار کر ان سے کوئی بات کر ہی لیتی تھیں۔ حالانکہ اس میں بھی پکڑے جانے کا اندیشہ ہمیشہ رہتا تھا۔ ان دنوں نوجوانوں پر بہت سختی ہو رہی تھی اور کوئی معمولی سا واقعہ بھی انھیں ہلاکت تک پہنچا دیتا تھا۔ ہر روز کتنے ہی نوجوان سزائے بے گناہی کاٹتے ہوئے موت کے منہ میں بھیج دیے جاتے تھے۔ انتظامیہ کا ذمہ دار شخص جس کا نام ابو طلال تھا ہر روز نماز فجر سے پہلے آ کر بلاک کا دروازہ بجاتا، مطلوب افراد کو اپنے ہاتھوں سے ہتھکڑیاں لگاتا پھر ایک ایک کا نام پکار کر گنتی پوری کرتا تھا۔ ہر روز یہ فہرست بیس یا تیس افراد پر مشتمل ہوتی۔ اسی اندھیرے میں دو دو نوجوان کو ایک زنجیر ہاتھ اور پاؤں میں ڈال کر جکڑا جاتا۔ کچھ کو مار مار کر چلایا جاتا کچھ کے آسمان کا سینہ چیرتے نالہ و شیون ہمارے کانوں کے پردوں سے ٹکراتے تھے۔ کچھ کو جب آخری وقت ہونے کا احساس ہوتا تو وہ غم سے بے ہوش ہو جاتے۔ وہ انھیں زمین پر گھسیٹتے ہوئے گاڑی کی جانب لے جاتے جو پہلے ہی ان ذبیحوں کے انتظار میں کھڑی ہوتی۔ یہ گاڑی انھیں لے کر فراٹے بھرتی ہوئی قتل گاہوں میں پہنچا دیتی۔ کچھ تو نوجوان یہ خبر سن کر ہی یا اس کے ہول ہی سے بے ہوش ہو جاتے تھے۔

ہر روز یہ آہ و بکا اور گریہ وزاری ہماری سماعتوں سے ٹکراتی تو ہماری ہمت جواب دے جاتی اور جب پہلی کھیپ مقتل میں پہنچائی جاتی تو ان کی جگہ لینے سے اس سے بھی تین چار گنا زیادہ قیدی یہاں لائے جاتے۔ ان دنوں سارے بلاک اور قید خانے قیدی نوجوانوں سے پٹ گئے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات غسل خانوں میں بھی قیدی ٹھہرائے جانے لگے۔

## ماں کی حسرت اور بیٹے کا انجام

جیل میں عجیب واقعہ پیش آیا۔ امی نے مجھے بتایا تھا کہ میرا بھائی ''وارف الدباغ'' شام سے ہجرت کر کے لبنان جا رہا ہے اور وہاں سے وہ کسی دوسرے ملک سکونت اختیار کرنا چاہتا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ اس نے یہ بات ابھی سے اس لیے کہی تھی تا کہ وہ اس کے بارے میں پریشان ہونا چھوڑ دیں۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ ابھی تک شام میں ہی تھا۔ ایک روز امی تہجد اور فجر کی نماز کے بعد سورج چڑھنے کے انتظار میں بیٹھ گئیں اور ٹیک لگائے وہیں سو گئیں۔ اچانک وہ نیند سے بیدار ہو کر کہنے لگیں:

میں نے جیل میں تمھارے بھائی وارف کے قدموں کی چاپ سنی ہے۔

جیل میں اس وقت مکمل خاموشی تھی اور نوجوان الخط سے لوٹ رہے تھے۔ اہل کاروں کی زیادہ تعداد سو رہی تھی۔ مجھے کوئی آہٹ سنائی نہ دی۔۔۔ میں نے ان سے کہا:

آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ یہاں کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی۔۔

میں نے یقین کرنے کے لیے طاق کے سوراخ سے باہر جھانکا تو میں کانپ اٹھی۔ میں نے اس کی جیکٹ پہچان لی، اہل کار اسے جیکٹ سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے لے جا رہے تھے۔ اُنھوں نے اِس کی آنکھوں پر پٹی باندھی ہوئی تھی اور ہاتھ پشت پر باندھ کر ہتھکڑی لگا رکھی تھی۔ اس نے وہی سفید جوگرز پہن رکھے تھے اور حسین اسے ہانکتے ہوئے کہہ رہا تھا:

ادھر قید تنہائی کے سیل میں آ جاؤ۔

میں کسی اور ہی عالم میں پہنچ گئی تھی، میں نے چکراتے سر کو قابو کرتے ہوئے امی سے بمشکل یہی کہا:

ادھر تو کوئی نہیں۔

لیکن میرے دل میں کسی نے انگارے بھر دیے تھے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں چیخیں مار کر روؤں اور کسی سے یہ دکھ بیان کروں، لیکن امی کی موجودگی میں ایسا ممکن نہیں تھا اور کچھ عرصے بعد ہم نے دوسری ہڑتال کی اور اہل کار نے ہمیں سزا کے طور پر قید تنہائی کے سیلوں میں بند کر دیا تو یہ محض اتفاق تھا کہ مجھے اُم شیما اور امی کو ایک ہی جگہ رکھا گیا اور یہ وہی سیل تھا جس

میں وارف کو قید رکھا گیا تھا۔امی نے داروغہ کو بلانے کے لیے دیوار پر دستک دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اچانک ان کی نظر اس پر کھود کر بنائی گئی مسجد کی تصویر پر پڑ گئی، اس کے نیچے لکھا گیا۔

لا الہ اللہ واللہ اکبر وللہ الحمد۔۔الشہید محمد وارف دباغ۔امی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں اور انھیں بلند آواز سے پکار کر پوچھنے لگیں کہ اُنہیں بتائیں کہ اُن کا بیٹا کہاں ہے اور اسے کب گرفتار کیا گیا ہے۔لیکن اُنہیں کسی نے جواب نہ دیا......وہ اسی عذاب میں سلگتی رہیں لیکن کوئی جواب دینے والا نہ تھا۔ہمیں بعد میں خبر ہوئی کہ اُنھوں نے وارف اور اُس کے دوست غسان کو پہلے حمات میں گرفتار کیا ،لیکن کوئی ثبوت نہ پا کر چھوڑ دیا۔پھر وارف کو دوبارہ پکڑ لیا اور کفر السوسہ جیل میں لے آئے۔اگرچہ وہ اس بار بھی کچھ ثابت نہ کر سکے،لیکن اس کو شہید کر دیا۔اس سلسلے میں اعلیٰ افسر نے ماجدہ کو بتایا:

ہم نے پہلے اسے مجرم سمجھ کر پکڑا تھا لیکن وہ بے گناہ نکلا،سو ہم نے اسے رہا کر دیا۔ دوسری بار ہم نے اسے بے گناہ سمجھتے ہوئے پکڑا لیکن وہ مجرم ثابت ہوا اور اپنے کیے کی سزا پائی۔ لیکن یہ اللہ کی قدرت ہے کہ اس کو شہید کرنے والا شخص خود بھی کچھ عرصے بعد قتل ہو گیا۔

## سونے کے لیے آدھا کمبل

جیل کے مصائب و آلام بڑھتے رہے۔کچھ عرصے بعد میری کمر میں شدید درد ہو گیا حتیٰ کہ میں اٹھنے کے قابل بھی نہ رہی۔اس کے ساتھ ساتھ مسلسل اسہال اور قے کی شکایت بھی ہو گئی۔حتیٰ کہ ایک روز میں واقعی موت کے منہ میں جاتے جاتے بچی۔اس وقت میرا بستر مرکزی گیزر کے پائپ کے قریب تھا جو خراب ہو چکا تھا اور اب اس سے ٹھنڈک اور سیلن ہی میں اضافہ ہوتا تھا۔ بلاک میں قیدیوں کی تعداد اب اس قدر بڑھ چکی تھی کہ اپنے لیے جگہ کا انتخاب ممکن نہ رہا تھا، بلکہ اب تو سوتے ہوئے بھی آدھا کمبل نصیب ہوتا اور اگر ایک خاتون کروٹ لینا چاہتی تو پورے بلاک کی خواتین کو حرکت دینی پڑتی۔شروع میں تو مجھے سردی کا کچھ

زیادہ احساس نہ ہوا لیکن اچانک مجھے کمر میں اتنا شدید درد ہوا کہ میں اپنے جسم کو حرکت دینے پر قادر نہ رہی۔ سب لڑکیاں مجھے تکلیف میں دیکھ کر گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور اُنھوں نے زور زور سے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا، تاکہ میرے لیے ڈاکٹر کو بلوایا جاسکے، لیکن کسی اہل کار کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ یہ صورت حال دیکھ کر ڈاکٹر عائشہ نے اُن سے پلاسٹک کا ایک طشت منگوایا، جو اُنھوں نے بڑی منت ساجت کے بعد فراہم کر دیا، وہ مجھے گرم پانی سے مساج کرتی رہیں اور الحمدللہ دو دن کی مشقت کے بعد میں کچھ بہتر ہوئی۔

## پھر ہڑتال

دن یوں ہی گزرتے رہے، ہر روز کوئی نیا واقعہ رونما ہوتا یا نیا قصہ جنم پاتا۔ امی نہ تو خود آرام کرتیں اور نہ ہمیں اور داروغوں اور اہل کاروں کو آرام کرنے دیتیں۔ اُن کی واضح سیاست تھی کہ اپنے مطالبات اُن کے سامنے پیش کرتے رہو، ہوسکتا ہے کہ ان میں سے ایک دو منظور ہو ہی جائیں۔ ایک دو روز اُنھوں نے منیزہ (اشتراکی قیدی) کو ثانویہ میں امتحان کی تیاری کرتے دیکھا تو اُنھوں نے بلاک میں یونیورسٹی کی طالبات قیدیوں کو اپنے لیے یہی مطالبہ پیش کرنے کو ورغلایا۔ ظاہر ہے یہ مطالبہ استہزاء اور اہانت کے ساتھ رد کر دیا گیا۔ ام شیما نے تجویز دی کہ ہم مطالبے کے قبول ہونے تک بھوک ہڑتال کر دیتے ہیں۔ ہم سب کو یہ تجویز بہت پسند آئی اور یوں جب رات کا کھانا آیا تو ہم نے لینے سے انکار کر دیا۔ اہل کاروں نے پوچھا: کیوں؟

ہم یک زبان بولے: ہڑتال۔

وجہ؟

ہم نے جواب دیا: ہم اپنا سلسلہ تعلیم جاری رکھنا چاہتے ہیں۔

اہل کار ابراہیم بولا: اگر کھانا وصول نہیں کرو گی تو ہم تمھیں قید تنہائی کے سیلوں میں لے جائیں گے۔

امی نے سکون سے جواب دیا: یہ زیادہ بہتر ہوگا۔ کم از کم ہر ایک کو سانس لینے کی جگہ تو ملے گی۔

ابراہیم نے دھڑ سے دروازہ بند کر دیا، مگر تھوڑی دیر بعد ہی پیلے دانتوں کے ساتھ ہی ہی کرتا واپس آ گیا اور آتے ہی کہنے لگا:

سر (رئیس فرع) کہہ رہا ہے کہ آدھ گھنٹے کے اندر قید تنہائی میں جانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ یوں ہمیں منفردات (قید تنہائی کے سیلوں) میں منتقل کر دیا گیا۔ اُنھوں نے امی اور ام تسیما کو ایک سیل میں، ماجدہ اور عائشہ کو دوسرے اور مجھے اور فوزیہ کو تیسرے میں بند کر دیا اور پھر وہ الحاجہ مدیحہ کی جانب دیکھ کر مزاحیہ انداز میں کہنے لگا:

اور تمھارا کیا ارادہ ہے؟ کیا تم بھی ثانویہ کا امتحان نہیں دینا چاہتی؟

وہ بولیں: ہائے باپ۔۔۔ میں تو پڑھنا لکھنا تک نہیں جانتی۔

سو اُنہیں بلاک میں ہی چھوڑ دیا گیا۔ اور ہمیں وہاں چند گھنٹے ہی ہوئے تھے کہ جب امی نے ایک دیوار پر وارف بھائی کے نام کے ساتھ شہید لکھا دیکھ لیا اور ان کی حالت بری ہو گئی۔ وہ رات گئے وہ ہمیں بلاک میں لے آئے اور ہماری درخواست کا کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن اس سارے خوف اور ڈر کی فضا کے باوجود ہم اپنے اس عمل سے مطمئن تھے۔

## رات گئے فائرنگ

اس روز ہم کھانا کھا چکے تھے اور اکثر قیدی سو چکے تھے جب اچانک جیل میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ نے ہمیں سہا کر رکھ دیا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ گولیاں ہمارے سروں کے اوپر سے سنسناتی ہوئی گزر رہی ہیں۔ جیل میں مکمل اندھیرا چھا چکا تھا اور اہل کاروں کے بھاگنے اور بے دریغ اسلحہ استعمال کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سیلوں کی کھڑکیاں اور طاق بھی بند کر دیے گئے تھے، گولیاں کے ساتھ ایک ہی تیز آواز سنائی دیتی: خبردار حرکت نہ کرنا۔

ایسا لگ رہا تھا کہ کچھ گولیاں ہمارے بلاک کی بیرونی دیواروں سے ٹکرا رہی ہیں۔ امی اٹھیں اور وضو کر کے صلوۃ شہادت پڑھنا شروع کر دی۔ پھر انھوں نے ہمیں دیوار سے پرے کر دیا مبادا ہمیں کچھ نہ ہو جائے اور شور میں ایک مضطرب آواز گونجی: فلاں قتل ہو گیا... آہ...... ہمیں اندازہ ہو گیا کہ وہ دروازے کی حفاظت پر مامور چوکیدار تھا اور پھر آہستہ آہستہ سکون ہو گیا۔ اندر سے ایک حاجہ نے ابراہیم سے پوچھا:

کیا ہوا تھا؟

اس نے ڈانٹ کر اسے خاموش کرا دیا اور یوں ہم اس معاملے کے بارے میں کچھ نہ جان سکے۔

## رہائی۔۔۔مگر زندگی سے

ایک روز ساتھ والے سیل سے کسی نے الحاجہ کو سرگوشی کی: خالہ آپ میں کوئی حمات کی قیدی ہیں؟ ان سے کہیے ہم کل رہا ہو رہے ہیں۔ اگر ان کے گھر کوئی خط پہنچانا ہو تو ہم دے دیں گے۔ آپ اسے طاق میں رکھ دیں ہم نظر بچا کر اٹھا لیں گے۔

بعد میں معلوم ہوا کہ ان نوجوانوں سے رہائی کا وعدہ کیا گیا تھا، مگر انھیں شہید کر دیا گیا۔

## مزید مہمان

چند دن نہ گزرے تھے کہ ایک مرتبہ پھر دروازہ کھلا اور ابو عادل چلا کر بولا: اٹھو اور استقبال کرو۔

اندر داخل ہونے والی خواتین کے لباس بوسیدہ اور خستہ حال تھے، وہ نوکرانیاں لگ رہی تھیں اندر داخل ہونے والی ایک خاتون پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ الحاجہ مدیحہ نے بھیگی آنکھوں سے ان کے آنسو پونچھے:

الحاجہ ریاض! اللہ آپ کو خیر و عافیت سے رکھے۔ آخر کار میری سہیلی اس جگہ بھی میرا درد

بانٹنے آ ہی گئی۔

الحاجہ مدیحہ نے بے تکلفی سے ساتھ بیٹھی لڑکی کو اٹھا کر الحاجہ ریاض کے لیے اپنے پہلو میں جگہ بنائی اور انھیں بڑی محبت سے اس طرح اپنے ساتھ چپکا لیا جیسے اب کبھی جدا نہ ہوں گی۔ باقی قیدی خواتین خوف کی فطری فضا میں ہماری جانب لپکیں، مگر ابھی چین سے کچھ وقت بھی نہ گزرا تھا کہ تلخ حقائق کی پٹاریاں کھل گئیں۔ نئے مہمانوں کے لیے بلاک کا دامن تنگ پڑ گیا اور آنے والے دنوں میں کتنی ہی دشواریوں میں اضافہ ہو گیا۔

## آہنی دروازہ

اس مرتبہ سجن المسلیہ حلب سے پانچ خواتین کو یہاں منتقل کیا گیا تھا: الحاجہ ریاض لمی رغداء، غنیمی اور ایمان ...... اور ان کا کفر السوسہ منتقل کیا جانا ان کی گرفتاری اور تعذیب سے کم مذاق نہیں تھا۔ انھیں سجن المسلیہ حلب سے یہ کہہ کر نکالا گیا کہ انھیں رہا کیا جا رہا ہے۔ دو دو خواتین کو ایک ہتھکڑی میں جکڑ دیا گیا، ان کے ہمراہ سولہ قیدی خواتین کو رہائی مل بھی گئی، لیکن ان پانچ کو موصل کے راستے دمشق پہنچا دیا گیا۔ گاڑی حلب کے راؤنڈ اباؤٹ پر پہنچی تو الحاجہ ریاض نے نرمی سے ڈرائیور سے کہا:

- میرا گھر آہنی دروازے کے قریب ہی ہے۔ شاید آپ راستہ بھول گئے ہیں!

وہ انتہائی تمسخرانہ انداز میں کہنے لگا: نہیں، فکر نہ کرو۔ ابھی ہم آہنی دروزے تک نہیں پہنچے۔ میں ذرا حلب کا ایک چکر لگا لوں پھر تم سب کو آہنی دروازے پر ہی اتاروں گا۔

الحاجہ اس کی مراد سمجھ گئیں اور غم سے بے ہوش ہو گئیں۔ لمی کا چہرہ پیلا پڑ گیا انھوں نے سوچا کہ شاید انھیں سزائے موت پر عمل درآمد کے لیے لے جایا جا رہا ہے۔ اہل کار ان کی بگڑتی حالت سے سارا راستہ مزا لیتے رہے اور ان بے چاریوں کا اضطراب اور خوف روز افزوں ہوتا رہا اور ہم تک پہنچتے پہنچتے ان کی حالت بگڑ چکی تھی، لیکن یہاں پہنچ کر انھوں نے قدرے سکون کا

جو رقم عمان سے لائی تھیں اس کا کچھ حصہ منتہی کو بھی دیا گیا تھا۔ جب تعذیب نا قابلِ برداشت ہو گئی تو الحاجہ نے انھیں منتہی کے بارے میں بھی بتا دیا، وہ فوراً ہی ان کو گرفتار کرنے جا پہنچے اور بڑی بیدردی ان کی شیر خوار بچی کو ان سے چھین سے کر پرے پھینکا اور انھیں دبوچ کر خفیہ کے دفتر لے گئے۔ بدقسمتی سے ان کے بارے میں مزید انکشاف ہو گیا کہ مصطفیٰ قصار نے انھیں پیغام نکاح بھجوایا ہے، سو ان کی تعذیب دو چند ہو گئی۔ انھیں برہنہ کر کے چھت سے الٹا لٹکا دیا گیا اور ہر طرح کا تشدد آزمایا جانے لگا۔ انھوں نے بڑی سادگی سے کہا کہ مجھے نکاح کا پیغام تو ملا ہے مگر میں نے آمادگی ظاہر نہیں کی، البتہ انھوں نے رقم وصول کرنے کا اعتراف کر لیا جس کی مالیت چار سو لیرے سے زیادہ نہ تھی اور یہ رقم میری بیٹی کو تحفۃً دی گئی تھی۔ اس پر نہ ماں کا حق تھا نہ کسی اور کا۔ منتہی کا قصور شاید بہت بڑا تھا کہ تحقیقات اور رسوا کن تشدد کے بعد انھیں سجن المسلیہ اور وہاں سے کفر السوسہ منتقل کر دیا گیا۔

ان کے ہمراہ آنے والی ایک اور حلبی دوشیزہ ایمان تھی جو آٹھویں یا نویں جماعت کی طالبہ تھی، اس پر فقط اتنی ہی تہمت تھی کہ اس نے اپنے بھائی مصطفیٰ کا پیغام نکاح منتہی کو دیا تھا۔ اسی بنا پر دوران تحقیق نہ تو اس پر تشدد کیا گیا نہ اسے دوسری خواتین کی مانند بے لباس کیا گیا اور اللہ کا شکر کہ اسے جلد ہی رہا کر دیا گیا۔ یعنی ۱۹۸۴ء میں اُم شیما کے ہمراہ۔

باقی دونوں قیدیوں رغداء اور لمی کو بیروت سے اس وقت گرفتار کیا گیا جب وہ تنظیم کے مرکز اخوان مسلون میں تنظیم میں شمولیت کے ارادے سے گئی تھیں، لیکن جس کارکن نے انھیں وہاں بلایا تھا وہ اس سے قبل ہی گرفتار ہو چکا تھا۔ چونکہ انھوں نے ابھی نویں جماعت پاس کی تھی، اس بنا پر دوران تحقیق ان پر تشدد نہ کیا گیا۔ لمی نے بتایا کہ وہاں پر اس کے زخمی چچا زاد کو لایا گیا جس کی آنکھوں سے خون بہہ رہا تھا۔ انھیں تحقیقات کے لیے جب کفر السوسہ لے جایا گیا تو وہ بری طرح روتی ہوئی واپس آئیں۔ الحاجہ نے پیار سے سبب پوچھا تو وہ جلے دل سے بھڑک کر بولی:

انھوں نے مجھے بازو سے پکڑ کر گھسیٹا اور میرے باپ کو گالی دی۔

اس کے نزدیک شاید یہی انتہائی اہانت تھی اور اس سے بڑھ کر عذاب کا وہ تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔

## حزب ہرموشیہ

جیل میں عذاب کی کتنی ہی صورتیں اور رنگ ہوتے ہیں...... تھپڑوں کی بارش، ڈنڈوں کی بوچھاڑ اور گالی گلوچ کا طوفان اس کے محض چند انداز ہیں۔ اس کی ایک صورت یہ تھی کہ قید خانے کی کوٹھڑیوں کو قیدیوں سے اس طرح بھر دیا جائے کہ ہلنا جلنا اور سانس لینا بھی دشوار ہو جائے۔ کبھی کبھار ان کی عادات اور انداز و اطوار کے اختلافات کھل کر سامنے آجاتے لیکن ان کی مجبوری تھی کہ انھیں اکٹھا رہنا تھا۔ ہمارے پاس گاؤں کی ایک خاتون اسلحے کی تجارت کے الزام میں لائی گئی۔ ہم نے جوں ہی اسے نظر اٹھا کر دیکھا، وہ بلا جھجک کہنے لگی:

"آنکھیں پھاڑے کیا دیکھ رہی ہو۔ اپنی بدشکل صورت دیکھو"

اس کا نام ام جبیری تھا، سڈول جسم، اونچا لمبا قد؛ چوڑے کندھے، لیکن وہ انتہائی اجڈ خاتون تھی اور اس پر مستزاد یہ کہ انتہائی گندی بھی۔ صفائی کے معنی سے ناآشنا اور سمجھ بوجھ سے بعد المشرقین پر۔ وہ نہ اپنے بدن کی صفائی کا خیال رکھتی نہ جگہ کی، بیت الخلا میں جاتی تو وہ کسی اور کے استعمال کے قابل نہ رہتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر جانب جوئیں پھیل گئیں، سب سے برا حال منیرہ کا تھا جو اس کے پہلو میں سوتی تھی اور اب کھجا کھجا کر بے بس ہو رہی تھی، الحاجہ مدیحہ نے بتایا کہ ایک دوا ان کے علم میں ہے۔

حسین کو بلا کر اس کی منتیں کر کے دوا منگوائی گئی۔ دوا ختم ہو گئی مگر مسئلہ ہنوز باقی تھا۔ ان کا خاتمہ تبھی ہوا جب اس وقت کے رئیس وزرا محمود زعبی کی سفارش سے ام جبیری دو ماہ کی قید کے بعد رہا ہوئی، جب نہ صرف ہم اس سے عاجز آچکے تھے بلکہ اہل کاروں کو بھی اس کا نام سنتے ہی

جنون لاحق ہو جاتا تھا۔ خفیہ والوں کا خیال تھا کہ اس کی اسلحے کی تجارت کے پیچھے کوئی سیاسی ہاتھ ہے، وہ اس سے کرید کر پوچھتے:

تم کس حزب سے ہو؟

تو وہ برجستہ جواب دیتی: حزب ہر موشیہ سے۔

اس کی مراد اس قصبے سے تھی جہاں سے وہ آئی تھی۔ وہ اسے جھوٹا سمجھ کر پھر تعذیب شروع کر دیتے اور اس غریب کو سمجھ بھی نہ آتی کہ آخر اس نے ایسا کیا کہہ دیا ہے جو تفتیش کار اتنا غضب ناک ہو رہے ہیں۔

## ہماری موت کا جشن

ام جبیری کے بعد ہمیں جیل میں ایک ایسی ہی قیدی کے ہاتھوں ایسے مصائب اٹھانے پڑے کہ جن سے یہ ابتلا بہت ہلکی محسوس ہوئی۔ یہ ایک کینہ پرور کمیونسٹ تھی۔ دمشق میں ۱۹۸۱ء کے اواخر میں جب باپردہ طالبات کے خلاف کارروائی شروع ہوئی تو دوسری طالبات کے ہمراہ یہ بھی گرفتار ہوئی۔ یہ میرے بھائی کی کلاس فیلو تھی اور اس کا نام فادیا لاذقانی تھا۔ وہ اخوانی بن کر طلبہ میں حکومت کے خلاف پوسٹر تقسیم کرتی تا کہ اخوان پر مصائب میں اضافہ ہو، یہاں بھی اس نے جلد ہی رئیس فرع سے ہماری مخبری شروع کر دی۔ اسے اپنے کمیونسٹ ہونے پر فخر تھا اور خود کو بہت بڑی چیز سمجھتی تھی۔ ہمارے درمیان کئی بار بحث بھی چھڑ جاتی، مگر ہمیشہ ہی بے نتیجہ رہتی، اس کے باوجود ہم اس سے بھلا معاملہ کرنے کی کوشش کرتے، لیکن وہ جان بوجھ کر ہمیں تنگ کرتی اور ہمیں پریشان کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھی۔ اسے بھی منیرہ کی طرح ریڈیو رکھنے کی اجازت مل گئی۔ ہم جوں ہی نماز کی نیت کرتے یا تلاوتِ قرآن شروع کرتے وہ فوراً ریڈیو کا والیم فل کر دیتی اور فلمی گیت اور گانے ہمارے کانوں کے پردے پھاڑتے رہتے۔ وہ مزے سے کانوں پر ہیڈ فون لگا کر بیٹھ جاتی اور کتنی ہی بار کی عرضداشت

اور التماس کے باوجود اس کا رویہ تبدیل نہ ہوا اور جس دن میرے گھر والوں کو شہید کیا گیا تو فادیا کو متعلقہ افسر سے اس کی خبر مل گئی۔ وہ اندر آئی تو اس کی خوشی دیدنی تھی بلکہ اس نے بلاک کی زمین پر ہی خوشی سے قلابازیاں لگانی شروع کر دیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ جشن منا رہی ہے یا خوشی سے پاگل ہو گئی ہے۔ ہم نے اس سے اس قدر خوشی کا سبب پوچھا تو کہنے لگی:

"انھوں نے مجھے ٹیپ ریکارڈر کی اجازت دے دی ہے۔"

تاہم ذہن نے تسلیم نہ کیا کہ یہی سبب ہے؛ کیونکہ کافی عرصے سے اس کے پاس ریڈیو موجود تھا اور ان دونوں میں اتنا بڑا فرق نہیں تھا کہ اس کی یوں خوشی منائی جائے۔ کچھ دیر بعد الحاجہ اسے الگ لے گئیں۔ اسے یہ بیان کرتے ہوئے ذرا بھی حیا نہ آئی کہ اس نے آج حماس کے واقعات میں اعلیٰ افسر سے میرے گھر والوں کی شہادت کی خبر سن لی ہے اور یہی اس کی خوشی کا سبب ہے۔ وہ ریڈیو پر بھی بڑے اہتمام سے خبریں سنتی رہی مگر اس نے ہمیں ایک لفظ تک بتانا گوارا نہ کیا۔ اس رات وہ بہت دیر تک ریڈیو سے کان لگائے بیٹھی رہی۔ ہمیں کچھ معلوم نہ تھا کہ باہر کی دُنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ جب ہمیں قطنا جیل میں منتقل کیا گیا تو فادیا کو کفر السوسہ سے ہی رہا کر دیا گیا اور وہ تکمیل تدریس کے لیے فرانس چلی گئی، جب چھٹیوں میں وہ گھر آئی تو ہمیں چڑانے کے لیے قطنا بھی چلی آئی، تاکہ ہم اس کے اور اپنے حال کا موازنہ کر کے کڑھ سکیں۔

## تجسس کا ڈرامہ

ایک بار وہ ایک فلسطینی خاتون کو قید تنہائی میں لے آئے اور اس کے ذریعے ہم سے ایک نیا کھیل کھیلا۔ ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ وہ بھی فادیا کی مانند مخبرہ تھی جس نے اپنے طریقے سے یہ کام انجام دیا۔ شروع میں فادیا نے بتایا کہ اس کے لیے اس کی خدمات بطورِ خاص حاصل کی گئی ہیں، وہ سارا دن قید تنہائی میں اس سے ہمدردیاں جتاتی رہتی ہے اور شام کو اس کے راز افسر کے سامنے فاش کر دیتی ہے، وہ ہر روز سیل سے آ کر ہمیں اس کی داستانیں بھی سنا دیتی۔

یوں ہمارے دلوں میں اس کے بارے میں کافی ہمدردی پیدا ہوگئی۔ ایک روز انھوں نے اسے بلاک میں منتقل کر دیا۔ ہم نے اس کے ساتھ بڑا اچھا معاملہ رکھا اور اپنے دل کے سارے دریچے اس مظلوم قیدی کے لیے وا کر دیے اور وہ بھی ایک ایک سے جا کر ہمدردی سے ان کے قصے سنتی اور ان کے راز کھوجتی رہی۔ کچھ عرصہ نہ گزرا تھا کہ اس کا نام رہائی کے لیے پکارا گیا، ہم سب نے مل کر خوب خوشی منائی اور اسے الوداع کہا۔ جانے سے پہلے اس نے ہم سب سے کہا کہ جو بھی اپنے گھر والوں کے لیے کوئی پیغام یا خط دینا چاہتی ہو اسے دے دے، مجھے نہیں معلوم وہ کیا احساس تھا کہ جب وہ مجھ سے یہ مطالبہ کر رہی تھی تو میں نے اپنے گھر یا خاندان کے حوالے سے اسے کچھ نہ بتایا اور وہ سب کا شکریہ ادا کر کے ان کے پیغامات اور خطوط لے کر چلی گئی اور کچھ ہی دیر میں یہ سارا مواد افسر کے ہاتھ میں تھا، لیکن فادیا اس سارے معاملے سے بالکل لاتعلق رہی، گویا کہ کچھ ہوا ہی نہ ہو، بلکہ وہ ہمارے ساتھ آخری ہڑتال میں بھی شریک ہوئی اور جو بھی ہڑتال میں نرمی یا اس کے خاتمے کی بات کرتا وہ اسے آڑے ہاتھوں لیتی۔ یہ سب بڑے کیموفلاج طریقے سے ڈرامے کی تکمیل تھی۔

اسی عرصے میں ہمارے بلاک میں ایک نئی مہمان داخل کی گئی۔ اس کا نام ترفہ تھا، نہ اس کا کوئی مسلک تھا نہ دین۔ طبیعت میں فادیا کے بالکل برعکس خاموش اور مہربان۔ اپنے قول اور فعل سے کسی کو گزند نہ پہنچاتی۔ ترفہ توما دمشق کے سربرآوردہ مسیحی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کی عمر تقریباً تیس برس تھی، وہ بے اولاد تھی اور شوہر کے ہمراہ بغرض علاج اردن اور عراق گئی تھی، لیکن اس کے شوہر کو عراق سے تجارت کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا اور اس کے ہمراہ وہ بھی دھر لی گئی۔ اس کے باوجود کہ اس نے اپنے شوہر کے کسی بھی معاملے میں ملوث ہونے یا نہ ہونے سے لاعلمی کا اظہار کر دیا تھا، اسے پہلے کفر السوسہ میں قید کیا گیا اور وہ بری طرح تعذیب سے دوچار کی گئی، پھر قطنا لے جایا گیا جہاں ہماری رہائی کے کچھ عرصے کے بعد اسے چھوڑ دیا گیا۔

## اللہ کے مہمان

قیدیوں کے نئے وفود آتے رہتے اور ہمارے بلاک کی تنگ دامانی کے باوجود اس میں ٹھنستے رہتے، اسی طرح لاذقیہ سے دو بہنیں لائی گئیں۔ یہ منی اور امل تھیں۔ منی ۳۵ یا ۳۶ برس کی تھی اور دو بیٹوں اور ایک بیٹی کی ماں تھی اور امل اٹھارہ انیس برس کی دوشیزہ تھی۔ منی بہت ہی نیک دل اور سادہ خاتون تھی۔ اس کا شوہر لاذقیہ میں خفیہ والوں اور مخالفین کے مقابلے کے وقت وہاں سے گزر رہا تھا۔ شیر خوار بچی اس کی گود میں تھی، جب ایک سنسناتی گولی اس کے ہاتھ کو چھیدتی ہوئی دل میں پیوست ہوگئی اور اللہ کی قدرت کا کیا کہنا کہ وہ اسی جگہ جان کی بازی ہار بیٹھا جب کہ زندہ سلامت بچی اس کے سینے سے چمٹی رہی۔ کچھ عرصے کے بعد لاذقیہ کے ایک مشہور اخوانی نے جس کا نام ابوعنتر یا احمد عنتر تھا، یہ کہہ کر اس کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا کہ وہ تیل بیچ رہا ہے۔ اس نے تیل لینے کے لیے دروازہ کھولا تو اس نے درخواست کی کہ وہ اسے اپنے گھر میں پناہ دے دے کیونکہ اس کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ منی نے بڑی سادگی سے اس کی بات مان کر اسے گھر میں چھپا دیا۔ لیکن خفیہ والوں نے اس گھر پر چھاپا مارا اور اسے ایک الماری سے برآمد کرلیا، اسے اسی وقت گولی ماردی اور منی کو جیل لے آئے۔ جب دوران تحقیق اس سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا تو منی بولی:

مہمان تھا۔

وہ حیرت سے بولے: مہمان؟ وہ اتنا بڑا مجرم تھا اور تم نے اسے گھر میں رکھا ہوا تھا؟

وہ بولی: کیونکہ مہمان اللہ کا مہمان ہوتا ہے۔

تفتیشی اہل کار استہزائیہ انداز میں بولا: ''اللہ کا مہمان؟''

وہ اسی معصومیت اور سادگی سے کہنے لگیں: بخدا! اگر کوئی مجھ سے آکر کہے کہ میرا کوئی نہیں، نہ رہنے کا ٹھکانہ ہے اور مجھ سے ضیافت کا مطالبہ کرے تو کیا میں اسے یوں ہی لوٹا دوں؟

ان دونوں نے آپس میں یہی طے کیا تھا کہ اگر کوئی پوچھے تو اسے یہی کہا جائے گا کہ یہ میری بہن کا منگیتر ہے۔ اس طرح تحقیقی ٹیم کے سامنے بھی یہی بات دہرائی گئی۔ نتیجتاً وہ منی کی بہن کو بھی لے آئے جو اس سارے معاملے سے بے خبر تھی اور اسے بھی ہمارے ساتھ جیل کی ہوا کھانا پڑی۔ حکام نے اسی پر بس نہ کیا بلکہ وہ ان کے باپ اور بھائی کو بھی اٹھالائے، پھر بھائی کو تو رہا کر دیا لیکن بوڑھے باپ کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے چھوڑ دیا۔ وہ جب ہمارے پاس آئی بڑی حسرت سے رو رہی تھی۔ بالکل بچوں کی مانند۔ ہم سب بھی اپنی عادت کے مطابق ان دونوں کے گرد جمع ہو گئے۔ ان کا حجاب دیکھ کر ہماری ان سے ہمدردی دوچند ہو چکی تھی، ہم نے ان سے پوچھا:

تم کون ہو اور یہ تم دونوں کو کیوں لے آئے ہیں؟

انھوں نے ہمیں پورا قصہ سنا دیا۔ ہم نے حیرت سے سوال داغا:

جب انھوں نے تم پر تشدد بھی نہیں کیا تو تم بچوں کی طرح رو کیوں رہی تھی؟

منی بولی:

مجھے اہل کار نے کہا: اندر چلو اور جب میں تیزی سے داخل نہ ہوئی تو اس نے میرے باپ کو گالی دی۔

الحاجہ نے پوچھا: تو کیا ہوا؟

بولی: میرا باپ گالی کے قابل نہیں۔

منی ۱۹۸۵ء تک ہمارے ساتھ رہی، پھر اسے لاذقیہ منتقل کر دیا گیا اور اس کے ایک برس بعد وہ قطنا لائی گئی، پھر اسے ہمارے ہمراہ دوما منتقل کیا گیا اور ہمارے ساتھ ہی اسے رہائی ملی۔ البتہ اس کی بہن کو کفر السوسہ ہی میں رہائی مل گئی تھی۔

ہمارے بلاک میں ام یاسمین سمارتج بھی لائی گئیں جن کے بیٹے پر ۱۹۸۱ء کے حادثہ

ازبکیہ دمشق میں ملوث ہونے کا الزام تھا۔ ہمیں ان کے مقتول بیٹے کی تصویر شناخت کے لیے دکھائی گئی جس میں اس کا چہرہ کٹا پھٹا تھا اور تصویر واضح نہ تھی۔ ہم نے نفی میں سر ہلا دیا، شام کو وہ اس کی والدہ کو بھی لے آئے، وہ بھی اس کی تصویر نہ پہچان سکیں، کیونکہ ان کا بیٹا حکومت کے خلاف سرگرمیوں میں ملوث نہ تھا۔ انھیں جس وقت میت کا چہرہ دکھایا گیا، اللہ نے انھیں صبر و ثبات کی نعمت سے نوازا اور انھوں نے بس اسی قدر کہا: حسبنا اللہ ونعم الوکیل۔

انھوں نے ان کے ہمراہ ان کے شوہر اور ۱۲ و ۱۶ برس کے دو بیٹوں کو بھی گرفتار کر لیا، جنھیں جنوبی حصے میں رکھا گیا۔ انھیں ہمارے ہمراہ اور ان کے شوہر اور بچوں کو ہمارے بعد رہا کیا گیا۔

مجھے یاد ہے کہ جب ہمیں ''محکمہ میدانیہ'' میں دھماکے کے مقتولوں کی تصویریں دکھا کر کہا گیا:

ان ہی معصوموں کے خون کی وجہ سے آپ سے تفتیش کی جارہی ہے۔ اللہ کی قسم ہم ان کے خون کا بدلہ آپ کی گردنوں سے لیں گے۔ آپ کو خبر ہونی چاہیے کہ اخوان باہر جو بھی سرگرمی دکھائیں گے ہم اندر والوں کو اس کی سزا دیں گے۔ اس طرح جب ہم پر تشدد بڑھایا جاتا تو ہمیں معلوم ہو جاتا کہ باہر کچھ ہوا ہے۔ بلکہ ایسی صورت میں ہمارا ہوا کا راستہ بھی بند کر دیا جاتا اور روشنی فراہم کرنے والا اکلوتا روشن دان بھی۔ نوجوانوں کی کراہوں اور چیخوں میں بھی اضافہ ہو جاتا اور الحاجہ ریاض بڑی سادگی سے کہتیں:

آؤ اخوان ہمارا حال دیکھو۔ تم جو چاہو کرتے ہو ... اور ہماری قبر ہم پر مزید تنگ ہو جاتی ہے۔

## ہالہ کا المیہ

جیل دکھ اور الم کا دوسرا نام ہے، قیدیوں اور گرفتار شدگان کے حالات سن کر عجب یاس طاری ہو جاتی ہے، لیکن جیل کے تمام عرصے میں ہالہ سے زیادہ دردناک اور الم ناک قصہ میں نے نہیں سنا۔ اس روز میں روشن دان کے سوراخ سے باہر دیکھ رہی تھی جب اچانک میری نگاہ غیر ارادی طور پر اس کی جانب اٹھی۔ میں نے لڑکیوں کو متوجہ کر کے کہا:

ایسا لگتا ہے وہ کسی غیر ملکی خاتون کو لے آئے ہیں جو عربی نہیں سمجھتی۔ حسن اس سے بات کر رہا تھا اور اسے کندھے سے پکڑے ہوئے تھا اور اسے دھکیلتا ہوا لا رہا تھا۔ وہ غریب بلا کچھ جانے بوجھے اس کے ساتھ گھسٹتی ہوئی آ رہی تھی، لیکن وہ غیر ملکی مسلمان لگتی تھی؛ کیونکہ اس نے سر پر سکارف باندھ رکھا تھا۔

جب میں نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا وہ اسے قید تنہائی کے سیلوں سے لائن میں لے جا رہے تھے۔ میں وہیں کھڑی انتظار کرتی رہی، پھر میں نے اسے واپس لوٹتے ہوئے دیکھا۔ تقریباً پورا مہینہ اسے مختلف اوقات میں اسی طاق سے دیکھتی رہی۔ وہ اسے لاٹھی سے ہانکتے ہوئے لاتے اور ہر قدم پر اسے گھسیٹ کر لے جاتے گویا اس کے اعصاب تشنج زدہ ہوں۔ اس پر عجب سرد مہری کی کیفیت طاری رہتی۔ نہ وہ بات کرتی نہ کسی تکلیف کا اظہار کرتی۔ وہ اسے کسی جانور یا نعش کی مانند کمرۂ تفتیش میں لے کر جاتے، وہ انھیں پتھرائی نظروں سے دیکھتی اور خالی نظریں دائیں بائیں گھماتی رہتی! ایک ماہ بعد جب ہم اس کے بارے میں مایوس ہو چکے تھے وہ اسے ہمارے بلاک میں لے آئے۔ مجھے اب بھی وہ لمحہ یاد ہے جب داروغہ ابراہیم نے دروازہ کھولا تھا اور اسے کندھے سے تھامے ہوئے مجھے پکارا تھا:

ہیں۔ آؤ ذرا اسے پکڑو۔ اب یہ تمھارے حوالے ہے۔

اور وہ اس خاتون کو ہمارے بلاک میں چھوڑ کر چلا گیا۔ میں نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا، یہ تو وہی تھی جسے میں ایک ماہ سے دیکھ رہی تھی۔ اب بھی اس نے حجاب پہن رکھا تھا اور اس کا بڑا سا کمبل زمین پر گھسٹ رہا تھا۔ اس کے کپڑے بری طرح گندے تھے، پتا نہیں کب سے وہ اسی حال میں تھی۔ ہم نے کچھ دیر اس کے آگے بڑھنے کا انتظار کیا، مگر وہ اسی طرح ساکت کھڑی رہی، جہاں اسے ابراہیم چھوڑ کر گیا تھا اور سر مو حرکت نہ کی۔ ہم سب اس کی جانب بڑھے اور نرمی سے پوچھا:

تمھارا کیا نام ہے؟

وہ کچھ نہ بولی۔

تم کہاں سے آئی ہو؟

وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ الحاجہ مدیحہ نے آگے بڑھ کر کہا:

پیچھے ہٹو۔ بخدا تم لوگوں نے تو اسے پریشان کر دیا ہے۔

ہم پیچھے ہٹ گئے اور الحاجہ بڑی اپنائیت سے آگے بڑھیں اور نئے سرے سے پوچھنے لگیں:

بیٹی تمھارا کیا نام ہے؟

اس کی نحیف ونزار کپکپاتی آواز کسی اندھے کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ دور افق میں کسی ایک نقطے پر نظر ٹکائے ہوئے بلا حس وحرکت بولی:

''آپ کون ہیں؟''

تقریباً ایک گھنٹہ گزر گیا، لیکن باوجود کوشش کے اس نے کوئی اور کلمہ منہ سے نہ نکالا۔ ہم اس سے مایوس ہو گئے اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ ہم نے سوچا: شاید وہ خوف زدہ ہے اور کچھ دیر میں اس کا اعتماد بحال ہو جائے گا۔ اس وقت منیرہ ریڈیو سن رہی تھی۔ اس پر جب تلاوتِ قرآن نشر ہوتی اور خاص طور پر تعلیم قرآن کا پروگرام ''ناشیء فی رحاب قرآن'' لگتا تو وہ ہماری خاطر اس کی آواز بلند کر دیتی یا ریڈیو ہمارے حوالے کر دیتی اور ہم اسے پائپ کے سوراخ کے قریب رکھ دیتے تاکہ قریبی سیلوں کے نوجوان بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔ اس وقت بھی ایک بچے کی تلاوت نشر ہو رہی تھی میں نے جوں ہی اس کی آواز بلند کی اس کے چہرے پر شکنیں نمودار ہو گئیں اور وہ قدرے غصّے سے چیخی:

''اسے بند کرو۔ بند کرو اسے۔ یہ قرآن کو غلط پڑھ رہا ہے حرام یہ سب جھوٹ اور افترا ہے''

ہم سب کے منہ حیرت سے کھل گئے: استغفر اللہ۔ لیکن ام شیما نے اٹھ کر ریڈیو بند کر دیا اور بولیں:

"لڑکیو اس میں کچھ ہے۔"

ہالہ یوں ہی بت بنی کھڑی رہی، نہ اس نے حرکت کی نہ اپنی جگہ سے ہلی، رات ہو گئی۔ آدھی رات تک وہ لکڑی کے تختے کی مانند ہو چکی تھی۔ ہم نے جب اسے ہلانے کی کوشش کی وہ کسی بندوق کی گولی کی مانند زمین پر آ رہی! الحاجہ خود پر قابو نہ رکھ سکیں اور ابراہیم سے کہنے لگیں:

بیٹا اس کو کچھ اثر ہے؟ یہ اسی جگہ جمی کھڑی ہے؟ ہم سونا چاہتے ہیں، آرام سے بیٹھنا چاہتے ہیں، کچھ کھانا پینا، مگر یہ اسی طرح کھڑی ہے۔

ابراہیم بولا: اسے کچھ دھیان نہ دو۔ یہ تو مجسمہ ہے۔

الحاجہ نے حیرت سے پوچھا: کیا یہ جب سے آئی ہے اسی حالت میں ہے؟

اس نے اثبات میں سر ہلایا: ہاں بالکل اسی طرح...... مٹی کا مادھو۔ یہ ڈرامہ کر رہی ہے۔ سمجھتی ہے اس طرح تفتیش اور فردِ جرم سے بچ جائے گی، حالانکہ جرم ثابت ہو چکا ہے۔ یہ محض اس کا خواب ہے۔

الحاجہ دوبارہ اس کے پاس آ گئیں اور پیار سے اسے تھپتھپایا اور وہیں بیٹھ کر اسے بھی پاس بٹھا لیا۔ ہم نے ان سے کہا کہ روشنی گل کر دیں اور ہم سونے کے لیے لیٹ گئے، ابھی چند لمحے بھی نہ گزرے تھے کہ میں نے اسے اپنے پاؤں کے قریب اکڑوں بیٹھے دیکھا، خوف کی ایک لہر میرے اندر سرایت کر گئی اور میں اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکی اور چیخ کر بولی:

تحہ! اللہ کے واسطے اسے مجھ سے پرے کرو۔

سب لڑکیاں فوراً اٹھ گئیں اور مجھ سے پوچھنے لگیں کہ کیا ہوا ہے۔ ان کی نظر اس پر پڑی تو وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی، الحاجہ اس کے پاس آئیں اور اسے نرم لہجے میں کہا:

بٹی آپ میرے پاس آجاؤ۔

اور اسے کندھے سے پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئیں۔ بلاک میں دوبارہ خاموشی چھا گئی۔
صبح نماز کی ادائیگی کے بعد جب میں دوبارہ سونے کے ارادے سے لیٹی تو اچانک مجھے اپنے قریب سانسوں کی گرماہٹ محسوس ہوئی، میں نے آنکھیں کھولیں تو میرا کمبل ایک جانب سے سرکا ہوا تھا اور وہ مجھے گھور رہی تھی اور اس کے ہاتھ میری گردن کی جانب بڑھ رہے تھے، گویا وہ میرا گلا گھونٹنا چاہتی ہو۔ میری چیخ نکل گئی۔ وہ اس طرح دوسری جانب متوجہ ہو گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ میری آواز سے ماجدہ بیدار ہو گئی اور اس سے پوچھنے لگی:

تم کیا چاہتی ہو؟ کیا تمھیں کچھ چاہیے؟

اس نے بے پروائی سے جامد لہجے میں پوچھا:

''یہ کیا ہے۔ کیا یہ کلیسا ہے؟''

ماجدہ بولی: نہیں۔ یہ کلیسا نہیں، یہ جیل ہے!

پھر وہ دوبارہ خاموش ہو گئی اور بے حس و حرکت بیٹھ گئی۔

## آلو کا گولہ

ہالہ جب آئی تو اس کے کپڑے اور حجاب سخت میلے تھے، وقت گزرنے کے ساتھ ان پر میل کی تہوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ہم میں سے جب بھی کوئی اس کے قریب ہونا چاہتا یا اس کے کپڑوں کو چھونا بھی چاہتا تو وہ بدک کر اور پرے ہو جاتی۔ اسی حال میں آٹھ ماہ گزر گئے۔ نہ وہ کسی سے بات کرتی نہ کھاتی پیتی اور نہ غسل کرتی۔ ہم جبراً اس پر کچھ پانی انڈیلتے اور زبردستی اس کے منہ میں نوالے ڈالتے جنھیں وہ نگلنے میں بھی گھنٹہ لگا دیتی تھی۔ وہ رات کے وقت غسل خانے کی جانب بڑھتی لیکن اگر اس پر کسی کی نظر پڑ جاتی تو وہ وہیں سے واپس لوٹ آتی تھی۔ ایک روز

عائشہ نے اسے ایک ابلا ہوا آلو پیش کیا، اس نے اس کے ہاتھ سے جھپٹ کر اسے زوردار طریقے سے نشانہ لے کر پھینکا۔ میں اس وقت غسل خانے میں کپڑے دھورہی تھی جب میرے سر میں ایک زوردار دھما کا ہوا۔ شاید وہ میرے معاملے میں کافی جرأت مند ہوگئی تھی۔

## تشدد کے نشانات

اس کے آنے کے ایک ماہ بعد ہم نے طے کیا کہ کسی صورت اس کے کپڑے تبدیل کروائیں، اس سارے عرصے میں اس نے غسل نہ کیا تھا، لیکن ہم جب بھی اس کے قریب ہونے کی کوشش کرتے وہ بھاگ کھڑی ہوتی۔ الحاجہ اور ام شیما نے اس کے گرد گھیرا تنگ کر دیا اور اسے قائل کرنے لگیں:

دیکھو۔ یہ کپڑے بہت خوب صورت ہیں مگر اب یہ میلے ہو گئے ہیں۔

اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ ام شیما اصرار کرنے لگیں، وہ چیخ کر بولی: ''یا لطیف۔ یا ساتر'' اور انھیں جھٹک دیا، ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ اس کے کپڑے پھاڑ کر تبدیل کروا دیں، لیکن اس کا جسم ہنوز میلا تھا اور وہ اپنے لمبے ناخنوں سے اسے کھجاتی اور زخمی کرتی رہتی تھی، حالت یہاں تک پہنچی کہ اس کا جسم جوؤں سے بھر گیا۔ ہم نے ایک اور کوشش کی اور سب نے مل کر اسے حمام میں داخل کر دیا اور اتنی چھینا جھپٹی اور چیخم دھاڑ ہوئی کہ اہل کار بھاگے چلے آئے کہ کیا ہو رہا ہے۔ الحاجہ نے کہا: کچھ نہیں۔ ہم اسے غسل کروا رہے ہیں کیونکہ ہمیں خوف ہے کہ کہیں اسے جلدی بیماری نہ ہو جائے۔

وہ بولے: تمھیں نہیں پتا وہ تم سے ڈرامے کر رہی ہے۔ یہ پاگل ہے...... فاجرہ۔

اہل کار اس کے بارے میں ہمیشہ اسی کٹھور پن سے بات کرتے، لیکن غسل کے دوران ہم نے اس کے پاؤں، پنڈلیوں اور جسم کے نچلے حصوں پر گرم استری کے نشانات دیکھے، ہم اس کا سوختہ بدن دیکھ کر حیران رہ گئے، لیکن اس اسرار سے پردہ کون اٹھاتا۔ یوں اس خاتون پر الم ناک

مظالم کی تفصیل ایک سربستہ راز ہی رہی۔ پانچ چھ ماہ کے بعد ہمیں محسوس ہوا کہ اس کا پیٹ بڑھنا شروع ہو گیا ہے اور وہ کافی تکلیف میں رہتی ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا تناؤ بڑھ رہا تھا۔ وہ تکلیف سے چلانا اور ہائے وائے کرنا شروع کر دیتی۔ ہمیں شک ہوا کہ شاید وہ امید سے ہے، لیکن اب بھی ہمیں اس کے حال کی کچھ خبر نہ تھی۔ الحاجہ نے از خود کڑیاں ملانا شروع کیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی القاعدہ ممبر کی بیوی ہو اور وہ اکٹھے ہی چھاپے کی لپیٹ میں آ گئے ہوں اور اس کی نظروں کے سامنے اس کے شوہر کو شہید کر دیا گیا ہو اور اس صدمے سے اس کی یہ حالت ہو گئی ہو اور یہ امید سے ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ڈیوٹی پر موجود اہل کار نے بھی کچھ محسوس کیا ہو کہ جب رئیس تک خبر پہنچی تو تفتیشی اہل کار تفتیش کے لیے آ گئے۔ تفتیشی شعبے کا نگران کہنے لگا:

ہم خود چیک کریں گے، کہیں وہ حاملہ ہی نہ ہو۔

ڈاکٹر عائشہ نے کہا کہ وہ خود ذمہ داری سے تحقیق کر کے انھیں بتا دیں گی۔

ڈاکٹر عائشہ کے لیے اس ذمہ داری کو نبھانا بھی ایک آزمائش بن گیا، ہالہ کی چیخ و پکار نے جیل کے درو دیوار کو لرزا کر رکھ دیا۔ اس کے جسم پر زیادتی کے واضح نشانات تھے لیکن اہم خبر یہ تھی کہ وہ حاملہ نہیں تھی۔ اگلے دو روز ہالہ نے شدید تکلیف میں گزارے حتیٰ کہ ہمیں گمان ہوا کہ درد کی شدت سے کہیں اس کی موت ہی واقع نہ ہو جائے۔ ہم سب نے مل کر فریاد کی:

خدا کے لیے کسی ڈاکٹر کو بلا لاؤ، ہالہ مر جائے گی۔

ایک اہل کار پھر تفتیش کے لیے آ حاضر ہوا۔ ہم نے بتایا کہ شدتِ الم سے اس کی جان جا سکتی ہے۔ اس نے نہایت کٹھور پن اور سرد مہری سے جواب دیا:

تو کیا ہوا؟ حسبِ قانون سات فی صد قیدیوں کی جیل میں موت کی گنجائش موجود ہے۔

لیکن ہماری منت سماجت اور فریاد کے بعد وہ سپیشلسٹ ڈاکٹر کو بلا لایا، جو قیدیوں کے نہیں بلکہ

اہل کاروں کے علاج پر مامور تھا، وہ اس کے معائنے کے بعد کہنے لگا:

اسے کچھ نہیں ہے، صرف قبض کا عارضہ ہے۔

وہ اسے خود ہی ادویات استعمال کروا کر گیا۔ کچھ دیر بعد ہی بلاک کی فضا ایسی ہو گئی کہ سب کا دم گھٹنے لگا۔ الحاجہ مدیحہ نے زور سے دروازہ بجا کر کہا:

دروازہ اور روشن دان سب کھول دو، ورنہ ہم مر جائیں گے۔

اہل کار کا بلاک سے باہر دم گھٹنے لگا، وہ چیخا:

یہ کیا ہے۔ اندر کیا چیز ہے۔ تم لوگوں نے کیا کیا ہے؟

الحاجہ بولی: وہ بیت الخلا میں گئی ہے۔

## گوشت جلنے کی بو

ایسا لگتا تھا کہ فرع کے ذمہ داران کو ہالہ کے کچھ مزید امتحان مقصود تھے۔ انھوں نے اسی بلاک کے اسی ونگ سے اس کے چچازاد بھائی کو باہر نکالا اور ان کی اتفاقیہ ملاقات کروادی، تا کہ ان کا ردِعمل دیکھ سکیں۔ الحاجہ مدیحہ نے محکمہ تفتیش کے سربراہ کو درخواست دی کہ وہ اسے اس کے ساتھ رہنے کی اجازت دیں، تا کہ وہ اطمینان محسوس کرے اور کوئی بات کر سکے جسے انھوں نے قبول کر لیا۔ انھوں نے ان دونوں کو ایک وقت میں باہر نکالا، اس وقت ہالہ کی حالت اتنی بری ہو چکی تھی کہ ایک دفعہ حجاب اتارنے کے بعد اب وہ ستر اور لباس کا بھی اہتمام نہ کرتی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے اور چہرہ پھٹا ہوا تھا، وہ پھٹی نظروں سے دیکھ رہی تھی، اس کا کزن اسے دیکھتے ہی چیخنے لگا:

ہالہ۔ ہالہ۔ یہ تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے؟ میں تمھارا چچازاد ہوں۔ اس نے اسے کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑا، لیکن وہ گویا زندہ ہی نہ تھی۔ وہ بلک اٹھا:

ہالہ۔ میں تمھارا چچازاد ہوں۔ میں فلاں ہوں۔

لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ گویا وہ دیواروں سے سر پھوڑ رہا ہو۔ ابراہیم اسے بلاک میں واپس لانے کو مڑا، اس نے دروازہ کھولا مگر وہ وہیں جمی کھڑی رہی۔ اس نے اسے اندر دھکیلا تو وہ دروازے کا ہینڈل پکڑ کر کھڑی ہو گئی، چار اہل کار مل کر اسے اندر لانے کی کوشش کرتے رہے لیکن ایک انگلی بھی اس کی جگہ سے نہ سرکا سکے۔ ایک نے سگریٹ سلگا کر اس کے ہاتھ پر لگایا، وہ نہ ہلی، نہ ہی اپنا ہاتھ پیچھے کیا۔ اس نے بھی غصے میں سگریٹ سے اس کا ہاتھ داغ دیا۔ واللہ گوشت جلنے کی بو ہمارے ناک تک پہنچ گئی مگر وہ اسی طرح اکڑی رہی گویا کہ اسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ میں اس خوف ناک منظر میں اپنے اعصاب پر قابو نہ رکھ سکی اور بے اختیار چیخ کر کہا:

خدا کا خوف کرو...... بخدا اسے چھوڑ دو...... رک جاو!

ان سب نے مل کر اسے کسی خشک لکڑی کی مانند بلاک کے فرش پر پھینکا اور دروازہ بند کر دیا۔

کچھ دیر بعد وہ اسے والدہ سے ملاقات کروانے کے لیے دوبارہ لے گئے، جنھوں نے اس سے ملاقات کے لیے کافی پیسہ خرچ کیا تھا۔ ہالہ کی گرفتاری کی خبر ان کے والد پر بجلی بن کر گری تھی۔ وہ خود پر قابو نہ رکھ سکے اور دل کے درد کے ساتھ ہسپتال داخل ہوئے جہاں وہ جان کی بازی ہار گئے۔ اس کی والدہ تڑپتی ہوئی جیل پہنچیں، وہ ابھی تک ماتمی لباس پہنے ہوئے تھیں۔ اس ملاقات کا ماں بیٹی دونوں پر سلبی اثر ہوا، جہاں بیٹی کے لیے باپ کی موت کا صدمہ عقل کھونے کو کافی تھا وہاں ماں بیٹی کی مجنونانہ حالت دیکھ کر خون کے آنسو پی رہی تھیں۔ اس کے جسم پر تشنج کی سی کیفیت تھی۔ انھوں نے جب اسے جیل کی بارک سے باہر نکالا تو وہ ایک لاش کی مانند تھی۔

## اور ہالہ بول پڑی

مقابلہ ختم ہو گیا، مگر اس بے چاری پر عذاب کا سلسلہ ختم نہ ہوا۔ تقریباً تین ماہ بعد جب بلاک کا دروازہ کھلا ہوا تھا، ہالہ نے اپنے کپڑے درست کیے، بیگ اٹھایا، سر پر نماز کا سکارف اوڑھا

اور بلا کچھ کہے سنے بلاک سے باہر چل دی۔ جب داروغہ ہیثم نے اسے دیکھا تو اسے پکڑنے کے لیے بھاگا۔ اسی چھینا جھپٹی میں ہالہ کا پاؤں پھسلا اور وہ پوری قوت سے زمین پر آ رہی۔ باقی اہل کار بھی بھاگ کر آئے اور اسے اندر دھکیل دیا۔ الحاجہ نے اس سے نرمی سے پوچھا:

تم کہاں جا رہی تھیں؟

بولی: امی کی سال گرہ...... میں امی کی سال گرہ میں جا رہی تھی۔

ابراہیم اندر آیا تو وہ اسی جگہ بیٹھی اپنی چوٹیں سہلا رہی تھی۔ اس نے آتے ہی اسے ایک زوردار تھپڑ رسید کیا، اس کا سر دو مرتبہ دیوار سے ٹکرایا، پھر وہ اسے جھنجھوڑ کر چلانے لگا:

تم چاہتی ہو کہ ہمیں دھوکہ دے کر فرار ہو جاؤ اور......

اس نے اس کے ہاتھ پیچھے کی جانب مروڑے اور ایک اور چانٹا لگایا۔ پھر اس کے ہاتھ کو اپنے آہنی ہاتھ میں جکڑ کر اس کے چہرے پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ ہم اس کی خاطر چیخنے اور مدد کے لیے پکارنے لگے، لیکن ابراہیم کو ذرا رحم نہ آیا اور وہ ہونٹ سیے اس عذاب کو برداشت کرتی رہی۔ نجانے کتنی دیر ہالہ پر عذاب کا یہ سلسلہ جاری رہا۔

اس کے بعد ہالہ نے مجھ سے بات چیت شروع کر دی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے ناخن قدرے بڑھے ہوئے ہیں، سوچا میں دوبارہ کچھ کوشش کرتی ہوں۔ میں نے دھیرے سے پوچھا:

میری بہن مجھے بتاؤ تو سہی۔ تمھارا نام کیا ہے؟

اس کی آواز دور کسی کنویں سے آتی محسوس ہوئی:

میرا نام قسمت کی نظر ہو گیا ہے۔ میرا نام ہوا میں تحلیل ہو گیا ہے۔

اس نے بات ختم کر دی اور میں چیختی ہی رہ گئی: ہالہ بتاؤ ...... بتاؤ!

میں شش و پنج میں پڑ گئی اور بات بدلنے کے لیے کہا:

کیا خیال ہے میں تمھارے ناخن نہ کاٹ دوں؟

میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا، لیکن اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر دبوچ لیا اور زور آزمائی کرنے لگی، میں سخت خوف زدہ ہوگئی، اس روز کے بعد میں نے اس کے قریب آنے کی کوشش نہ کی۔

ایک مرتبہ جب ہم نے اسے غسل پر آمادہ کرنا چاہا اور کپڑوں کی پوٹلی کے ساتھ اسے نسبتا کھلے غسل خانے کی جانب لے کر چلے تو وہ پوچھنے لگی:

تم مجھے کہاں لے کر جا رہے ہو؟ ٹیلی وژن کے لیے؟

اور اس نے زور زور سے چیخنا اور رونا شروع کر دیا، سو ہم اسے واپس لے آئے۔

پھر ہم نے اسے کئی روز کی کوشش کے بعد غسل کرنے پر آمادہ کر ہی لیا، اس نے الحاجہ مدیحہ سے کہا:

ایک شرط پر، اگر یہ مجھے اپنے کپڑے اتار کر دے۔ اس نے ماجدہ کی جانب اشارہ کر دیا۔ الحاجہ کہنے لگیں:

لیکن اس کے پاس تو مزید کپڑے نہیں ہیں، یوں کرتے ہیں میرے گھر والوں نے میرے لیے جو نیا جوڑا بھیجا ہے تم وہ پہن لینا، بہت پیارا ہے اور قیمتی بھی۔

اور واقعی الحاجہ نے بڑے اہتمام سے اس جوڑے کو کسی موقعے پر پہننے کے لیے بچا رکھا تھا، لیکن اس نے ماجدہ کے کپڑے لینے کا اصرار جاری رکھا اور آخر ماجدہ ہی کو اس کا مطالبہ تسلیم کرنا پڑا اور الحاجہ نے آگے بڑھ کر اپنا سوٹ ماجدہ کو دے دیا۔

## سرخ رنگ ممنوع اور پانی نا قابلِ قبول

ہم نے محسوس کیا کہ ہالہ ہر سرخ شے سے خوف زدہ ہو کر بھاگ اٹھتی ہے۔ بیت الخلا میں گیزر کی سرخ روشنی دیکھ کر اس کی حالت عجیب ہو جاتی، اس کے اعصاب تشنج زدہ ہو جاتے،

نجانے کیوں۔ ماجدہ نے گلاب کے پھول جیسے ٹاپس پہن رکھے تھے، ان میں ایک سرخ نگینہ جڑا تھا۔ ہالہ اسے بھی پتھرائی نظروں سے دیکھتی اوراس کے چہرے پر خوف کے سائے پھیلتے رہتے۔ ہم نے گیزر کی سرخ بتی کو موٹے کاغذ سے کور کردیا اور ماجدہ نے بھی اپنے ٹاپس اتار کر چھپا دیے۔ ڈاکٹر عائشہ اپنی عینک اتار کر رکھتیں تو وہ بڑی دیر تک اسے دیکھتی رہتی اوراس میں اپنا چہرہ دیکھتی مختلف زاویوں سے دیکھتے ہوئے اس کا دل کبھی نہ بھرتا۔

ایک روز اچانک ہی وہ کہنے لگی کہ اسے پیاس لگی ہے۔ ہم نے حمام کی ٹونٹی سے پانی کا گلاس بھر کر اسے دیا جہاں سے ہم سب پیتے تھے، اس نے ایک نظر ہماری طرف دیکھا اور بولی:

کیا کوئی شخص پیشاب بھی پی سکتا ہے؟

الحاجہ مدیحہ نے اس سے کہا: اچھا۔ میں تمھارے لیے جیل کے سب سے عمدہ گلاس میں پانی منگواتی ہوں۔

انھوں نے دروازہ بجا کر ابو عادل کو بلایا اوراس سے درخواست کی:

ہمیں ہالہ صاحبہ کے لیے پانی چاہیے۔ انھیں پیاس لگی ہے۔

وہ حیرت سے بولا: کیا آپ کے پاس پانی ختم ہوگیا ہے؟

وہ بولیں: ہمارے پاس جو پانی ہے وہ ہالہ نہیں پی سکتیں۔

وہ گیا اور ایک گلاس پانی لے آیا، اس نے ایک نظر ہم سب پر ڈالی پھر ایک نگاہ پانی پر ڈالی اور بولی:

یہ گندا ہے۔

اوراس میں تھوک دیا۔ الحاجہ نے اس کے لیے دوسرا منگوایا تو اس نے اس میں بھی تھوک دیا اور کچھ دیر بعد ہالہ کے سامنے سات گلاس رکھے تھے اور وہ سب میں تھوک چکی تھی اور اس نے ایک قطرہ پانی بھی نہ پیا تھا۔

ایک روز ہم مزے سے بیٹھے باتیں کر رہے تھے، ہم نے ایک کھیل شروع کیا کہ ہم سب فلسطینی مہاجر ہیں اور ریڈیو کے ذریعے گھر والوں کو پیغامات بھیج رہے ہیں اور یوں ہر ایک اپنے احساسات بیان کر رہی تھی۔ الحاجہ ریاض کہنے لگیں:

میں اپنی امی کو سلام کہتی ہوں۔ او میری ماں۔ آپ میرے بنا کیسے رہتی ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ مجھ بن آپ کے آنسو کیسے بہتے ہوں گے۔

اور وہ خود بھی پھوٹ کر رونے لگیں۔ انھیں دیکھ کر باقی خواتین بھی اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکیں۔ ہم نے ہالہ سے پوچھا:

ہالہ۔ تم بھی ہمارے ساتھ پروگرام میں شامل ہوگی؟

اُم شیما بولیں: آؤ ہالہ۔ آج ہمیں کوئی گیت تو سناؤ۔

وہ مترنم آواز میں ''توحید ربی'' گانے لگی اور پورا قصیدہ گا کر ہی دم لیا۔

داروغہ بھاگتا ہوا آیا اور استفسار کرنے لگا:

یہ کیا ہے؟ کیا میلاد النبی کا پروگرام ہو رہا ہے؟ الحاجہ کہنے لگیں: ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو۔ طاق بند کر دو اور ادھر کوئی نہ آئے۔

اس روز ہم سب اس قدر خوش تھے کہ جیسے کسی کے ہاں پہلوٹھی کا بچہ ہوا ہو اور ہم خوش بھی کیوں نہ ہوتے، ہمارا رواں رواں اللہ کی حمد پکار رہا تھا۔ آخر کار خاموشی کا قفل ٹوٹ گیا تھا اور ہالہ بول پڑی تھی۔

## خودکشی کی کوشش

دن یوں ہی گزرتے رہے۔ ہالہ کی حالت بہتر ہونے لگی اور تقریباً آٹھ ماہ میں وہ ایک نارمل انسان کی مانند ہوگئی۔ ہم نے اس سے اس کی حالت کے بارے میں سوال کیا تو اس نے

بتایا کہ اسے لاذقیہ سے دمشق لائے جانے کے بارے میں کچھ معلوم نہیں اور نہ ہی اسے معلوم تھا کہ وہ کیوں کر ہوش وخرد سے بیگانہ ہوگئی تھی۔ بعد میں ہمیں اس کے صدمے کا سبب کچھ یوں معلوم ہوا:

ہالہ کا تعلق ایک دین دار گھرانے سے تھا، وہ ''کلیۃ العلوم لاذقیۃ'' کی طالبہ تھی، اس کا ماموں زاد بھائی (جومیٹرک کا طب علم تھا) پڑھائی میں اس سے مدد حاصل کیا کرتا تھا، خاص طور پر اس کے پسندیدہ مضمون ریاضی میں۔ حکومت نے پکڑ دھکڑ شروع کی تو ان کے گروپ کا ایک لڑکا پکڑا گیا اور اس کی نشان دہی پر سارے دوستوں کو دھرلیا گیا۔ تفتیش کار نے دوران تفتیش اس سے پوچھا کہ تمھیں کون سکھاتا پڑھاتا ہے؟ ان کے سوال کا مقصد اس تنظیمی گروپ کے بارے میں تھا، لیکن لڑکے نے سادگی سے دوران تفتیش ہالہ کا نام لے لیا، کیوں کہ وہی اسے ریاضی اور فزکس پڑھاتی تھی۔ وہ اسے پکڑ لائے اور اس کے ہاتھ پاؤں بیڑیوں میں جکڑ دیے اور مار پیٹ کے دوران اس کے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ جیل کے افسر اور اس کے تین اہل کاروں نے اس پر بہیمانہ تشدد کیا اور اجتماعی زیادتی کی کوشش کی۔ پھر اسے گودا جماتی ٹھنڈک میں قید تنہائی میں ڈال دیا۔ جہاں وہ نجانے کتنی دیر ٹھٹھرتی کانپتی پڑی رہی۔ اس پر ہیبت فضا میں اہل کاروں کی بار بار کی آمد ورفت اس کا سانس سکھائے رکھتی۔ اس کی عزت کے دشمن جنھوں نے کس بیدردی سے اس کے شرف کو نشانہ بنایا تھا۔ وہ اسے کثرت سے تفتیش کے نام پر لائن حاضر رکھتے اور وہ سوکھے پتے کی مانند لرزتی رہتی کہ وہ کسی بھی لمحے اس کو زیادتی کا نشانہ بنا سکتے تھے۔
ان ہی بھیڑیوں کے غول کے درمیان ایک روز جب وہ تفتیش میں اپنی باری کی منتظر تھی، اچانک اسے ایک نوکیلا کانچ یا فولاد کا ٹکڑا نظر آیا۔ اسے ایسے لگا جیسے یہی اس کی نجات کی راہ ہے۔ اس نے چپکے سے اسے اٹھایا اور تیزی سے اپنی شریان کاٹ ڈالی، تاکہ اس الم ناک داستان کا خاتمہ ہو جائے۔ سرخ سرخ گرم گرم لہو ابل ابل کر اسے لحہ بہ لحہ موت کے قریب لے جاتا رہا۔ اہل کار شاید بالکل ہی غافل تھے۔ جب اس کی باری آئی، تو وہ اگلے سفر کی تیاریوں میں تھی۔

انھوں نے اسے فوری طبی امداد پہنچائی اور دمشق منتقل کر دیا۔ راستے میں وہ بے ہوشی میں ہی چلانے لگی، اسے لگا کہ گاڑی میں اس کا ماموں زاد اور اس کے دوست بھی بیٹھے ہیں اور اہل کار ان سب کو پھانسی گھاٹ کی جانب لے جا رہے ہیں، اسے اتنا شدید صدمہ پہنچا کہ اس کی قوتِ گویائی سلب ہوگئی اور وہ اپنے اردگرد سے بالکل لاتعلق ہوگئی، اہل کاروں نے اسے اس کا ڈرامہ قرار دیا اور ایک ماہ اسے قیدِ تنہائی میں رکھنے اور تعذیب دینے کے بعد بھی جب اس کی حالت میں تبدیلی نہ آئی تو اسے ہمارے پاس بلاک میں بھیج دیا۔

## اولاد میرا دل جلا رہی ہے

حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے اور ہمارا بلاک جس میں پہلے ہی گنجائش نہ تھی، نئی آنے والیوں سے ٹھنستا چلا گیا۔ ام محمود حلیمہ الحاجہ ریاض کے بعد آئی تھیں۔ وہ ۳۵ برس کی ایک دیہاتی خاتون تھیں۔ حلب کے قرب میں رہتی تھیں، ان کا شوہر قریبی گاؤں حیان میں کام کرتا تھا۔ یہ بہت پاکیزہ خیال اور سلجھی ہوئی خاتون تھیں، انھوں نے اپنے گھر میں ان نوجوانوں کو چھپا رکھا تھا جنھیں حکومت تلاش کر رہی تھی۔ خفیہ والوں نے چھاپا مارا تو ام محمود کے شوہر کو بھی پکڑ لیا، لیکن وہ پھر بھی القاعدہ کے ٹھکانے کا پتا نہ لگا سکے۔ یوں وہ ام محمود کے گھر میں ڈیرہ ڈال کر بیٹھ گئے جبکہ ان کے بچے بھی وہاں موجود تھے۔ محاصرے کی شدت سے تنگ آ کر اخوان نوجوان باہر نکلے اور خفیہ والوں سے دو بدو مقابلہ کیا اور ان سب کو قتل کر کے فرار ہو گئے۔ اس مسکین خاتون کے پاس اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ وہاں سے بھاگ جائے۔ سو وہ اپنے بچے لے کر آدھی رات کو ساتھ والی بستی میں چلی گئی۔ اس کے پاس اس کے سوا چارہ بھی نہ تھا۔ خفیہ والوں کو اس رسوائی کی خبر ہوئی، تو وہ ان کی بو سونگھتے وہاں بھی پہنچ گئے اور انھیں ان کے بچوں سمیت القاعدہ کی مدد اور اہل کاروں کے قتل میں معاونت کے جرم میں گرفتار کر لیا۔ انھیں حلب میں امن سیاسی کے تفتیشی دفتر میں لے گئے۔ ان پر اس قدر تشدد کیا کہ ایک ہاتھ توڑ دیا اور اب تک وہ اسے طبی

انداز میں حرکت نہ دے سکتی تھیں، انھوں نے ان کی ناک کی ہڈی بھی توڑ ڈالی۔ تین ماہ کی تعذیب کے بعد وہ انھیں کفر السوسہ لے آئے اور نئے سرے سے تعذیب کی بھٹی میں پگھلانے لگے۔ انھوں نے اپنے شوہر کے کام سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ گمان غالب یہی ہے کہ ان کے شوہر کو عدم کی راہ دکھا دی گئی تھی۔ وہ اپنے پانچ بچوں جن کی عمریں چار سے نو برس کے درمیان تھیں اور بوڑھے والدین کے ہمراہ مصائب برداشت کرنے کو تنہا رہ گئی تھیں، یہ احساس انھیں بہت تکلیف دیتا اور وہ بڑی رقت سے کہتیں:

اولاد کی محبت میں میرا سینہ جل رہا ہے۔

وہ باقی عورتوں کی طرح روتی نہ تھیں، بس ان کی آنکھیں بہتی رہتی تھیں۔ ام محمود ۱۹۸۴ء میں قطنا کی جیل سے رہا ہوئیں۔

## جاسوس، ایجنٹ اور یرغمالی

ایک روز بلاک میں اسرائیل کے حق میں جاسوسی کے الزام میں دو عیسائی بہنوں کو لایا گیا۔ چھوٹی کا نام جورجیٹ تھا جسے وہ کبھی ماریٹ کہہ کر بلاتے، یہ لگ بھگ پینتیس برس کی تھی، اس کا شوہر القرادح کا علوی تھا، اس کا نام زہیر تھا اور وہ اپنے نیٹ ورک کا سربراہ تھا۔ بڑی بہن ام جورج ساٹھ کی دہائی میں تھی، اس کا شوہر بھی علوی تھا اور محکمہ پولیس میں اسسٹنٹ تھا۔ اس کے باوجود کہ انھوں نے ہمارے ساتھ طویل قید کاٹی، ہمیں ان کے حالات کا صحیح علم نہ ہو سکا، کیونکہ وہ کبھی کھل کر اپنے بارے میں بات نہ کرتیں۔ ہمیں بعض دوسرے ذرائع سے اس کے سوا کچھ نہ پتا چل سکا کہ یہ دونوں اور ماریٹ کا شوہر اکٹھے ہی پکڑے گئے اور اس کے بعد بڑی تعداد میں ان کے نیٹ ورک کے افراد پکڑ لیے گئے۔ شروع میں وہ ہر روز ہی ماریٹ کو تفتیش کے لیے لے جاتے اور سارا دن فرع کے در و دیوار اس کی دردناک چیخوں سے لرزتے رہتے اور جب وہ واپس آتی تو ایسے لگتا کہ اس کے آخری سانس چل رہے ہوں، ڈاکٹر عائشہ فوراً ہی اس کی

نگہداشت کے لیے اٹھ کھڑی ہوتیں۔ وہ اس کے نیلے پیروں کو نیم گرم پانی سے دھوتیں، اس کے زخم صاف کرتیں اور لڑکیوں کے دوپٹے پھاڑ کر اس کی پٹیاں کرتیں اور پوری جان فشانی سے اس کے جسم کا ''مساج'' کرتیں اور جوں ہی اس کی تکلیف میں کچھ کمی ہوتی، وہ چھلاوے کی طرح بھاگ کھڑی ہوتی اور دوسری مارکسی لڑکیوں کے ساتھ تاش کھیلنے لگتی تھی۔ اس طرح مستغرق ہو کر تاش کے پتے پھینکتی گویا اسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ایک بار الحاجہ مدیحہ اسے کہنے لگیں:

تھوڑی دیر پہلے کس طرح تم چیخ چیخ کر ہلکان ہو رہی تھی اور اب کھیل میں مگن ہو؟

وہ بولی: میں دونوں جانب مگن ہو کر فائدے میں رہتی ہوں۔

شروع میں تو دونوں ہی کچھ نہ بتاتیں مگر جب ہم اور وہ قطنا کی جیل میں منتقل ہوئے تو ایک روز ام جورج نے اپنی بہن کو خوب کوسنے دیے اور ان سب آفات کا سبب اسے اور اس کے شوہر کو قرار دیا اور اس نے اسے بددعا دی کہ اللہ اس کی قبر کو آگ سے بھر دے۔ قطنا ہی سے انھوں نے ان دونوں کو سجن المزہ میں منتقل کر دیا، جہاں انھوں نے ماریٹ کو تو پھانسی کی سزا دے دی، مگر ام جورج کو وہ دوبارہ قطنا لے آئے اور وہیں پر ہم نے لبنان ریڈیو سے اس کے شوہر کی پھانسی کی خبر سنی۔

## مرض کا علاج......گالیاں

جیل کے حالات ناگفتہ بہ تھے، مسلسل غذائی قلت اور قوت بخش خوراک کی کمی کے اثرات ہم پر نظر آنا شروع ہو گئے، ہم میں سے اکثر مختلف امراض کا شکار ہو گئیں۔ افسوس تو یہ تھا کہ جیل کے قانون میں درج مراعات سے بھی ہمیں محروم رکھا جاتا تھا۔ مجھے بھی اکثر قیدیوں کی مانند ''زنطاریہ'' کی تکلیف ہو گئی۔ شروع میں خون آنا شروع ہوا اور میرے معدے میں مستقل درد رہنے لگا۔ تکلیف اتنی بڑھ گئی کہ اجابت میں خون ہی خون نظر آتا اور میں کچھ بھی ہضم کرنے کے قابل نہ رہی۔ ڈاکٹر عائشہ نے جلد ہی میرے زخموں کی تشخیص کر لی اور باقی سب لڑکیاں اپنے

کھانے کا بہتر حصہ میرے لیے نکالنے لگیں، لیکن مناسب غذا نہ ملنے کے سبب میرے مرض میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور بے بسی دوچند ہوگئی۔ مرض اگلے مرحلے میں داخل ہوا تو ہم نے افسر کو علاج اور مناسب غذا کے لیے درخواست پیش کی۔ جواباً اس نے بھرپور عنایت کی اور مجھے بلوالیا۔ میری عرض داشت سننے کے بعد اس نے مجھے گالیوں سے بھرا ایک طویل لیکچر دیا جو میرے اور میرے "مجرم" بھائی کے بارے میں تھا اور پھر مجھے اسی مفلوک الحال جگہ واپس لوٹا دیا جہاں سے میں آئی تھی۔

ہم میں خون کی کمی اور دانتوں میں درد کا عارضہ بھی شدت اختیار کرگیا۔ ام شیما کی داڑھ میں کیڑا لگنے سے شدید درد ہوگیا، انھوں نے درد کم کرنے کی دوا مانگی تو کوئی جواب نہ ملا، وہ تکلیف کی شدت سے نڈھال منتیں کرتی رہیں مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ام شیما کی حالت بگڑتی رہی مگر اہل کاروں کے کان پر جوں نہ رینگی اور آخر میں جب پورے بلاک کی خواتین ان کی خاطر چیخیں چلائیں کہ وہ اس تکلیف سے مر رہی ہیں، تو وہ انھیں ڈاکٹر کے پاس لے جانے کو تیار ہوا، لیکن اس معاملے کو بھی مکمل راز میں رکھا گیا۔ ام شیما کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اور ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر، جیل کی مخصوص گاڑی میں نامعلوم ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا۔ وہ ڈاکٹر اس قدر سفاک تھا کہ اس نے بلا سُن کیے ان کی ڈاڑھ نکال دی۔ آپریشن کے دوران اتنا بڑا کٹ لگایا کہ ان کی مسوڑھے کی ہڈی تک کاٹ دی، واپس لوٹیں تو پہلے سے بھی برے حال میں تھیں اور اگلے کتنے ہی دن اسی تکلیف سے کراہتی رہیں۔

بلاک میں کئی لڑکیاں کیلشیم کی کمی کا شکار ہوگئیں۔ ان کے لیے سیدھے کھڑا ہونا مشکل ہوگیا، رغداء اسی سبب سے لڑکھڑا کر گری اور اس کا سر دیوار سے جا ٹکرایا۔ کئی لڑکیوں نے مل کر اسے اٹھایا۔ اس کے بعد ہم نے کسی طرح انڈے کی سفیدی کھانا شروع کردی۔ ہم اسے خوب پھینٹ لیتے اور تھوڑا تھوڑا کرکے بانٹ کر کھا لیتے تھے۔ اسی طرح ہم نے آلو کے چھلکے کھانا شروع کردیے۔ اہل کار بھی کبھی کبھار ہمیں الیکٹرک کیتل فراہم کردیتے، تو ہم چائے کی

استعمال شدہ پتی کو دوبارہ ابال کر قہوہ بنا کر پی لیتے تھے۔اس کے بعد ہم کبھی ان سے چولھا بھی مانگ لیتے اور کچھ اپنے طور پر پکا لیتے یا گرم کر لیتے تھے۔اسی طرح ہر ہفتے جب ہمارے بلاک کے لیے مرغی آتی تو ہم اس کے بازو ''ونگز'' ان سے مانگ لیتے اور وہ اس شرط پر ہمیں دے دیتے کہ ہم ان کو بھی بنا کر دیں گے اور جب ہم اسے بلاک کی چودہ قیدیوں میں تقسیم کرتے تو ہر ایک کے حصے میں چند ریشے گوشت ہی آتا، ہم اسے روٹی میں لپیٹ کر اس لذت کے احساس سے کھاتے گویا ہمارے سامنے پورا مرغ مسلم پڑا ہو۔

## من چاہی سزائیں

ان مشکلات اور سختیوں کے باوجود اگر ہم اپنی حالت کا مقابلہ نوجوان مرد قیدیوں سے کرتے تو وہ بالفعل جہنم میں رہ رہے تھے۔جب بلاک میں خواتین قیدیوں کی تعداد دس سے زیادہ ہو جاتی اور ہم دم گھٹنے کی شکایت کرتے اس وقت ان کے ایک ایک بلاک میں پچاس سے زیادہ گرفتارانِ بلا ہوتے اور انھیں دن میں بھی سانس لینا دشوار محسوس ہوتا اور رات کو سونے کے لیے پاؤں دیوار کے ساتھ اونچے کر کے صرف کمر زمین پر رکھ سوتے اور اس میں بھی انھیں اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا۔ان کے بلاک پر مستقل پہرا ہوتا اور کسی کو ہلکی سی آواز نکالنے کی بھی اجازت نہ ہوتی۔ان کے طاق کھلے رکھے جاتے اور اگر کوئی قیدی اپنے ساتھی سے سرگوشی کرتے ہوئے پکڑا جاتا اسے عقوبت کا سامنا کرنا پڑتا اور اس کی مقدار کا تعین ڈیوٹی پر موجود اہل کار کے موڈ پر ہوتا۔گالیاں اور ڈانٹ پھٹکار ہلکی سزا شمار ہوتی اور یہ بھی ہوتا کہ آدھی رات کو اسے ٹکٹکی پر لٹکا دیا جاتا۔ڈیوٹی اہل کار احکامات دہراتا رہتا: اب سو جاؤ، اب اٹھ جاؤ۔اب کھانو۔اب ''خط'' میں جانے کا وقت ہے اور کچھ وقت گزرنے کے بعد ان کو اتنی سہولت مل گئی کہ وہ اکٹھے نماز بھی پڑھنے لگے اور جہری نمازوں کی آواز ہمارے بلاک تک بھی آنے لگی اور بعض اوقات الخلیہ مدیحہ بھی انھیں کی اقتدا میں نماز پڑھ لیتیں۔جیل کے اہل کاروں کو اس کی بھی خبر ہو گئی مگر

انھوں نے کوئی طوفان کھڑا نہ کیا۔ ایک دفعہ جب وہ نوجوانوں کو لائن سے واپس لے جا رہے تھے ایک نوجوان نے دوبارہ وہاں جانے کی اجازت چاہی۔ اس کا جواب اسے گالیوں اور مغلظات کی صورت میں ملا۔ نوجوان واقعی مجبور تھا، وہ منتیں کرنے لگا، لیکن اہل کار ڈٹا رہا، بلکہ اسے مار مار کر آگے لے جانے لگا۔ الحاجہ مدیحہ نے دروازہ بجایا اور زور سے بولیں:

یہ کیا طریقہ ہے؟ بخدا کیا کافرانہ انداز ہے، وہ تم سے بیت الخلا میں جانے کی اجازت مانگ رہا ہے اور آپ حضرت جو خود ایک دن میں بیس بیس مرتبہ حمام میں جاتے ہیں، اس کے لیے اکڑے کھڑے ہیں۔ کیا یہ بھی آدم کی اولاد نہیں ہے۔

نوجوانوں کو غسل کے لیے نکالا جاتا تو یہ بھی کسی عذاب سے کم نہ تھا۔ انھیں باری باری غسل خانوں میں بھیجا جاتا اور دروازے پر زنجیر مارنے کا مطلب تھا کہ اب باہر نکل آؤ اور خاص طور پر اگر یاسین ڈیوٹی پر ہوتا تو اس کا مطلب تھا ہر حال میں فوراً باہر، وہ مسکین اندر جاتے اور ابھی کپڑے بھی نہ اتار پاتے کہ واپسی کا بگل بج جاتا اور اکثر قیدی اپنی پیٹھوں کو کوڑوں سے بچانے کے لیے صفائی کا اہتمام کیے بنا ہی باہر نکل پڑتے تھے۔

ان کے لیے حجامت بنوانا بھی ایک معرکے سے کم نہ تھا۔ حجام استرا پکڑ کر ایک کرسی پر بیٹھ جاتا اور قیدی گھٹنوں کے بل جھکے اس کے آگے آتے جاتے اور وہ نہایت لاپروائی سے ان کے سروں پر استرا چلاتا جاتا۔ نہ وہ کسی کے زخم کی پروا کرتا نہ کھال ادھڑنے کی یا اس بات کی کہ اس کا استرا کسی کی آنکھ، کان یا گردن پر نہ لگ جائے اور نوجوان اس کی کارگزاری پر سسک بھی نہ سکتا، کیونکہ اس کے معنی اسے غصہ دلانے کے تھے اور وہ غصے میں کچھ بھی کر سکتا تھا۔ ہم اللہ کا شکر ادا کرتیں کہ ہم حجام کے استرے سے دور تھیں، لیکن پانی کی قلت اور صفائی کے لیے مناسب اشیاء نہ ہونے کے باعث ہم بھی گندے رہنے پر مجبور تھے۔ گیزر اتنا چھوٹا تھا کہ ایک قیدی کے غسل سے سارا گرم پانی ختم ہو جاتا، کپڑوں کی کمی بھی صفائی میں رکاوٹ پیدا کرتی اور یوں ہم بھی کئی کئی روز صفائی کا اہتمام نہ کر پاتے تھے۔ ہم میں کئی ایسی خواتین بھی تھیں جن کے پاس

صرف ایک جوڑا کپڑے ہی تھے، وہ غسل خانے میں انھیں دھو کر سوکھنے کا انتظار کرتیں۔ کپڑوں کو بلاک کی رسی پر پھیلایا جاتا (اور گیلے کپڑوں کی سیلن بلاک کے حبس کو دوچند کر دیتی اور اس کے قطرے ہمارے اوپر پڑتے رہتے) اور سوکھنے کے بعد ہی وہ انھیں پہن کر باہر نکلتیں، لیکن ہمارے پاس صبر کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

## خون، کھٹمل اور ٹی۔ بی

جیل کے قواعد کے تحت امن بلاک کی جانب سے ہفتہ وار تفتیش ہوتی۔ ابراہیم اپنی باری پر کھڑکی پر زور سے ہاتھ مارتا اور ان کی سلاخوں کو چیک کرتا کہ وہ اسی طرح موجود ہیں، الحاجہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا اور وہ زور سے کہتیں:

تمھارا کیا خیال ہے کہ ہم نے اسے کیا کیا ہوگا؟ ہم عورتیں اسے اکھاڑ کر فرار ہو سکتی ہیں؟

وہ سرد مہری سے کہتا: یہی احکامات ہیں اور ہمیں انھیں نافذ کرنا ہے۔

لیکن ہمارے تنگ ہونے کی فقط یہی ایک وجہ نہ تھی۔ ایک روز کمبلوں کی جانچ پڑتال ہوتی۔ صحتِ عامہ کی حفاظت کے پیش نظر جیسا کہ بظاہر بیان کیا جاتا یہ دن بھی ہمارے لیے عذاب اور سزا کا ہوتا۔ وہ سارے بلاک کے کمبل اکٹھے کر کے لے جاتے اور پھر نہ جانے کیا کرتے کہ جب واپس لائے جاتے تو وہ بھیگے ہوتے اور ان سے اٹھنے والی بدبو سے بلاک سڑ جاتا اور ہمیں اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا۔ یہ معاملہ اس وقت شدت اختیار کر گیا جب بلاک میں ہر طرح کی بیماریاں پھیلنے لگیں اور ہر جانب کیڑے مکوڑے رینگتے نظر آنے لگے۔ ہماری آمد کے دو ماہ بعد ہی تمام قیدیوں کے سروں میں جوئیں اور کمبلوں میں کھٹمل بھر گئے۔ ایک روز انھوں نے بلا کوئی حفاظتی تدبیر کیے دوا چھڑک دی جس سے ہمیں قے آنا شروع ہوگئی اور کئی گھنٹے تک ہمارا سانس درست نہ ہوا۔ اس سب کے باوجود ہمارا حال قیدی جوانوں سے بہت بہتر تھا، جنھیں وہ ایک ایک کر کے جیل کی سلاخوں کے پاس بلاتے اور ان کے سر میں کھٹمل مار دوائی انڈیل دیتے۔

تقریباً ایک سال میں اس پرعذاب ماحول، سادہ صحت بخش اور مقوی غذاؤں کی قلت نے مسکین قیدیوں کی اچھی خاصی تعداد کو تپ دق کے مرض کا شکار کر دیا۔ ہم آدھی رات کو ان کے کھانسی کے دوروں کی آواز سنتے اور صحن میں جاتے ہوئے ہم ان کے لرزیدہ جسموں کو دیکھتے۔ جو ایک دوسرے سے سہارا لیے ہوئے بمشکل چل رہے ہوتے یا ان میں سے بعض کو اٹھا کر حمام میں داخل کیا جاتا۔ ایک روز جبکہ میں اپنی باری پر مطبخ صاف کر کے کوڑا پھینکنے آگے بڑھی، ابراہیم دروازہ کھول کر میرے پاس مطبخ میں آگیا، اس کے ہاتھ میں چاقو تھا اور بلا سبب وہ مجھے کہنے لگا:

خدا کی قسم میں اسے تمھارے سینے میں اتار دوں تو ٹھیک ہوگا۔

لیکن میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا اور اندر چلی گئی، اچانک حسین ادھر آ گیا، اس کے ہاتھ میں کھانے کا طشت تھا جو خون سے بھرا ہوا تھا، وہ مجھے دیکھے بنا ابراہیم سے کہنے لگا:

سید مر گیا۔

ابراہیم بولا: جہنم میں جائے۔ ابھی قید تنہائی کے سیل کا دروازہ بند کر دو۔ پھر سوچتے ہیں کہ کیا کرنا ہے۔

میں نے بلاک میں واپس آنے کے کچھ دیر بعد طاق میں سے دیکھا تو وہ ایک نوجوان کی میت کو قید تنہائی کے سیلوں کی جانب سے اٹھا کر لا رہے تھے۔ میں نے باقی سب کو بتایا تو الحاجہ کہنے لگیں کہ انھوں نے کل دیکھا تھا کہ وہ ایک نوجوان کو بلاک سے قید تنہائی کے سیل کی جانب لے کر جا رہے تھے، وہ اس قدر کمزور ہو چکا تھا کہ چل بھی نہ سکتا تھا، اس لیے وہ اسے اٹھا کر لے گئے اور جب ہمیں ایک اہل کار نظر آیا تو الحاجہ نے اپنی عادت کے مطابق اس سے اس نوجوان کے بارے میں پوچھا۔ اس نے فقط اتنا کہا کہ وہ طبعی موت مرا ہے، تپ دق کے مرض سے۔

## بھیڑ اور قصاب

جہاں بیماروں کی صورتیں ذہن سے چپک جاتیں اور بھلائے نہ بھولتیں، وہاں تعذیب

اور تشدد کے بھی کچھ ایسے تکلیف دہ مناظر تھے جن کو بھلانا ممکن نہ تھا، خاص طور پر ان نوجوانوں کو
جو دوران تعذیب موت کو گلے لگا لیتے یا وہ نوجوان جن کے لیے موت اس الم اور عذاب میں
راحت کا نام تھا۔ اسی طرح ایک رات اچانک تمام روشنیاں گل کر دی گئیں اور انھوں نے سب
طاق بھی بند کر دیے۔ سٹریٹ لائٹ کی روشنی میں طاق کی درز سے ہم نے دیکھا، کہ وہ ایک
سوٹ پہنے ٹائی لگائے نوجوان کو اٹھائے ہوئے آئے اور اسے قید تنہائی کے سیل میں پھینک دیا۔
اس مرتبہ الحاجہ بھی انتہائی کوشش کے باوجود نہ جان پائیں کہ کیا ہوا ہے، لیکن گمان غالب یہی
ہے کہ وہ اسی رات تعذیب برداشت نہ کرتے ہوئے جان کی بازی ہار گیا۔ ایک دفعہ اور ہم نے
دیکھا کہ وہ ایک دیہاتی کو پکڑ لائے اور اسے برہنہ کر دیا۔ اہل کار دونوں جانب کھڑے ہو گئے
اور ڈنڈوں اور کوڑوں سے اس کی درگت بنانے لگے۔ وہ اسے ہینڈز اپ کروا کر کبھی ایک
جانب بھگاتے اور کبھی دوسری جانب۔ وہ کبھی تیزی سے بھاگتا اور کبھی سست پڑ جاتا؛ حتیٰ کہ وہ
بے ہوش ہو گیا۔ پھر وہ اسے اٹھا کر وہ غسل خانوں میں لے گئے۔ وہ کبھی اس کے سر پر ٹھنڈا
پانی ڈالتے اور کبھی تیز گرم۔ وہ مسکین بڑی بے بسی سے چیختا چلاتا رہا، کسی کو اس پر رحم نہ آیا، گویا وہ
بھیڑ بکری ہو، قصابوں کے بیچ میں۔

## بیوٹیشن اور ہسٹریا

حمات کے واقعات کے بعد جب کہ ہمیں ان کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا، ہمارے
ونگ میں تعذیب کا سلسلہ روز افزوں ہو گیا، حتیٰ کہ ہم جن تک اس کی محض چیخ و پکار ہی پہنچتی تھی،
اس کے ہول سے پناہ مانگنے لگے۔ الحاجہ مدیحہ نے ایک روز اہل کاروں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر
کہا کہ خدا کے لیے ہمیں یہاں سے کچھ فاصلے پر لے جاؤ، کیونکہ اب ہمارے اعصاب جواب
دے گئے ہیں اور جس قدر تعذیب کا سلسلہ بڑھ رہا تھا اسی قدر قربان ہونے والوں کی تعداد
بڑھ رہی تھی۔ آئے روز وہ ہمیں کسی میت کو کمبل میں یا کپڑے میں لپیٹ کرنا معلوم منزلوں کی

طرف لے جاتے ہوئے نظر آتے۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ ایک روز انھوں نے ان میں سے ایک مسکین کو کمرۂ تعذیب سے نکال کر ہمارے بلاک کے سامنے لا ڈالا، تا کہ اسے دوسری جگہ منتقل کر کے باقی کسر پوری کر سکیں۔ اس کا چہرہ اور بدن زخموں سے چور تھا، پیاس کی شدت سے اس کی زبان باہر نکلی ہوئی تھی اور جسم سے خون رس رہا تھا۔ وہ گڑگڑا کر پانی کا ایک گھونٹ مانگ رہا تھا، لیکن اسے جواب دینے والا کوئی نہ تھا۔ کچھ دیر بعد ہم نے کچھ پانی بلاک سے باہر زمین پر بہا دیا اور اس نے زمین سے چاٹ لیا۔

وحشیانہ تعذیب کے سبب کتنے ہی قیدی اعصابی اور ہسٹریائی امراض کا شکار ہو گئے۔ ان میں سے ایک کے قہقہوں کی آوازیں ہم قریبی بلاک سے سنا کرتیں، وہ جب روتا تو پورے بلاک پر اداسی چھا جاتی۔ اس کے نالے سن کر راتوں کی نینداڑ جاتی تھی۔ ایک روز ایک اہل کار پوچھنے لگا کہ اگر آپ کے پاس کوئی نیند آور دوا ہو تو ایک گولی دے دیں یہ گولیاں کبھی کبھار الحاجہ مدیحہ استعمال کرتی تھیں: کیونکہ دوران تعذیب انھیں بجلی کے کرنٹ لگائے گئے اور اس کے اثرات وہ اب تک محسوس کرتی تھیں انھوں نے مزاح کے انداز میں پوچھا:

آپ کو کیا ضرورت پڑ گئی۔ آپ میں کس کو ہسٹریا ہو گیا ہے؟

وہ بولا: ایک مریض ہے، اس کی ہسٹریائی چیخیں ہمیں بھی قلق میں مبتلا کر دیتی ہیں۔

ایسا ہی ایک واقعہ جو ذہن میں بالکل تازہ ہے، انھوں نے ایک روز ہمارے بلاک کا دروازہ کھٹکھٹایا اور پوچھنے لگے کہ اگر کسی کے پاس کاجل اور لپ اسٹک ہو تو دے دیں۔ الحاجہ نے حیرت سے کہا:

آپ کا کیا خیال ہے کہ ہم اپنے والد کی شادی میں آئے ہوئے ہیں، اس جگہ ہمارے پاس کاجل اور میک اپ کا سامان کہاں۔

اہل کار شرمندہ ہو کر بولا: میں نے سوچا شاید۔

پھر وہ چلا گیا۔تھوڑی ہی دیر میں وہ ایک نوجوان کو لے آئے اور اسے ہمارے بلاک کے سامنے کرسی پر بٹھا دیا، اس کے چہرے اور جسم پر تشدد کے واضح نشانات تھے۔انھوں نے اسے کرسی پر ہاتھ پاؤں باندھ کر جکڑ کر بٹھا دیا اور پھر وہ اس کے چہرے کا میک اپ کر کے اس کے زخموں کو چھپانے لگے۔الحاجہ بعد میں خبر لائیں کہ تھرڈ ڈگری استعمال کر کے اس سے کچھ اعترافات کروائے گئے ہیں۔اب وہ اسے ٹیلی وژن پر پیش کرنا چاہتے تھے، اس لیے اس کے زخموں کو چھپانا اور چہرے پر سرخی دکھانا مقصود تھا۔

## جیل کا صفایا یا صفائی

جیل کے عذابوں کی کتنی ہی صورتیں اور رنگ ہوتے ہیں۔جسم کے عذابوں کے زخم مندمل ہو ہی جاتے ہیں خواہ گھاؤ کتنے ہی گہرے ہوں، رہے روح کے عذاب اور اندر کا قلق تو اس سے چھٹکارا پانا آسان نہیں ہوتا۔ہماری آزادی کے قتل اور اتنی تکلیفوں کے بعد ہر آن رہائی کے خواب دیکھنا اور ہر کھٹکے سے آزادی کی پکار کی امید لگا بیٹھنا بالکل فطری امر تھا۔ظاہر ہے ہر ایک کی کیفیت مختلف ہوگی اور ان کی صلاحیتیں بھی مختلف ہوں گی، بالکل اسی طرح جیسے اس کشیدگی کی فضا میں جیل حکام اور اہل کار اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق ہمیں اذیت دے کر لطف لیتے تھے۔سب سے بڑھ کر ایک رئیس نوبۃ ابورامی مزے لیتا۔وہ اکثر جھوٹ گھڑ کر قیدیوں سے اپنا مطلب نکلواتا رہتا تھا۔وہ قیدیوں سے وعدہ کرتا کہ ان کی رہائی کا وقت قریب ہی ہے۔وہ اس کی بات کا یقین کر لیتے اور اس کے مطالبات مانتے، پھر اچانک اس کے جھوٹ کی قلعی کھل جاتی، کچھ دیر بعد وہ جھوٹ کا نیا جال بننا شروع کر دیتا، گویا وہ ان کا تمسخر اڑا رہا ہو، کسی نفسیاتی مریض کی مانند۔

الحاجہ ریاض کو کسی نے بتایا کہ جب ابورامی ''ٹرین کی سیٹی'' کہے تو یہ رہائی کی جانب اشارہ ہوتا ہے۔ایک روز وہ بلاک کی جانب آیا اور یہ کلمہ کہہ کر چلا گیا۔الحاجہ اپنا دل سنبھالتی تیزی سے

انھیں اور اسے آواز دے کر استفسار کرنے لگیں۔ وہ مسلسل سوال کر رہی تھیں مگر یہ جواب میں کچھ نہ بولا اور چلا گیا، انھوں نے کسی کو اسے بلانے کو کہا مگر وہ پھر بھی نہ آیا۔ کئی گھنٹے گزر گئے، الحاجہ کے اعصاب کھنچنے لگے، پھر وہ دوبارہ آیا اور کہنے لگا:

پکی خبر یہ ہے کہ کل بارہ بجے تک، لیکن رہائی سے پہلے تمھیں میرے لیے ایک سویٹر بنا ہوگا، اگر کہو تو میں اون اور دیگر سامان ابھی لا دیتا ہوں۔ رہائی سے قبل سویٹر تیار ہونا چاہیے۔ وہ بے چاری فوراً مان گئیں۔ پوری رات وہ اور الحاجہ مدیحہ سویٹر بنتی رہیں اور صبح ہونے تک سویٹر تقریباً مکمل ہو چکا تھا وہ سویٹر لینے آیا تو ایک سویٹر کی اون اور لے آیا اور ان دونوں سے کہنے لگا:

مجھے ایک اور سویٹر بنا دو مگر آستین بغیر۔ میں بارہ بجے لینے آجاؤں گا۔

وہ دونوں غریب پھر بننے بیٹھ گئیں اور اتنی مشقت کی کہ وقت سے پہلے وہ بھی بُن کر اسے بھجوا دی۔ پھر اپنا سامان اکٹھا کر کے اس کے انتظار میں بیٹھ گئیں اور بارہ بج گئے، مگر وہ نہ آیا۔ پھر شام ہوگئی اور سورج ڈھل گیا، پھر رات نے تاریکی کی چادر اوڑھ لی۔ نہ تو ابو رامی آیا، نہ ہی اس کی جانب سے کوئی معذرت۔ پھر ہمیں اس کا کھیل سمجھ آ گیا۔ الحاجہ ریاض اسے بددعائیں دینے لگیں اور اللہ سے شکایت کرنے لگیں۔ ان کی غم سے اتنی بری حالت تھی کہ لگتا تھا کہ وہ اس غم سے ہی مر جائیں گی۔

یہ کھیل جاری رہا، لیکن ہم جن آزمائشوں اور تکالیف میں تھے، ان میں ہم وہم سے بھی امید کشید کر لیتے تھے۔ ایک مرتبہ پھر انھوں نے ہم سے یہی کہا اور ہم سب سامان باندھ کر انتظار کرنے لگے۔ بارہ بجے تک ہم ہر آہٹ پر کان کھڑے کرتے رہے۔ لیکن بارہ کا ہندسہ آ کر گزر بھی گیا اور پورا دن ختم ہوگیا اور رات آ گئی مگر ہمیں رہائی کا پروانہ نہ ملا اور جب ہم نے پوچھا وہ کہنے لگے:

کچھ دیر مزید تاخیر ہوگی کیونکہ آپ کے پیپرز تیار ہو رہے ہیں۔ اگلے دن ظہر کا وقت ہوگیا،

لیکن بے نتیجہ۔ جب ہم نے دوبارہ وہی سوال دہرایا تو ایک اہل کار آ کر کہنے لگا:

خلاص...... کوئی رہائی نہیں۔ اخوان المسلمون نے دمشق میں ائرپورٹ پر حملہ کر دیا ہے اور سارا معاملہ چوپٹ کر دیا ہے۔ اب اخوان کے جرم کی سزا بھی تمھیں بھگتنا پڑے گی۔ وہ جو کچھ بھی کریں گے ہم ان کی قیمت تم ہی سے وصول کریں گے۔

اور نا معلوم رہائی کے اس جھوٹے قصے پر بھی رونا چاہیے یا ہنسنا، کہ اندر کی ایک خبر ''تبییض السجون'' (جیل کی صفائی) کے عنوان سے ہم تک پہنچی، جس کے معنی تھے کہ سب قیدیوں کو اکٹھے رہائی کا پروانہ مل جائے گا۔ الحاجہ ریاض نے شوق سے پوچھا: کب؟ تو جواب آیا: دو روز بعد۔ ہر طرف یہ خبر عام ہو گئی کہ ''تبییض'' سے مراد عام معافی اور رہائی ہے۔ دو دن بعد رہائی کا پروانہ تو نہ ملا، ہاں مزدور چونا اور پینٹ کا سامان اٹھائے جیل کو عملی طور پر صاف کرنے کے لیے سفیدی کرنے آ گئے اور بے گناہوں کے خون سے لتھڑی ہوئی دیواریں اور گزرگاہیں صاف ہونے لگیں۔ الحاجہ نے انھیں بڑی تلخی سے کہا:

کیا تمھارے نزدیک جیل اسی طرح صاف ہوتے ہیں اور یہی ''تبییض السجن'' ہے؟

جواب ملا: ہاں اب تو ہم نے عملاً اسے سفید کر دیا ہے (اپنے کرتوتوں پر ملمع چڑھا کر)۔

اگلے کئی روز الحاجہ اس نئے غم سے کڑھتی اور روتی رہیں۔ ان کے رونے میں اتنا درد تھا کہ ہم سب کے زخم کھل جاتے اور ہمارا حال ان سے مختلف نہ رہتا۔

## محکمہ میدانیہ

ہمیں قید ہوئے تقریباً آٹھ ماہ ہو چکے تھے جب اچانک ایک دن رغداء اور لمی کے نام پکارے گئے، ایک اہل کار آیا اور ان دونوں کو ساتھ لے گیا۔

ہمارا خیال تھا کہ ان کی ملاقات آئی ہے، لیکن دو گھنٹے گزر گئے مگر وہ واپس نہ لوٹیں۔

کچھ دیر بعد اہل کار آئے اور دو اور قیدیوں کو لے گئے اور جب وہ ساتویں کو لینے آئے اور کوئی بھی واپس نہ پلٹی، تو ہم نے اس سے کہا:

جب یہ تمھیں باہر لے جائیں اور وہاں ملاقاتی ہو تو تم کھانس دینا اور اگر کوئی اور معاملہ ہو تو خاموش رہنا۔

وہ اسے اوپری حصے سے دوسرے "قبو" (کوٹھڑی) کی جانب لے کر گئے اور وہاں سے دوسرے کمرے میں۔ ہم کان کھڑے کیے اس کی کھانسی کے منتظر رہے، لیکن اس نے کھانسی کے بجائے خاموشی اپنائی، تو ہمیں یقین ہو گیا کہ یہ کوئی اور معاملہ ہے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ ان ساتوں کو اکٹھا ہی لے آئے۔ ان کے چہرے مضطرب تھے اور رنگ پیلے ہو رہے تھے اور ان کے کانپتے ہونٹوں سے پہلی مرتبہ ہم نے "محکمہ میدانیہ" کا ذکر سنا۔

یہ ایک عدالت تھی جس کا سربراہ سلیمان حبیب پولیس افسر تھا، جس کے جسم پر کسی چمپیزی کی مانند بال تھے۔ دبلا پتلا، کوتاہ قامت، میز کے پیچھے کھڑا بمشکل نظر آتا۔ اس کے ساتھ چار پولیس اہل کار تھے، جو ہر لڑکی پر لگائے گئے الزامات بآوازِ بلند پڑھ کر سناتے اور اس سے اعتراف کرواتے اور اس سے دوبارہ ان الزامات کو دہرانے کے لیے کہتے تاکہ انھیں تسلی ہو جائے کہ اس نے یہ سب سن لیا ہے اور اس پر اس کے دستخط لے لیتے اور اسے بھیج دیتے۔ اس مقام پر انھیں کوئی تعذیب نہ کی جاتی صرف دھمکایا جاتا، انھوں نے جب ماجدہ کے سامنے سارے الزامات دہرائے اور اس کے اقرار کا ذکر کیا تو ماجدہ نے بتایا کہ اس سے یہ سب تعذیب کے نتیجے میں کہلوایا گیا تھا اور وہ مجرم نہیں، تو نقیب حبیب اسے کہنے لگا:

اگر تم سچ نہیں بولو گی تو میں تمھیں اس کھڑکی سے باہر پھینک دوں گا اور تمھیں پھانسی چڑھا دوں گا۔ تمھارا گلا گھونٹ دوں گا۔

پھر اگلے ہی روز انھوں نے اس کے پاس ناصیف نامی اہل کار کو بھجوا دیا جو اس سے کہنے لگا:

تم نے کل عدالت کے سامنے کہا ہے کہ تمھیں تعذیب کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ تمھیں کس نے ٹارچر کیا..... کیا تمھیں کسی نے مارا؟ کیا واقعی کسی نے تمھیں اذیت دی؟

وہ گھبرا کر بولی: ہاں۔

وہ دھمکاتے ہوئے بولا: کون..... اس کا نام بتاؤ؟

حالانکہ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ خود ناصیف نے اسے کس طرح تشدد کا نشانہ بنایا تھا، مگر وہ خوف اور اضطراب سے بولی: میں نہیں جانتی۔

وہ ڈھٹائی سے کہنے لگا: نہیں، نہ تو کسی نے تمھیں تعذیب دی نہ کسی نے ہاتھ لگایا، ہمارے ہاں تو کسی کو ہاتھ لگانا بھی ممنوع ہے لیکن تم جھوٹ بول رہی ہو۔ظاہر ہے تم نے خوف میں یہ سب کچھ کہا ہے۔تم کیوں اتنی خوف زدہ ہو؟

دھمکیاں ان تہمتوں سے کم نہ تھیں جس کا اظہار وہ بڑی چرب زبانی سے محکمے کے سربراہ اور ان کے اہل کاروں کے سامنے کر رہے تھے۔ ماجدہ نے ان کے سامنے صاف صاف بیان کر دیا کہ کس طرح اس کا تعلق ایک قیدی خالد محمود کے ساتھ جوڑا گیا ہے، تو رئیس المحکمہ چیخ کر بولا:

کیا یہ ضروری ہے کہ میں تمھیں بتاؤں کہ خالد محمود نے تمھارے پیروں کی رنگت کے بارے میں کیا کہا ہے

اور اس کے ساتھ ہی اہل کاروں کے فاجرانہ قہقہے بلند ہونے لگے اور وہ اس بے چاری کا مذاق اڑانے اور اسے طنز کے نشتر چبھونے لگے اور ماجدہ شرم کے مارے حواس کھونے لگی۔

اسی طرح الحاجہ ریاض جب محکمانہ کارروائی کے بعد لوٹیں تو بلک بلک کر رو رہی تھیں، ہم نے پوچھا تو وہ کہنے لگیں، کہ انھوں نے چلا کر ان سے کہا:

تم اس قید خانے میں ہی سڑو گی بالکل اصحاب کہف کی مانند۔

میرے ماں باپ تجھ پر قربان الحاجہ۔ سویرے تم بھی چلی جاؤ گی اور میں اکیلی ان دیواروں

سے ٹیک لگائے یہیں رہ جاؤں گی۔

ہالہ اس وقت تک اپنے مرض میں تھی، اسے کچھ معلوم نہ تھا کہ اس کے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔ اس کے باوجود اسے بھی دوسروں کی مانند محکمے میں پیش کیا گیا۔ وہ اسے کسی جانور کی مانند گھسیٹتے ہوئے لے جاتے اور جب وہ واپس آتی تو رہ گزر اور زینوں کی ساری گندگی اس کے کپڑوں پر لگی ہوتی اور وہ جگہ جگہ سے پھٹے ہوتے اور یہ شدید سردی کا موسم تھا۔

## شادی اور ملازمت کی پیش کش

جب ہم سات قیدیوں کی پیشی کا مرحلہ گزر گیا اور ایسا ہی معاملہ دوسرے قید خانوں میں بھی مکمل ہو گیا، تو دو ماہ بعد صرف اخوان سے متعلق قیدیوں کا دوبارہ محاکمہ شروع ہو گیا، جب مجھے محکمے میں پیش کیا تو انھوں نے باآوازِ بلند الزامات پڑھ کر سنائے اور اس کارروائی کے بعد نقیب مجھ سے پوچھنے لگا:

تمھارا مخلص قنوت سے کیا تعلق ہے؟

میں نے کہا: میں اسے نہیں جانتی۔

بولا: تمھارا اور اس کا تنظیمی ربط نہیں رہا؟

میں نے کہا: کبھی نہیں۔

پھر وہ پوچھنے لگا: لیکن اس نے اعتراف کیا ہے کہ وہ تمھیں جانتا ہے۔

میں نے کہا: یہ درست نہیں۔

اور واقعی میں اس نوجوان کو نہ جانتی تھی اور نہ ہی میرا کبھی اس سے رابطہ ہوا تھا۔ اگر چہ وہ میرے بھائی کے دوستوں میں سے تھا اور یہ سب عبدالکریم رجب کے افترا کا نتیجہ تھا۔ فوراً ہی وہ ایک مسکین نوجوان کو سٹریچر پر ڈالے اندر لے آئے اور اسے زمین پر لٹا دیا۔ اسے گولی لگنے کے

واضح نشانات تھے، جو بھاگنے کی کوشش میں اس پر چلائی گئی تھی، رئیس المحکمہ اس سے پوچھنے لگا:

تم اس لڑکی کو جانتے ہو؟

وہ بولا: نہیں۔

پھر اس نے مجھ سے پوچھا: کیا تم اس شخص کو جانتی ہو؟

میں نے کہا: نہیں۔

جو شخص اسے لے کر آیا تھا وہ اس سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: خلاص۔ اسے یہاں سے لے جاؤ، اس کے خاتمے کا وقت آ گیا ہے۔

اور ایسا ہی میں نے اس کے بارے میں سنا۔ انھوں نے یہاں سے واپس جا کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کے جانے کے بعد نقیب دوبارہ میرے پاس آ کر پوچھنے لگا:

تو پھر تم اس الزام کو تسلیم نہیں کرتیں جو تم پر لگایا گیا ہے؟

میں نے کہا: نہیں۔

بولا: کیوں؟ کیا کسی نے تم سے یہ اعترافات کروانے کے لیے دباؤ ڈالا یا جبر کیا تھا؟

میں نے زور دے کر کہا: میں نے یہ سب کبھی نہیں کہا اور وہ مجھے قتل کر کے بھی مجھ سے یہ نہ کہلوا سکتے۔

وہ مصنوعی حیرت سے کہنے لگا: یعنی انھوں نے تمھیں عذاب دیا؟

میں نے کہا: ہاں انھوں نے مجھے بہت عذاب دیا، کیا آپ نہیں جانتے؟

بولا: نہیں، میں نہیں جانتا۔

اس نے اعلیٰ تفتیشی افسر ابو فارس کو آواز دے کر بلایا۔ یہ وہی شخص تھا جو مجھے بلاک سے لے کر آیا تھا، وہ اسے کہنے لگا:

سنو۔ اس کے لیے اور اس کی ساتھی ماجدہ کے لیے رحم کی اپیل کے لیے تیاری کرو۔

مجھے اس نے ایک ورق پر دستخط کر کے جانے کا اشارہ کیا، تاکہ میرا کیس لکھا جا سکے اور چار پانچ دن بعد مجھے اور ماجدہ کو الگ الگ دوسری لجنہ (کونسل) میں طلب کر لیا گیا۔ میں جب ان کے سامنے پیش ہوئی تو نقیب سلیمان نے کہا کہ میں اپنی زندگی کے بارے میں بیان کروں۔ میں نے عمومی انداز میں بیان کیا اور خاص طور پر ذکر کیا کہ یہ جھوٹ ہے کہ میں اخوان کی ناظمہ ہوں اور ان سب الزامات کا ان کو مسترد کرتی ہوں، اس پر وہ کہنے لگا:

ٹھیک ہے لیکن میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں: اگر اس کونسل کے ارکان میں سے کوئی تم سے شادی کرنا چاہے تو کیا تم مان جاؤ گی؟

میں نے فوراً کہا: نہیں۔

بولا: کیوں؟

میں نے ٹھہر ٹھہر کر جواب دیا: پہلی بات تو یہ ہے کہ میں اپنے گھر والوں کی خواہش اور رضامندی کے بغیر کبھی شادی نہیں کروں گی اور دوسرا یہ کہ میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔

دوسرا بولا: کوئی خاص وجہ؟

میں نے کہا: میں تعلیم مکمل کرنا چاہتی ہوں اور یہ معاملہ میرے سوچنے کا نہیں۔

وہ کمینگی سے بولا: اللہ کی قسم اگر ابھی ان نیچے والوں (مراد سیلوں میں قید اخوانی قیدی نوجوان) میں سے تمھیں کوئی پیغام نکاح بھیجے، تو تم ہاتھ سے پہلے پاؤں سے بھی اسے ہاں کہہ دو گی۔

میں نے کہا: یہ بات درست نہیں۔

بولا: میں قسم کھا سکتا ہوں۔

پھر ہاتھ میں پکڑے ایک کویتی رسالے کی جانب اشارہ کر کے کہنے لگا:

دیکھو باہر اخوان تمھارے بارے میں کیا لکھ رہے ہیں۔ کویت اور عراق میں۔

مجھے تو اس میں واقعی کچھ دکھائی نہ دیا، لیکن وہ خود ہی پڑھنے لگا، ہبہ اور اس کا شوہر اور بچے شام کے قید خانوں میں ہیں اور ماجدہ اور اس کے بچے بھی اور اس کے شوہر کو شہید کر دیا گیا ہے اور اسی نوع کی دوسری مبالغہ آمیز خبریں۔ میں نے اسے کہا:

الحمدللہ میں یہاں ہوں، اب مجھے کیا معلوم کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔

یوں رحم کی اپیل کی مجلس اختتام پزیر ہوگئی۔ نہ تو مجھے یہ پتا چلا کہ ان الزامات کا کیا ہوا اور نہ ہی یہ کہ ان کے بارے میں کیا فیصلہ صادر کیا گیا۔ وہ مجھے واپس بلاک میں لے آئے اور تھوڑی دیر بعد ماجدہ کو لے گئے۔ وہ واپس آئی تو بنا کوئی بات کیے اپنے بستر پر بیٹھ گئی۔ وہ نجانے کن سوچوں میں گم تھی کہ اس نے کسی بات میں بھی حصہ نہ لیا۔ آدھی رات کو مجھے اپنے کان میں سرگوشی سنائی دی:

میں مزید اپنے اوپر قابو نہیں رکھ سکتی۔ اس بات سے میرے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے ہیں۔

میں نے پوچھا: کیا ہوا ہے؟

بولی: اللہ کا واسطہ ہے کسی سے کچھ نہ کہنا اور اگر پوچھے تو انکار کر دینا کہ تم نے کچھ سنا ہے۔

میں نے کہا: ان شاءاللہ خیر ہوگی۔

بولی: ابوفارس نے کہا ہے کہ وہ مجھے اس شرط پر رہا کرنے کو تیار ہے کہ میں ان کے ساتھ کام کرنے لگوں۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا جواب دوں، سو میں نے ان سے دو دن کی مہلت مانگ لی۔

میں اسے کیا کہتی، کیسے اسے تسلی یا کوئی مشورہ دیتی۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور محبت سے کہا: گھبراؤ نہیں، ان کا یقین مت کرو۔ وہ محض جھوٹ بک رہا ہے تاکہ تمھارا ردِعمل دیکھے۔ وہ تمھارے اعصاب سے کھیل رہا ہے۔ اس کا یقین مت کرو اور نہ ہی ان الزامات کی پروا کرو۔

اور واقعی کئی دن گزر گئے۔ اس سے دوبارہ کسی نے اس موضوع پر بات کی نہ ہی ابو فارس نے رابطہ کیا۔ اسے بھی پتا چل گیا کہ یہ محض ایک گھٹیا کھیل تھا اور ہم سب کو یقین ہو گیا کہ یہ لوگ وحشی جانوروں سے بھی بڑھ کر سنگ دل ہیں اور ان کی حقیقی صورت گری کرنا انسان کے بس میں نہیں۔

## ہوا خوری

آٹھ مہینے بعد جب کہ مصائب بڑھ گئے تھے اور بلاک میں اتنی خواتین آ گئی تھیں کہ سانس لینا تک دشوار ہو گیا تھا، رات کو سونے کے لیے لیٹتے تو کندھے سے کندھا جڑا ہوتا۔ ہماری بار بار کی درخواستوں کے بعد ہمیں ہوا خوری کے لیے دس منٹ سے آدھے گھنٹے تک باہر صحن میں نکالا جانے لگا۔ ہر چند اس مقصد کے لیے جیل کی جنوبی سمت میں خاص طور پر صحن بنا ہوا تھا، جو سطح زمین سے چار پانچ سیڑھیاں نیچے تھا، تین یا چار اہل کار اپنی نگرانی میں ہمیں لے کر نیچے جاتے۔ اگر ہم اوپر دیکھتے تو سیمنٹ کی بلند و بالا دیواروں سے اوپر مختصر سا آسمان نظر آتا۔ جلد ہی ہمیں معلوم ہو گیا کہ ہمارے بعد اسی صحن میں ہوا خوری کے لیے نوجوان قیدیوں کو بھی لایا جاتا ہے۔ یوں ہمارا ان سے ایک بالواسطہ رابطہ ہو گیا۔ خاص طور پر جب الحاجہ ریاض نے ایک دیوار پر اپنے بھائی کے دستخط دیکھے تو انھیں معلوم ہو گیا کہ وہ بھی اسی جیل میں قید ہے۔ اسی طرح وہ دیواروں پر بعض اشارات لکھ دیتے۔ یہ جاننے کے لیے کہ ہماری جانب کون کون ہے، یا وہ پوچھتے: فلاں یہاں ہے؟ اور ہم اپنے علم کے مطابق جواب دے دیتے۔ ایک مرتبہ الحاجہ نے اپنے بھائی کے بارے میں پوچھا، تو انھوں نے لکھ دیا: نہیں۔ تو ہمیں معلوم ہو گیا کہ شاید اسے مار دیا گیا ہے۔ اسی طرح میں نے ان سے خالد محمود شیخ کے بارے میں پوچھا جس کے بارے میں وہ مجھ سے تفتیش کے دوران سوال کر رہے تھے۔ وہ میرے بھائی صفوان کے دوستوں میں سے تھا، تو انھوں نے لکھ دیا: نہیں۔ اس کے ساتھ ہی کھوپڑی اور دو ہڈیوں کا نشان

بھی بنا ہوا تھا، میں جان گئی کہ اسے شہید کر دیا گیا ہے۔

ایک روز جب ہم وقتِ مقررہ میں چہل قدمی کر رہے تھے ہمیں نوجوانوں کے حمام سے ایک ہاتھ بار بار اٹھتا ہوا نظر آیا، جو ہلکا سا سر اوپر اٹھ کر پھر نیچے ہو جاتا۔ ہمیں معلوم ہوا کہ وہ نوجوانوں کے حمام کی کھڑکیاں ہیں۔ شاید کوئی نوجوان ہمیں متوجہ کرنا چاہ رہا تھا، تا کہ وہ ہم سے کوئی بات کرے لیکن عین وقت پر اہل کار اس جانب آ گیا۔ اس کے بعد ہمیں جب بھی یہ احساس ہوتا ہم میں سے ایک لڑکی اہل کار کو باتوں میں لگا لیتی اور دوسری نوجوان کی بات سن لیتی تھی۔ ابتدائی رابطے میں تو محض اپنے اہل محلہ اور اقارب کے بارے میں تبادلہ معلومات ہوتا کہ کس کا کون کون عورتوں یا مردوں کی جیل میں ہے۔ ایک روز اچانک انھوں نے اہل کاروں کی نظر بچا کر ہماری جانب سولیرہ پھینک دیے، ایک طالبہ نے اٹھا کر بلاک کے اجتماعی فنڈ میں رکھ لیے۔ دوبارہ انھوں نے دو سولیرہ دے دیے، لیکن تیسری مرتبہ عین وقت پر بھانڈا پھوٹ گیا اور ان مظلوم نوجوانوں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ اور پورے جنوبی حصے کو اہانت اور تعذیب میں وافر حصہ ملا، اس کے بعد کبھی انھوں نے اس کی جسارت نہ کی۔

## نئی ہڑتال

یہ حادثہ اپنی تمام تلخی کے باوجود نوجوانوں کے رابطے کا مکمل خاتمہ نہ کر سکا، کیونکہ یہ ایک نئے مرحلے کی ابتدا تھی۔ ہماری زندگی کا تمام جھکاؤ اسی جانب تھا۔ ایک روز جب ہم ہوا خوری کے بعد واپس لوٹ رہے تھے، ہم نے دو بچے دیکھے جو اجلے لباس میں تھے اور خوش حالی اور تونگری کا تاثر ان کے چہروں سے نمایاں تھا۔ ایک اہل کار سے معلوم ہوا کہ یہ افسر ناصیف کے بچے ہیں، جو شوق میں انھیں بھی یہاں لے آیا ہے، ہم ان کے قریب پہنچے تو بھائی بہن سے کہنے لگا:

آؤ۔ آ جاؤ قیدی خواتین آ رہی ہیں۔

انھیں دیکھتے ہی ام محمود حلیمہ کو اپنے بچے یاد آ گئے اور انھوں نے بے اختیار انھیں اپنے

ساتھ لپٹا لیا۔ وہ اسے اٹھانے لگیں تو بچہ ڈر کر بھاگ گیا۔ جب ہم بلاک واپس آئے تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں اور اس کے ساتھ ہی بلاک کی باقی مائیں بھی۔ ان کی آہ و بکا بڑھ گئی اور بلاک میں کوئی آنکھ خشک نہ رہی۔ ہم سب ان کے غم میں شریک تھے۔ اسی حال میں ہمیں سال ہونے کو آیا تھا اور ایک ہی سوال بار بار ہمارے سر میں ہتھوڑے برسا رہا تھا: آخر کب تک؟ اور ہم اسی نتیجے پر پہنچے کہ ہمیں ایک اور ہڑتال کرنا ہوگی، تاکہ ہم اپنے مطالبات منوائیں اور کسی حل تک پہنچیں۔ اس وقت عشاء کا وقت تھا جب ہم نے اپنا سارا جمع شدہ کھانا جو مختلف اوقات میں بچا کر رکھا تھا یا نوجوانوں کے ذریعے خفیہ طور پر ہمیں پہنچا تھا، ہم نے اسے باہم تقسیم کیا اور کھا لیا اور ہم نے ہڑتال کے عزم پر باقاعدہ معاہدہ کر لیا۔ جیل میں کھانا تقسیم ہونے آیا تو ہم میں سے کوئی بھی اسے لینے طاق کی جانب نہ بڑھا، اہل کار نے حیرت سے پوچھا:

تم لوگ جواب کیوں نہیں دے رہی؟

الحاجہ مدیحہ کہنے لگی: ہم کچھ کھانا پینا نہیں چاہتے۔

وہ حیرت سے عجیب لہجے میں بولا، اف خیر۔ خیر۔ ذرا پھر سوچ لو۔

وہ بولیں: ہمیں نہیں چاہیے۔ اپنا کھانا لے جاؤ۔ ہمیں تم سے کچھ نہیں چاہیے۔

اور طاق بند ہو گیا۔ اہل کار نے جا کر ابو عادل کو بتایا، وہ فوراً ہی بھاگتا آیا اور تیزی سے طاق کھول کر بولا:

کیا ہوا ہے..... خیر ہے؟

سب خاموش رہے، فقط الحاجہ بولیں: کچھ نہیں۔

اس نے پھر پوچھا: تم لوگوں نے کھانا کیوں نہیں لیا؟

اس نے اہل کار کو دروازہ کھولنے اور کھانا اندر رکھنے کو کہا، جب وہ رکھ چکا تو وہ بڑی سرد مہری سے بولا:

سنو کھانا کھالو اور اپنے نفس پر ظلم نہ کرو۔

پھر وہ چلا گیا۔ آدھ گھنٹے بعد دوبارہ اس نے طاق کھول کر دیکھا، کھانا جوں کا توں رکھا تھا۔

ابو عادل کھانا دیکھ کر غضبناک ہو گیا، اس نے اہل کار کو اشارہ کیا کہ وہ کھانا اٹھا لے جائے، جاتے ہوئے فقط اتنا کہا:

تم نہ کھانے میں آزاد ہو۔

اگلے روز وہ ناشتہ لائے تو ہم نے اسے بھی ہاتھ نہ لگایا، دوپہر کا کھانا بھی یوں ہی پڑا رہا۔ سارا دن اہل کار آ کر ہمیں قائل کرتے رہے:

یہ بصیرت نہیں۔ تم محض اپنے آپ کو تکلیف دے رہی ہو، تمھیں اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

ہماری ہڑتال تڑوانے والے کو اس کا معاوضہ بھی ملنا تھا، اسی لیے قسم جنوبی کا سربراہ ابو شادی بھی ہمیں قائل کرنے آیا۔ اس نے بڑے عمدہ انداز میں بات کا آغاز کیا، نرمی کا لبادہ اوڑھ کر۔ ہم نے بڑی صراحت سے کہہ دیا:

یا تو ہمارے گھر والوں کو ہم سے ملاقات کی اجازت دی جائے یا ہمیں یہاں سے نکال کر پھانسی دے دی جائے

وہ خوشامدانہ انداز میں کہنے لگا:

یقین رکھو اگر آپ کے گھر والے یہاں آئے تو ہم انھیں بے مراد واپس نہیں لوٹائیں گے، لیکن ان لوگوں نے تو مڑ کر تمھارے بارے میں پوچھا تک نہیں۔

ہم سب غصے سے بل کھا کر رہ گئے، لیکن ماجدہ بول اٹھی: کیونکہ ہمارے گھر والے یہاں آنے سے خوف زدہ ہیں۔ اس شاخ کا نام ہی ہول کھانے کے لیے کافی ہے۔

لیکن یہ گفتگو کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی اور اسی حال میں دوسرا دن بھی گزر گیا اور جب تیسرا دن چڑھا ان کے رویے بدلنے لگے اور معاملہ شدت اختیار کر گیا۔ رئیس نوبہ ابو رامی آیا اور بڑی سختی

سے بولا:

آجاؤ۔سب ہڑتالی باہر آجاؤ۔

اور اس نے اپنی نگرانی میں تمام مارکسی، مسیحی، حرکہ بعث عراق کی قیدیوں سمیت سب کو باہر نکال لیا۔ پھر وہ حیرت اور غضب سے ملے لہجے میں کہنے لگا:

واللہ کیا خوبصورت منظر ہے۔ ایشیائی وافریقی عالمین متحد کھڑے ہیں۔

وہ ہمیں ہانک کر کمرۂ تفتیش میں لے گیا، دواہل کار بلاک میں ہمارے سامان کی تلاشی لینے آگئے اور انھوں نے ہر ممکنہ چیز چھان ماری، ہمارے سامان میں انھیں کچھ خوراک کے سربمہر ڈبے مل گئے، جو نوجوانوں نے ہمیں بھجوائے تھے، انھوں نے منیرہ کے ذریعے تمام پیکٹ کھلوا کر اپنی نگرانی میں کوڑادان میں پھنکوادیے۔ جب کہ ایک اہل کار ہم سے بات کرنے لگا اور ہم سے ہمارے مطالبات پوچھنے لگا، ہم نے قطعی انداز میں کہا:

آپ بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم کیا چاہتے ہیں اور ہمارے مطالبات کیا ہیں اور ہم مزید بات نہیں کریں گے۔

اور بلاک کی تلاشی کے بعد وہ ہمیں واپس لے آئے۔ سزا کے طور پر انھوں نے ہمارا پانی بھی کاٹ ڈالا، ہماری حالت ایسی تھی کہ بھوک اور پیاس کی شدت ہمیں اندر سے کسی تیز چھری کی مانند کاٹ رہی تھی۔

## لہسن کے ایک جوے کے لیے

حقیقت یہ تھی کہ ہڑتال کے دوسرے روز ہی میری طاقت جواب دے گئی تھی اور اندر کے زخموں کے سبب مجھے اجابت میں خون آنا شروع ہوگیا۔ میں نے اور ماجدہ نے سلاخوں کے پیچھے سے ایک بیچنے والی سے کچھ انڈے خرید لیے تھے۔ وہ اسے بلاک میں لے آئی اور اللہ نے

ہمارا پردہ رکھا کہ کسی کی اس پر نظر نہ پڑی۔ ہالہ بھی بیمار تھی، اس نے بھی احتیاط سے کچھ نیڈو خشک دودھ اور چینی چھپا کر رکھی تھی اور آدھی رات کو ہم اسے گھول کر ایک ایک چمچ پی لیتے تھے تا کہ کچھ طاقت حاصل ہو جائے، ماجدہ اور ہالہ باہمی اتفاق سے میرے لیے دودھ اور انڈا فراہم کر دیتیں۔ یہ کام انتہائی رازداری سے کیا جاتا تا کہ ہڑتال توڑنے کی بھنک کسی کے کانوں میں نہ پڑ جائے اور ہمارے مشترکہ عزم میں کوئی کمی واقع نہ ہو جائے، کیونکہ اگر علانیہ طور پر کوئی ایک بھی ہڑتال توڑ دیتا تو سب کا عزم ٹوٹ جاتا اور ہم وہ مشترکہ مقصد بھی حاصل نہ کر پاتے، لیکن جب میری حالت بگڑ گئی تو ہالہ اور ماجدہ کو خفیہ طریقے سے کچھ اقدامات کرنا پڑے۔ وہ مجھے خشک دودھ کا چمچ چاٹنے کے لیے دے دیتیں اور ماجدہ گیزر کے ابلتے پانی میں انڈا رکھ دیتی اور کچھ دیر بعد میں غسل خانے میں جا کر اسے کھا لیتی اور چھلکے حمام میں ڈال دیتی۔

ایک روز بلاک میں اچانک لہسن کی بو پھیل گئی، سب ایک دوسرے سے سوال کرنے لگے، حتیٰ کہ جلد ہی ہمیں معلوم ہو گیا کہ کس کے منہ سے بو آ رہی ہے۔ اس سے پوچھ گچھ ہوئی تو اس نے صاف گوئی سے بتا دیا کہ اسے لہسن کا ایک جوا بستر پر گرا ہوا ملا تو اس نے اٹھا کر کھا لیا اور پھر تو اس ایک جوے پر ہی طوفان کھڑا ہو گیا لیکن ہڑتال برقرار رہی اور اس میں کوئی نرمی نہ آئی اور اس کو توڑنے میں اہل کاروں کی ترغیب کام آئی نہ دھونس اور دھمکی، اس کے باوجود کہ لڑکیوں کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہونے لگی اور کمزوری سے ان کی کمریں دوہری ہو رہی تھیں۔

## ہڑتالی لیڈر

ہڑتال چوتھے روز میں داخل ہو گئی۔ اچانک ابو عادل دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور کمینگی سے کہنے لگا:

ادھر آؤ۔ تم میں ہڑتالی لیڈر کون ہے؟

ہم نے کہا: کوئی نہیں۔

وہ چلایا: کسی نے تو تم میں سے کہا ہوگا کہ آؤ ہم ہڑتال کریں۔ وہ کون ہے؟

جواب میں جب کوئی نہ بولا تو وہ ہم سب کے چہروں پر اپنا جواب تلاش کرنے لگا، اس کی نظر ام شیما پر پڑی جو سب سے طویل قامت اور جسیم تھیں، وہ ان سے کہنے لگا:

آجاؤ۔ تم ہی ہڑتالی لیڈر ہو۔

الحاجہ گھبرا کر بولیں: تم انھیں کہاں لے جا رہے ہو؟

بولا: اپنے کیے کی سزا پانے۔

ماجدہ فوراً آگے بڑھی اور منت کے انداز میں بولی: نہیں۔ میں ہڑتالی لیڈر ہوں۔ تم ام شیماء کو کیوں لے جا رہے ہو؟

وہ بولا: کیونکہ اس کی شکل سے یہی لگا تھا، لیکن اب تم نے خود ہی اعتراف کر لیا ہے تو تم آجاؤ۔

مجھے اب تک یاد ہے کہ کس طرح اس غریب نے اپنے مہتری جوتے پہنے، اس نے سبز کپڑے پہنے ہوئے تھے جو اس آزمائش میں آ کر زرد ہو گئے تھے اور اس کا پتلون نما پاجامہ ایک جانب سے لٹک رہا تھا اور اس کے سر کا سکارف زمانے نے بوسیدہ کر دیا تھا۔ وہ جب کمرۂ تفتیش کے باہر اسی کوٹھڑی کے سامنے پہنچی اس نے اس سے دوبارہ پوچھا:

تو پھر تم ہی ہڑتالی لیڈر ہو؟

وہ بولی: نہیں۔

وہ غصّے سے بولا: پھر تم نے جھوٹ کیوں بولا؟

اس نے کہا: کیونکہ نہ تو ہم میں کوئی ہڑتالی لیڈر ہے نہ بلاک لیڈر۔ اس کے باوجود تم محض الزام تراشی کر کے ام شیما کو لے جا رہے تھے۔

وہ غصّے سے دانت پیستے ہوئے کہنے لگا: لیکن تم نے خود کو ام شیما کی جگہ پیش کیا ہے اور اب ان کی جگہ تعذیب بھی تمھیں ہی سہنی پڑے گی۔

وہ اسے زبردستی سٹول پر بٹھانے لگا اور اس کے چیخنے کی آوازیں آنے لگیں:

زبردستی کیوں ڈال رہے ہو؟ میں اپنی خود جواب دہ ہوں جب انھوں نے ماجدہ کا نہ کھانے کا اس قدر اصرار دیکھا تو وہ اسے واپس لے آئے اور اللہ کی رحمت سے اسے کوئی تار چہ نہ کیا۔

## ترغیب وترہیب

ماجدہ تو تشدد سے بچ گئی مگر وہ نوجوان جنھوں نے ہمارے ساتھ خیر سگالی کے طور پر ہڑتال میں حصہ لیا تھا ان کی بری طرح شامت آ گئی۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ جب دوسرے بلاکوں میں ہماری ہڑتال کی خبر پہنچی تو انھوں نے بھی ہڑتال کا اعلان کر دیا اور یوں پوری جیل حتیٰ کہ تجن جنوبی بھی ہمارے ساتھ اس میں شریک ہو گیا۔ حکام اس معاملے پر سرعت سے حرکت میں آ گئے اور ان کے ساتھ ہی جلادوں اور اہل کاروں کے ہاتھ بھی بڑی تیزی سے چلنے لگے، ٹلکلیاں لگائی گئیں اور کوئی بھی ہڑتالی اس سے بچ نہ سکا۔ یوں نوجوانوں نے مزید تعذیب سے بچنے کے لیے ہڑتال ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ چوتھے روز صبح صبح افسر ناصیف خود آ گیا اور ڈاکٹر عائشہ کو کمرۂ تفتیش میں لے گیا اور ایک روٹی اور پنیر اس کے سامنے رکھ کر بولا:

فوراً اسے میرے سامنے کھالو۔

عائشہ نے انکار کر دیا۔ تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ اسے گالیاں دیتے ہوئے کہنے لگا:

مجھے یقین ہے کہ تمھیں یہ ہدایات باہر سے مل رہی ہیں۔ تم لبنان کے معاملے میں حکومت پر دباؤ بڑھانے کے لیے اس معاملے کو استعمال کرنا چاہتی ہو۔

اس وقت ہمیں کچھ خبر نہ تھی کہ لبنان میں کیا ہو رہا ہے یا خود شام میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ہمارے ساتھ والے سیل میں کیا ہو رہا ہے۔ اس کا اصرار طول پکڑ گیا

اور دھمکیوں میں اضافہ ہو گیا تو ڈاکٹر عائشہ نے اس خوف سے کہ کہیں وہ دوبارہ تعذیب ہی شروع نہ کر دے پنیر کا ایک ٹکڑا اٹھا کر کھا لیا، جب وہ بلاک میں واپس لوٹی اور باقی طالبات کو اپنی بپتا سنائی تو پنیر کے اس ایک ٹکڑے کے سبب دوسری قیدیوں نے قیامت برپا کر دی۔ انھوں نے اس ایک لقمے کے سبب اس پر دُنیا تنگ کر دی۔ اگلی صبح افسر پھر آن موجود ہوا اور ایک ایک کر کے قیدیوں کو باہر نکالنا شروع کر کے غصّے سے ان کے منہ میں کھانا ٹھونسنا شروع کر دیا۔ وہ انکار ہی کرتی رہ گئیں۔ اگر وہ کسی کے منہ میں لقمہ ڈالنے میں کامیاب ہو جاتا تو وہ اسے چبانے اور نگلنے سے انکار کر دیتی۔ جب ہالہ کی باری آئی اور اس نے اس کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا۔ اور اس وقت تک وہ صحت مند ہو چکی تھی۔ اس نے اسے زمین پر پھینک دیا اور اسے اپنے پاؤں سے مسل ڈالا، اس نے اسے پاگلوں کی مانند تھپڑ رسید کیا اور کہنے لگا:

تمھیں تو اپنے کیے کی سزا ضرور ملے گی اور جو کچھ تم کر رہی ہو اس پر تمھیں محکمہ میدانیہ میں حاضر کیا جائے گا۔

اس کا اشارہ اس خط کی جانب تھا جو ہالہ نے اپنی ماں کے نام لکھا تھا اور ایک فلسطینی قیدی کے ذریعے بھجوانے کی کوشش کی تھی۔ بعد میں پتا چلا تھا کہ یہ سب افسر کو راز پہنچانے کی خاطر چال چلی گئی تھی۔ لیکن اس سب کے باوجود کسی نے کچھ نہ کھایا اور جب میری باری آئی تو اس نے مجھے باہر نہ نکالا، بلکہ میں اکیلی ہی بلاک میں رہ گئی۔ وہ سب واپس لوٹیں، تو ہم نے ایک مرتبہ پھر ہڑتال جاری رکھنے کا مصمم ارادہ کیا۔ اس ہڑتال کو کامیاب بنانا ہمارے لیے ایک چیلنج بن گیا تھا، اہل کار بار بار آ کر ہمیں نرمی سے سمجھانے لگے۔ کبھی وہ دھوکے سے اپنے جال میں پھنسانے کی کوشش کرتے۔ سب سے پہلے وہ ہمارے لیے پانی لائے، پھر سارا بلاک اتنے لذیذ اور خوشبودار کھانوں سے بھر گیا جن کا کبھی ہم نے خواب میں بھی تصور نہ کیا تھا کہ ہمیں اس جگہ مل سکتے ہیں۔ ہشم طبق میں کھویا نما گاڑھا دودھ لے کر آ حاضر ہوا جو ہم نے کبھی نہ پیا تھا اور دوسرا اعلیٰ قسم کی اتنی خوشبودار خوبانی اور تیسرا کوئی اور چیز۔ لیکن پیٹ میں چوہوں کے کھلبلی مچانے کے

باوجود ہم میں سے کسی نے کھانے کی جانب ہاتھ نہ بڑھایا۔ افسر اعلیٰ آیا تو سب مرغوب کھانے اسی طرح دھرے تھے۔ اپنی آخری تدبیر کو اس طرح ناکام ہوتے دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور اس کے منہ سے لعنت ملامت کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ اس نے ایک اہل کار کو تمام خوان واپس لے جانے کا اشارہ کیا، اس کی مغلظات کا نشانہ رب اور دین بھی بننے لگے۔ وہ زمین پر پاؤں پٹخنے لگا اور جو چیز سامنے نظر آئی اسے زمین اور دیواروں پر پٹخنے لگا۔ اس کا غصہ دیکھ کر لڑکیاں شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہو گئیں، ان کی پریشانی دو چند ہو گئی، کتنی ہی بے ہوش ہو کر گر پڑیں اور کچھ کو قے آنا شروع ہو گئی۔ ہم میں سے اکثر قیدی خون کی کمی کا شکار تھیں۔ ہم زمین پر گرے ہوئے تھے اور ہم میں اٹھنے کی سکت بھی نہ تھی۔ ہم نے کمبل اپنے پیٹ کے ساتھ چپکا رکھے تھے تاکہ بھوک کی شدت پر کچھ قابو پا سکیں اور ہمارا حال یہ ہو گیا کہ ہم نماز بھی اشارے سے ادا کرنے لگیں۔ اس پورے ڈرامے کے بعد جب ہم خود اپنے کنٹرول میں بھی نہ رہے تھے، ابو شادی آیا اور اجڈ دیہاتی لہجے میں کہنے لگا:

اٹھو اور بتاؤ کہ تمھارے مطالبات کیا ہیں۔

ہم سب بلا حرکت زمین پر لیٹے رہے اور رغداء وہیں لیٹے لیٹے بولی:

میں چاہتی ہوں کہ جب ہم مر جائیں تو ہم سب کو ایک قبر میں دفنا دینا۔

وہ تمسخرانہ انداز میں بولا: تمھارا مطالبہ سر آنکھوں پر، لیکن کیا تمھارا اس کے علاوہ بھی کوئی مطالبہ ہے؟

ماجدہ بولی: میں مرنے سے پہلے اپنے والد کو دیکھنا چاہتی ہوں، خواہ صرف دو گھڑیوں کے لیے ہی کیوں نہ ہو۔

وہ اس سے پوچھنے لگا: وہ کیوں؟

بولی: تاکہ میں ان کے ہاتھ چوم لوں اور بس ان کی رضا حاصل کر لوں۔

وہ اسی مسخرے پن سے بولا: بخدا تمھاری سوچ کس قدر مریضانہ ہے اگر تم مریض نہ ہوتیں تو یہاں نہ ہوتیں۔

اس نے دھڑ سے دروازہ بند کیا اور چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا، تو اس کے ہمراہ کئی تابوت نما صندوق اور خواتین کے رومال نما کپڑے تھے۔ الحاجہ اپنی حیرت چھپا نہ سکیں اور پوچھ بیٹھیں:

آپ کیا کررہے ہیں؟۔ آپ ہمارے لیے یہ صندوق کس لیے لائے ہیں؟

بولا: کیا تمھارا ابھی مطالبہ نہ تھا؟ ذرا دیکھو ہم کس طرح تمھارے مطالبے ابھی پورے کرتے ہیں۔

ہم سب غصّے سے دانت پیس کر رہ گئے۔ الحاجہ زور سے بولیں: کیا؟ ہم جب سے اس بلاک میں آئے ہیں اول روز سے ہمارا کوئی مطالبہ منظور نہیں کیا گیا، نہ ہی پلٹ کر ہمیں کوئی جواب دیا گیا ہے اور فقط اب......!

بولا: مجھے تو آج ہی آپکے مطالبے کی خبر پہنچی ہے

ہم سب انتہائی اکتاہٹ سے یکبارگی بولے:

خلاص۔ نہ ہمیں آپ کی ضرورت ہے نہ آپ کی کسی چیز کی۔ بس اس دروازے کو بند کر دو تاکہ ہمارا آخری وقت آسانی سے کٹ جائے اور جب ہم مرجائیں پھر جو چاہو کر لینا۔

وہ دھمکاتے ہوئے نہایت کمینگی سے بولا: نہیں۔ اطمینان رکھو، تمھیں یوں موت نہیں آئے گی۔ تمھاری کسی بلی کی مانند سات روحیں ہوں گی۔

وہ سارا دن تھوڑی تھوڑی دیر بعد چکر لگاتا رہا اور نہایت بھدے اور بیوقوفانہ انداز میں کوشش کرتا رہا کہ کسی طرح ہماری ہڑتال تڑوا کر انعام کا مستحق بن جائے۔ حتیٰ کہ ہمیں بھوک سے بھی بڑھ کر اس سے اکتاہٹ ہونے لگی اور اس کے بار بار مختلف چیزیں پیش کرنے اور ہمارے انکار سے ہماری تھکاوٹ اور کمزوری دوچند ہوگئی۔

## نامعلوم مقام کی جانب نیا سفر

ہڑتال جاری رہی اور ساتویں روز میں داخل ہوگئی۔علی الصبح اچانک ہی بلاک کا دروازہ لوہے کی زنجیروں اور ہتھکڑیوں کی جھنکار سے بج اٹھا، ہماری آنکھیں پتھرا گئیں اور ہم ڈرتے ڈرتے اٹھ بیٹھے۔ میں اس وقت حمام میں تھی، میں نے ابوطلال کو اپنا نام پکارتے ہوئے سنا جو ان زنجیروں کے ساز میں بھی صاف طور پر سنائی دیا۔اس نے دو تین مرتبہ میرا نام لے کر کہا:

فوراً آجاؤ۔فوراً۔

مجھے ایسا لگا جیسے میں واقعی موت کے پھندے کے سامنے کھڑی ہوں یا وہ مجھے اسی جانب ہانک کر لے جانے کے لیے آیا ہے۔ میں خوف سے اسی جگہ بیٹھ گئی۔ نہ تو مجھ میں جواب دینے کی طاقت تھی نہ اٹھنے کی سکت۔ میں اٹھ کر کرتی بھی کیا۔لڑکیوں نے آکر مجھے اٹھایا اور اس کے سامنے لا حاضر کیا۔میں نے نیم بے ہوشی میں اس کی جانب دیکھا اور اس نے آگے بڑھ کر ہتھکڑی میرے ہاتھ میں لگا دی۔الحاجہ نے پکار کر کہا:

فقط یہی؟ ہمیں بھی اس کے ساتھ لے جاؤ۔کیا موت کا پھندا صرف اسی کا مقدر ہے ہم سب اسی کی اہل ہیں۔آؤ ہم سب کو لے جاؤ تاکہ اس زندگی سے ہماری جان چھوٹے۔

تاہم وہ ان کی جانب متوجہ نہ ہوا اور باری باری ہمارے نام پکارنے لگا اور باہر نکال کر سب کے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگانے لگا۔جب دوسری تنظیموں کی قیدیوں کے نام نہ پکارے گئے تو وہ بھی باہر نکل کر پکارنے لگیں اور منیرہ چیخ کر بولی:

رکو۔ہم بھی ان کے ساتھ جانا چاہتی ہیں۔

وہ غضب ناک ہو کر دھاڑا اور پوری قوت سے اسے اندر کی جانب دھکیلنے لگا۔ٹھک کی زوردار آواز آئی اور منیرہ الٹ کر نیچے گری۔باقی سب کو بھی اسی سختی سے واپس بلاک میں لوٹا دیا گیا۔ پھر وہ ہمیں لے کر امانات کے دفتر میں گیا اور ہماری چیزیں ہمارے حوالے کیں، اسی لمحے الحاجہ

پر انکشاف ہوا کہ ان کی آمد کے موقعے پر جو سونا ان سے لے کر امانات کے دفتر میں رکھا گیا تھا وہ چوری ہو چکا ہے اور ان کی منت سماجت اور اصرار کے باوجود ان میں سے کوئی چیز واپس نہ مل سکی۔ ابو طلال ہمیں لے کر شاخ کے صحن میں آ گیا، میں سب سے آگے تھی، اس نے مجھے زور سے جھٹکا دیا اور بولا:

ادھر رک جاؤ۔

میں نے دیکھا کہ میں صحن کے بیچ میں کھڑی ہوں اور ڈھیروں اہل کار میرے اردگرد کھڑے ہیں، افسرِ اعلیٰ ناصیف اوپر اپنے دفتر کی کھڑکی میں کھڑا جھانک رہا تھا۔ ابو طلال نے میرے سر پر چپت مار کر کہا:

اپنا سر اوپر کرو۔

میں نے کہا: میں سر اوپر نہیں کرنا چاہتی۔

بولا: میں ابھی تمھارا حجاب اتار دوں گا۔

میں نے کہا: جو چاہو کرو۔

بولا: شاید تمھیں اندازہ نہیں ہے کہ تمھارے گرد کتنے اہل کار کھڑے ہیں؟ اگر اب بھی تم نے ہڑتال نہ توڑی تو میں تمھیں ان سب کے سامنے رسوا کر ڈالوں گا۔

میں نے کہا: جو چاہے کرو۔ جو کچھ تم کر چکے ہو اس سے بڑھ کر کیا کر سکتے ہو۔

وہ بھڑک اٹھا اور مجھے برے الفاظ میں لعنت ملامت کرنے لگا اور دین کو گالیاں دینے لگ میں نے کچھ جواب نہ دیا تو وہ ماجدہ کی جانب مڑا اور مجھے اور اسے ایک زنجیر میں کس دیا، پھر وہ مجھ سے کہنے لگا:

جانتی ہو یہ سب اہل کار یہاں کیوں کھڑے ہیں؟

سہم گئی، میں بمشکل بولی: نہیں۔ میں نہیں جانتی۔

بولا: یہ سب تمھارا تماشا دیکھنے آئے ہیں، کیونکہ اب تمھارا ڈرامہ ہوگا۔

پھر وہ طالبات کو دھمکاتے ہوئے کہنے لگا:

ہم نے تم سب کا تماشا دیکھنے کے لیے تمھیں باہر نکالا ہے اور اگر اب بھی تم سب نے ہڑتال ختم نہ کی تو ہم تمھارا حجاب اتار کر تم سب کو بے آبرو کر دیں گے اور تم سب خوب جانتی ہو کہ اہانت کیسے کی جاتی ہے۔

اور وہ فضول ہذیان بکنے لگا، اس کے منہ سے جھاگ بہنے لگا، گویا اسے پاگل پن کا دورہ پڑ گیا ہو:

لڑکیو۔ او۔ او فلاں۔ اللہ کی قسم ہم تم سے......

سب کو باہر نکال کر دو دو کو ایک زنجیر میں کس دیا گیا اور انھیں ہانک کر گاڑی کی جانب لے جایا گیا۔ میں اور ماجدہ سب سے آگے تھے، ہم سے اوپر چڑھنا محال تھا اور مجھ میں تو اتنی سکت بھی نہ تھی کہ پاؤں ہی اوپر اٹھا لوں۔ ایک سخت آہنی ہاتھ نے مجھے اور ماجدہ کو آگے دھکیلا، اب ہم ایک حقیقی پنجرے میں تھے، جس میں سلاخیں بھی تھیں اور دروازہ بھی اور تالہ بھی۔ ہمارے بعد باقی طالبات بھی وہیں داخل کر دی گئیں، سب کے سانس پھول رہے تھے۔ ہمارے اندر مسائل کے حل یا رہائی کی امید مر چکی تھی۔ ہمیں یقین تھا کہ وہ ہمیں ہلاکت کی جانب دھکیل رہے ہیں، گولی سے مارنے یا پھانسی کے پھندے پر، لیکن انجام یہی ہے۔ کچھ پر غشی چھا گئی اور بعض صدمے سے بے ہوش ہو گئیں۔ ہم نے دیکھا کہ الحاجہ نے لیموں نکالا، وہ نجانے کہاں سے انھیں ملا تھا اور وہ اسے چھیل کر ان کے چہروں پر لگانے لگیں۔ کسی نے باہر سے دروازہ مقفل کر دیا اور گاڑی نامعلوم مقام کی جانب فراٹے بھرنے لگی۔

❖❖❖

# باب سوم

## سجن قطنا مدنی: سست موت!

# اکتوبر ۱۹۸۲۔نومبر ۱۹۸۵

گاڑی زمین کی مسافتیں نگلنے لگی، ہر موڑ پر ایسا لگتا کہ ہم اچھل کر باہر جا پڑیں گے، کبھی ہم آہنی زنجیروں سے ٹکراتے اور کبھی ایک دوسرے کے بے دم جسموں سے۔ ہمارے اور ڈرائیونگ سیٹ کے درمیان دو محافظ تھے اور دو گاڑی کے پچھلی جانب بیٹھے تھے، جہاں حکام نے تالا لگا رکھا تھا، یہ سب اسلحے سے لیس تھے، ابو طلال ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر براجمان تھا۔

ہمارے ہمراہ میرے اور ماجدہ کے علاوہ ام شیماء، دونوں حاجنیں، ختمی، ایمان، رغداء، منی، حلیمہ، ام محمود اور امل تھیں۔ سفر شروع ہوتے ہی میرے سر میں ایک گھنٹے تک شدید درد ہوتا رہا۔ میں نے کسی ساتھی کو مدد کے لیے پکارنا چاہا تو ان کی اکثریت بے ہوش پڑی تھی۔ ہم پر بھوک، خوف، رعب اور غم کا یک بارگی حملہ ہوا تھا۔ کتنے مہینے سے ہم کسی سواری میں نہ بیٹھے تھے اور اس سارے عرصے میں سورج کی کوئی کرن تک ہمیں دکھائی نہ دی تھی۔ میں نے اپنا از سر نو جائزہ لینا شروع کیا۔ اپنے ہاتھ کو ہولے ہولے حرکت دینا چاہا، تو اس پر دباؤ مزید بڑھ گیا۔ میری انگلیاں نیلی ہونے لگیں اور مجھے خوف محسوس ہوا کہ وہ کہیں کٹ کر گر ہی نہ جائیں۔ میرا درد ناقابل برداشت ہونے لگا، جب گاڑی ایک پولیس پوسٹ کے پاس ایک جھٹکے سے رک گئی۔ ایک شخص نے آگے بڑھ کر دھکا دے کر دروازہ کھولا۔ ایسا لگا کہ وہ ہمیں یہاں اتارنے لگے ہیں۔ میں نے جھک کر دیکھا تو آہنی دروازے پر جلی حروف میں لکھا تھا: ''سجن قطنا مدنی''۔ دروازہ دوبارہ بند کر دیا گیا، وہ ہمیں عمارت کے اندر لے گئے، گاڑی ایک دوسرے دروازے پر جا رکی،

جہاں کاغذی کارروائی کی گئی اور نصف گھنٹے کے انتظار کے بعد شاید انھوں نے سارے کاغذات مکمل کر کے دے دیے، جب ایک پولیس والے نے آ کر ہمیں نیچے اترنے کو کہا۔

اس وقت ہماری حالت قبر کے مردوں کی مانند تھی۔ اٹھنا اور گاڑی سے اترنا ہمارے بس میں نہیں تھا۔ مجھے یاد ہے میں اپنے وجود کو گھسیٹنے لگی۔ اسی اثنا میں ایک لیڈی پولیس آ گئی اور اس نے ہاتھ پکڑ کر مجھے نیچے اتارا۔ کھڑا رہنا ہمارے بس میں نہ تھا، ہم سب فوراً زمین پر لیٹ گئے، ہم بالکل بھکاریوں کی طرح زمین سے چپکے ہوئے تھے، ہمارے اردگرد کچھ سپاہی کھڑے تھے۔ وہ ہمیں دیکھ کر آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے اور لاحول پڑھ رہے تھے۔ کچھ دوسرے اپنے کمروں کی کھڑکیوں سے جھانک کر ہمیں دیکھنے لگے، گویا ہم کسی اور سیارے کی مخلوق ہوں۔ یہ منظر بڑا غم ناک تھا، پر ہیبت اور عجیب بھی۔ ظلم وستم اور استہزاء کے ستائے ہوئے زرد چہرے، جنھیں سورج کی روشنی سے بھی محروم رکھا گیا تھا، جن کے بدحال جسموں پر بوسیدہ چیتھڑے تھے، ستم کی چکی میں پسنے کے بعد جو اپنی اصلی رنگت چھوڑ چکے تھے، جن پر اتنے پیوند لگ چکے تھے کہ اصل کپڑا خال خال ہی نظر آتا تھا۔ اس حالت میں بھی ہم قید تھے، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور دو دو قیدی ایک زنجیر میں جکڑے ہوئے۔ ہم ذرا بھی ہلنا چاہتے، تو زنجیروں کے ساز بج اٹھتے۔ اس پر مستزاد یہ کہ ہماری ہتھکڑیوں کی چابیاں ابوطلال کفرالسوسہ ہی چھوڑ آیا تھا۔ جان بوجھ کر یا انجانے میں، وہ ہمیں یوں ہی فٹ پاتھ پر گرا چھوڑ کر کفرالسوسہ چابیاں لینے چلا گیا، لیکن جوں ہی خفیہ والوں کی گاڑی باہر نکلی، ایک سپاہی ہمیں عزت واحترام سے اندر لے جانے کے لیے آ گیا۔ جب ہم سے اٹھا نہ جارہا تھا تو وہ ہمیں سہارا دے کر اندر لے گئے اور ابوطلال کے انتظار میں نشستوں پر بٹھا دیا۔

جیل انتظامیہ کا یہ دفتر ایک میز، اسلحہ خانے اور کچھ کرسیوں سے آراستہ تھا۔ اہل کار کبھی ایک دروازے سے داخل ہوتے اور کبھی دوسرے سے۔ ان کی آنکھوں میں حیرت نما خوف کے سائے صاف نظر آتے تھے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے اور کچھ تو عورتوں کی مانند

رونے لگتے۔ ایک سپاہی جو پچاس کے پیٹے میں تھا آگے بڑھ کر ہماری زنجیریں کھولنے کی کوشش کرنے لگا، مگر کئی بار کوشش کے باوجود کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ ایک جانب ہو کر ہمیں تسلی دینے لگا۔ اس کے آنسو کسی جھرنے کی مانند بہہ رہے تھے، وہ گال پونچھتے ہوئے کہنے لگا:

اطمینان رکھو میری بہنو! اطمینان رکھو!! ہم ابھی آپ کو اندر لیے جاتے ہیں، آپ یہاں نئی زندگی کا آغاز کریں گی۔

اس نے ہاتھ سے کھڑکی کے اندر کی جانب اشارہ کیا اور پھر وہ اپنی چیخوں پر قابو نہ رکھ سکا:

دیکھو۔ اس جانب لڑکے ہیں۔ یہاں درخت ہیں اور اس جانب عورتیں۔ ان میں ایک حماۃ سے ہے، اس کا نام غزوہ ہے اور اس کے علاوہ فلاں اور فلاں ہیں۔ للہ اب آپ تروتازہ ہو جائیں اور طبعی انداز میں نئے سرے سے زندگی شروع کریں۔

اس لمحے ام محمود کو اپنے بچے یاد آگئے، وہ برجستہ بولیں:

اور اگر ہم بال بچے دار ہیں تو کیا آپ ہمیں اس کے بدلے بچے بھی دیں گے؟

وہ بولا: اللہ کی جو مرضی ہوگی میری بہن۔ اللہ کی قسم اگر آپ کے بچے یہاں آئیں گے تو ہم انھیں بھی یہاں آنے اور آپ سے ملنے دیں گے، آپ انھیں دیکھ کر یقیناً خوش ہوں گی۔

وہ بھلا آدمی فوراً گیا اور ہمارے لیے چائے لے آیا۔ ہمیں یقین نہ آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ تقریباً دو گھنٹے بعد اسسٹنٹ جیلر ابومطیع، ابوطلال کو لے کر اندر آ گیا۔ اس نے ایک ایک کر کے ہم سب کی ہتھکڑیاں کھول دیں اور ہم سے کچھ کہے بنا اہل کاروں کے ساتھ باہر نکل گیا۔ اس کے ساتھ ہی گاڑی کے سٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ ابومطیع ہمارا خوف دور کرنے کے لیے ہمیں یقین دلانے لگا کہ یہ جگہ بالکل مختلف ہوگی۔ آج کے بعد نہ ہی ہمیں تعذیب دی جائے گی، نہ ہمیں خوف کا شکار کیا جائے گا۔ وہ ہمیں لے کر بلاکوں کی جانب چلنے لگا، ہم سب سر جھکائے اس کے پیچھے چل رہے تھے۔ جوں ہی ہم میں سے سب سے پہلی قیدی اندر داخل ہوئی اور وہاں

ام ثیما نظر آئیں۔ ہم نے دیکھا کہ ساری قیدی خواتین ان کی جانب لپکیں اور انھیں گلے لگانے لگیں اور بالفعل انھیں اٹھا کر اندر لے گئیں۔ وہ پکارتی ہی رہ گئیں مگر انھوں نے انھیں ایک قدم بھی چلنے نہ دیا۔ ظاہر ہے ابو مطیع انھیں پہلے ہی آگاہ کر چکا تھا کہ یہ حمات کے حادثے کی قیدی خواتین ہیں اور اب یہ ہماری مہمان ہیں۔ یہ ٹوٹی پھوٹی، زخمی اور مصیبت زدہ بہنیں ہیں اور بڑے برے حال میں یہاں پہنچی ہیں۔ اس شخص کے رویے میں نہ تو تصنع تھا نہ ہی وہ اس وقت تک جھوٹا دکھائی دیتا تھا۔ ہمارے لیے تو وہ کسی فرشتے سے کم نہ تھا، کیوں کہ ہم جس کوٹھڑی میں تین برس گزار کر آئے تھے وہاں ہمیں اس قدر حقارت اور تنگی کے ساتھ رکھا گیا تھا کہ وہ جگہ ہمارے لیے کسی قبر کے گڑھے سے مختلف نہ تھی۔

## رسمی احکامات......دس برس فقط

جن قطنا قدیمی عربی عمارتوں کی مانند پتھروں سے بنا ہوا تھا، جس کے کمرے پورے احاطے میں پھیلے ہوئے تھے۔ صحن اور کمروں کے بیچ میں لوہے کی سلاخیں تھیں اور ہر ایک کمرہ ایک الگ بلاک تھا۔ کچھ بلاک سیاسی قیدیوں کے لیے مخصوص تھے، جب کہ کچھ دوسرے مجرموں کے لیے تھے، جن میں دو بلاک قاتلوں کے لیے، تیسرا منشیات اور چوتھا جسم فروشی کی ملزموں کے لیے۔ پانچواں کمرہ جو قیدِ تنہائی کے کسی سیل کی مانند تھا اس میں ہم سے پہلے مہدی علوانی کی والدہ قیدِ تنہائی کاٹ رہی تھیں، جنھیں بعد ازاں ۱۹۷۹ء کے اواخر میں کئی نوجوانوں کے ساتھ پھانسی دے دی گئی تھی، لیکن یہ ہمارے یہاں آنے سے پہلے کا واقعہ ہے۔ کمرے ساتھ جڑے ہونے کے باوجود سیاسی قیدیوں اور عدالتی قیدیوں کے درمیان رابطہ ممنوع تھا۔ ہم وہاں پہنچے تو سب سیاسی قیدیوں کو ہم سے ملنے کی اجازت دے دی گئی۔ ان میں کچھ خواتین تو ایسی بھی تھی جن سے ہمارا پرانا تعارف موجود تھا۔ ثناء (جو یونیورسٹی میں میرے ساتھ تھی) نے آگے بڑھ کر اپنی باہیں میرے گلے میں ڈال دیں اور رسان سے بولی:

نامعقول۔ کیا یہ تم ہی ہو؟ کیا ہوا تمھیں۔ کیا انھوں نے تمھیں کسی ڈبے میں ڈال کر سربمہر رکھا ہوا تھا؟

غزوہ بھی اپنی اسی زندہ دلی اور ہنسوڑ پن کے انداز میں آگے بڑھی۔ ہمارے دل خوشی سے بھر گئے، گویا ہم جیل میں نہیں، بلکہ اپنے گھر کے مہمان خانے میں عزت و احترام کے ساتھ مل بیٹھنے کو اکٹھے ہوئے ہیں۔ ہم نے ایک دوسرے کو چوم لیا۔ آنسو نہ جانے کہاں سے امڈتے چلے گئے اور کراہوں کو ایک دوسرے کا سینہ مل گیا۔ سب نے اپنے اپنے درد کے قصے سنائے۔ کچھ ہی دیر میں قائد منطقہ ہمن لے آئے۔ سلام کر کے انھوں نے اس قید خانے میں ہمیں خوش آمدید کہا اور ہمیں یقین دلایا کہ ہم یہاں پر ان کے لیے امانت ہیں اور ہمیں ان کی جانب سے خیر ہی ملے گی۔ اس نے ہمیں تاکیداً کہا کہ وہ کسی خفیہ والے کو ہم تک رسائی نہ دے گا اور اب ہڑتال باقی رکھنے کی کوئی قابل ذکر وجہ باقی نہیں رہی۔ لہٰذا اب ہم صبر سے یہ دن کاٹیں حتیٰ کہ اللہ کرم کرے اور ہماری رہائی کا پروانہ مل جائے۔ ایک سپاہی قائد کے لیے کرسی لے آیا، وہ ہمارے سامنے بیٹھ گیا، اس نے کچھ اوراق نکالے اور انھیں پڑھنے لگا، اس کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا اور دوسرا جا رہا تھا۔ پھر وہ بلند اور صاف آواز میں گویا ہوا:

اب ذرا غور سے سنو۔ میں کسی کے رونے اور چلانے کی آواز نہ سنوں۔ فقط توجہ سے سنو۔

الحاجہ نے پوچھا: کس معاملے میں؟

بولا: یہ آپ کے بارے میں عدالت کا فیصلہ آگیا ہے، میں اسے آپ کے سامنے پڑھ دیتا ہوں، تاکہ ہر ایک کو معلوم ہو جائے کہ اس کے بارے میں کیا حکم سنایا گیا ہے۔

اور ہمیں سانس لینے کا موقع دیے بغیر وہ پڑھنے لگا:

محکمہ امن دولہ نے ملزمہ ہبہ دباغ کو دس سال قید با مشقت کی سزا سنائی ہے۔

الحاجہ ریاض چیخ کر بولیں: آہ ان شاءاللہ میں بھی تمھارے ساتھ ہی ہوں گی ہبہ!!

انھوں نے آگے بڑھ کر مجھے اپنے ساتھ چمٹالیا اور رونے اور آہیں بھرنے لگیں۔ الحاجہ مدیحہ بھی میرے قریب آ کر بولیں:

میں بھی تمھارے ساتھ ہی ہوں گی ان شاء اللہ ۔ دس برس...... لیکن یہ فوری تأثر اور احساس جلد ہی ختم ہو گیا اور ہر ایک اپنے متعلق ہونے والے فیصلے کو سننے کے لیے بے چین ہو گیا۔ سب کی نگاہیں بلا ارادہ ہی افسر کی جانب اٹھیں اور وہ بھی مشینی انداز میں بقیہ احکامات پڑھ کر سنانے لگا:

محکمہ امن دولہ نے ملزمہ ریاض کو بیس برس قید بامشقت کی سزا دی ہے۔

وہ بے اختیار بول اٹھیں: رُکو۔ باپ رے۔ میں نے یہاں کوئی غلط کام تو نہیں کیا...... کیا کہا؟ کیا تم نے بیس برس کہا ہے؟ غیر معقول

سب مجھے چھوڑ کر ان کی جانب بڑھے، وہ اس دُہری سزا پر انھیں تسلی دینے اور ان کا غم ہلکا کرنے لگیں اور اس نے پھر احکامات سنانے شروع کیے:

نجمی۔ بیس سال۔

الحاجہ مدیحہ دس برس۔

رغداء، خاور اور منی چار سال لیکن ان کی سزا بھی عملاً دس برس سے پہلے ختم نہ ہوئی۔

ام شیما چار سال۔

عائشہ چار سال۔

حوریہ ام محمود دس سال۔

منی اور اس کی بہن دس برس۔

ماجدہ بیس برس۔

ہالہ دس برس۔

ترفہ دس برس۔

اور جب سب کے نام پڑھ چکا، اس نے خوف سے پتھرائے ہوئے ہمارے چہروں کو دیکھا، چہروں کے تناؤ میں اضافہ ہو چکا تھا، کچھ خواتین پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھیں۔ہم ابھی تک ہڑتال کی کیفیت میں تھے، وہ ہمیں تسلی دینے لگا:

یہ محض عدالتی احکامات ہیں، ان شاءاللہ آپ اس مدت کے پورا ہونے سے پہلے ہی رہا ہو جائیں گی، ہمارے یہاں سے سب کی رہائی ہی عمل میں آتی ہے۔

پھر وہ یہاں پر ہمارے حقوق کی تفصیلات سے ہمیں آگاہ کرنے لگا۔اس نے اصرار سے ہمیں کھانا کھانے اور اپنی طبعی زندگی کی جانب لوٹ جانے پر آمادہ کیا۔ اتنی دیر میں بلاک کی قیدیوں نے ایک طویل دستر خوان بچھا کر ہم نئی آنے والیوں کے لیے کھانا چن دیا، میں ماجدہ کی جانب متوجہ ہو کر کہنے لگی:

ٹماٹر۔کھیرے۔سبزی اور انڈے۔اس کے باوجود کہ ہمیں شدید بھوک لگی تھی اور مرغوب کھانا سامنے دھرا تھا اور سات روزہ ہڑتال کے بعد ہم پہلی مرتبہ کھانا کھا رہے تھے، مگر پہلے نوالے سے ہی پیٹ میں اس قدر شدید مروڑ اٹھا کہ کھانا جاری رکھنا ناممکن ہو گیا۔لیکن ہمیں ہڑتال بھی توڑنا تھی اور جسم کی توانائی بحال کرنے کا بھی کچھ انتظام کرنا تھا۔ہمیں ان حقوق کو حاصل کر کے یک گونہ کامیابی کا احساس بھی ہو رہا تھا، ہمارے گھر والوں کو ہفتہ وار ملاقات کی اجازت بھی مل گئی۔ہم سب نے آئندہ جمعہ کے ملاقاتی دن کو ایک ایک کر کے گننا شروع کر دیا اور بدھ کے روز جب ہمیں ملاقات کی تفصیلات ملیں تو جبھی سے ہم نے خواب بننا شروع کر دیے اور یہ وقت اتنا طویل ہو گیا کہ گزارنا مشکل ہو گیا۔

## مشقتی کام

ہمارا بلاک ایک مستطیل شکل کا کمرہ تھا جس کا طول پانچ میٹر سے زائد نہ تھا اور یہ جیل

میں داخل ہوتے ہی دائیں جانب واقع تھا۔ اندر آتے ہی زمین کی سطح سے کچھ نیچے ایک بلاک تھا جسے "عتبہ" کہا جاتا تھا، اس سے آگے زمین پھر پرانی سطح تک بلند تھی۔ بائیں جانب حمامات تھے، جس کی دو کھڑکیاں جیل کے داہنے دروازے کی جانب کھلتی تھیں۔ ہمارے بلاک میں پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد جیلر ہم میں سے ہر ایک کے لیے اسفنج کے گدے، تکیے اور کمبل لے کر آ گیا، اگرچہ وہ کافی پرانے اور بوسیدہ ہو چکے تھے، بلکہ ان پر میل کی تہیں بھی جمی ہوئی تھی، جلد ہی سب میں بہتر بستر اور سونے کی جگہ حاصل کرنے کے لیے مسابقت شروع ہو گئی۔ آخر کار مجھے کمرے کے سب سے آخر میں جگہ ملی۔ میرا گدا آدھا فرش پر تھا اور آدھا خلا میں جب خیر سے یہ مصیبت ختم ہوئی تو ہم نے مل کر کمرے کو نئے سرے سے صاف کرنے کا پروگرام بنایا۔ کمرے کا فرش جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا، ایک جانب سے دروازہ بھی دیمک کی نذر ہو چکا تھا اور اس قدر بوسیدہ ہو چکا تھا کہ کوئی بھی اسے دھکا دے کر اندر آ سکتا تھا۔ ہم نے جیلر سے درخواست کی کہ وہ ہمیں کچھ سیمنٹ فراہم کر دے تو ہم خود ہی اسے مرمت کر دیں۔ وہ مان گیا، اگلے روز صبح سویرے دروازہ بجا اور الحاجہ ریاض باہر دیکھنے گئیں، لیکن وہ واپس نہ پلٹیں، کچھ دیر انتظار کے بعد ہم انھیں دیکھنے باہر گئے تو وہ بے ہوش پڑیں تھیں۔ الحاجہ مدیحہ نے جلدی سے ان پر پانی کے چھینٹے ڈالے اور انھیں ہوش دلایا، وہ آنکھیں کھولتے ہی رندھی آواز میں بولی:

میرے والدین قربان الحاجہ، اہل کار مجھے جبری مشقت کے لیے لے جانا چاہتا ہے اللہ کا واسطہ ہے اس سے بات کرو۔ اسے بتاؤ کہ میں مشقت کے قابل نہیں ہوں۔ میرا بلڈ پریشر بڑھ جائے گا، بخدا میرا دم گھٹتا ہے۔ میں یہ نہیں کر سکتی۔

اتنا کہہ کر وہ غریب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ الحاجہ مدیحہ نے باہر جھانک کر دیکھا، وہ اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے اہل کار سے پوچھنے لگیں:

کیا ہوا ہے۔ آپ انہیں کہاں لے جا رہے ہیں؟

اہل کار مضطرب ہو کر حیرانی سے بولا:

خدا کی قسم میں نے کچھ نہیں کہا۔ میں نے تو فقط اتنا کہا تھا کہ الحاجہ آؤ اور یہ سیمنٹ لے جاؤ۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ الحاجہ ریاض کان کی خرابی کی وجہ سے کچھ سن نہ پائی تھیں، فقط کل کی سزا نافذ ہونے کا خوف تھا جس میں انھیں ''قید بامشقت'' کی سزا سنائی گئی تھی۔ اس اہل کار کو دیکھ کر انھیں یہی خیال آیا کہ انھیں صبح سویرے جبری مشقت کے لیے لے جانے آ گئے ہیں۔ اسی سبب وہ غم سے بے ہوش ہو گئیں۔

## قید خانے میں ولادت

سیاسی قیدیوں کا بلاک ہمارے یہاں آنے سے پہلے ہی بھرا ہوا تھا، ان میں: حمات سے غزوہ، دمشق سے سناء، ام معقل اور ان کا بیٹا معقل جس کی پیدائش اسی قید خانے میں ہوئی تھی، جسر شغور سے ام ہیثم، جسر ہی سے ام عبدالباسط اور ان کی بیٹی عائدہ، لاذقیہ سے سنیحہ اور فاطمہ، لاذقیہ ہی سے ام محمود کامل وغیرہ تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کی اپنی ایک کہانی تھی اور اپنے درد اور الم کے قصے۔

غزوہ ماہر دندان تھی، اس نے حمات میں اخوان کے حامی نوجوانوں کے لیے ایک گھر خریدنے میں مدد کی تھی اور عبدالکریم رجب نے اس کا راز فاش کر دیا تھا، سو وہ اسے صوران میں اس کے کلینک سے اٹھا لائے۔ ابتدا میں اسے فرع امن سیاسی حمات میں رکھا گیا، پھر فرع تحقیق عسکری دمشق منتقل کیا گیا اور چھ یا آٹھ ماہ وہاں رکھنے کے بعد قطنا لے آئے، تاکہ باقی قید یہیں پوری کرے۔

سناء کا شناختی کارڈ کسی نے اس کے علم میں لائے بغیر کسی مکان کی خرید میں استعمال کیا تھا۔ جب اس گھر کا انکشاف ہوا تو اس کی ملکیت ہونے کی وجہ سے اسے پکڑ لیا گیا۔ سناء ۱۹۶۰ء کی پیدائش تھی اور ہمارے ساتھ کلیۃ الشریعہ کی طالبہ تھی۔ سناء اسی روز گرفتار ہوئی جس روز مجھے

گرفتار کیا گیا تھا، لیکن اس سے عسکری ذمہ داروں نے تفتیش کی۔ دورانِ تفتیش اس سے میرے بارے میں بھی پوچھا گیا اور مطالبہ کیا گیا کہ وہ انھیں دمشق میں میرے گھر لے جائے۔ وہ خود اس کے ہمراہ گئے اور اسے آگے بڑھ کر دروازہ کھٹکھٹانے کو کہا۔ دروازے پر میری امّی آئیں۔ میں تو گزشتہ رات ہی گرفتار ہو چکی تھی اور ابھی تک اہل کار ہمارے فلیٹ میں چھپے ہوئے تھے، جب اس نے میری امّی کو دیکھا تو ان سے یہی کہا کہ وہ فوراً یہاں سے چلی جائیں اور اپنی بیٹی کو بچانے کی کوشش نہ کریں۔ اندر سے اہل کار نے آگے بڑھ کر اسے گرفتار کرنا چاہا تو اسے معلوم ہو کہ سناء تو پہلے سے ہی گرفتار شدہ ہے۔ وہ اسے واپس لے آئے اور جیل کی دوسری بلاک میں لے گئے۔

قیدیوں میں تیسری مطیعہ ام معقل مدرسے کی معلمہ تھیں۔ ان کے بعض اساتذہ کو ستر کی دہائی کے اواخر میں شک کی بنا پر ادارے کی تعلیمی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے روک دیا گیا اور انھیں ایک ڈسپنسری کی منتظمہ کے طور پر ٹرانسفر کر دیا گیا تھا۔ ان کے شوہر بھی اخوان کے حامیوں میں سے تھے، لیکن وہ فرار ہو گئے۔ پولیس نے ان کے بدلے ان کے والد کو گرفتار کر لیا۔ گرفتاری کے وقت مطیعہ کی عمر چالیس برس سے کچھ ہی کم تھی، وہ چار بچوں کی ماں تھی اور پانچواں دُنیا میں آنے ہی والا تھا، لیکن انھیں اس حال میں بھی معاف نہ کیا گیا، وہ اپنے شوہر کے جرم میں قید کی گئیں۔ انھیں کچھ وقت کے لیے جسر کی امن سیاسی کی تابع عسکری ڈسپنسری میں رکھا گیا۔ اسی ڈسپنسری کے ایک کمرے میں دھمکیوں اور خوف کے نتیجے میں قبل از وقت ولادت کا عمل شروع ہو گیا۔ ان کی طبیعت بگڑی تو انھوں نے دروازہ کھٹکھٹا کر کسی کو مدد کے لیے پکارا مگر انھیں کوئی جواب نہ دیا گیا۔ انھوں نے چیخ چیخ کر بتایا کہ ان کی اور بچے کی مدد کی جائے مگر کسی کے کان پر جوں نہ رینگی۔ بچے کی ولادت کے بعد جب اس کے رونے کی آواز آئی تو انھوں نے ایک نرس کو مدد کے لیے بھیجا، لیکن اس وقت تک کسی مدد کی ضرورت باقی نہ رہی تھی پھر انھیں اور مولود کو ذیلی شاخ تحقیق عسکری دمشق میں منتقل کیا گیا اور ہم سے کچھ مہینے پہلے انھیں قطنا جیل میں لایا گیا۔ اب معقل سات، آٹھ ماہ کا ہو چکا تھا۔

## صدر اسد کو گالی

اس کا نام معقل بھی حلیمہ نے صحابی رسول معقل بن یسار کی مناسبت سے رکھا تھا اور وہ پیدا بھی معتقل (جیل) میں ہوا تھا۔ مطیعہ بڑی صابرہ خاتون تھیں، لیکن جیل کے آلام سے بڑھ کر ان کے لیے دکھ یہ تھا کہ بچہ بلاقصور جیل میں ہے اور اس کے بچپن کا حسین زمانہ ان اونچی فصیلوں کے بیچ گزر جائے گا۔ اس کے مستقبل کے بارے میں بھی روشنی کی کوئی کرن نظر نہ آتی تھی، جیسے اس کا مستقبل سیلوں، بلاکوں اور اور جیلوں کی نذر ہو رہا تھا۔ اس سے بڑھ کر اس کے لیے یہ احساس تکلیف دہ تھا کہ وہ کس طرح دوسری قیدیوں کے ہاتھوں میں ان کے جذبات کی تسکین اور Catharsis کا آلہ بنا ہوا تھا۔ کتنی ہی قیدی خواتین اپنے شوق کی خاطر اسے اپنا دودھ پلا دیتیں اور اپنی بوریت اور تھکاوٹ اس سے اتارنے کی کوشش کرتیں۔ ام معقل اسے کچھ سکھانے کی کوشش کرتیں اور کئی قیدی اسے عجیب و غریب چیزیں سکھا دیتیں۔ وہ ان کی دلآزاری سے بچنے کے لیے انھیں کچھ کہہ بھی نہ پاتیں۔ وہ بے بسی سے اپنے بچے کو سینے سے چمٹا لیتیں، یا زیادہ وقت اسے اپنے قریب رکھتیں تاکہ کسی کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچے، لیکن یہی باتیں اسے کتنے ہی مسائل اور مصائب سے دوچار کر دیتیں۔ اسے خود بھی پتا نہ چلا کہ بچے نے باتیں سیکھنے کی عمر میں نجانے کہاں سے لفظ ''طظ اسد'' (صدرِ شام حافظ اسد کو گالی) سیکھ لیا۔ وہ جب کبھی اس کا ذکر سنتا یا اس کی تصویر دیکھتا ''طظ اسد'' کہتا۔ انھیں دنوں معقل بیمار ہو گیا، بیماری طویل ہو گئی تو بڑی مشکل اور منتوں کے بعد اسے ڈسپنسری جانے کی اجازت ملی اور اسی حالت میں جب اس نے ڈسپنسری میں حافظ اسد کی دیوار پر آویزاں تصویر دیکھی تو وہ لوگوں کی پروا کیے بنا زور سے چلایا ''طظ اسد'' اور ماں کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اسے خاموش کیسے کروائے۔ اسی طرح جب مطیعہ کو محکمۃ میدانیہ میں پیش کرنے کے لیے لایا گیا، تو بچہ بھی ان کے ہمراہ تھا۔ کونسل کے سامنے میز پر حافظ اسد کا مجسمہ رکھا تھا۔ معقل جب اس کے قریب پہنچا تو اس نے

مجسمے پر تھوک دیا اور بآوازِ بلند بولا: طظ اسد۔ ڈیوٹی پر مامور سپاہی غضب ناک ہو گیا اور ماں بیٹا دونوں کو قیدِ تنہائی کی سزا ملی۔ معقل نے رونا شروع کر دیا اور زور زور سے یہی کلمات دہرانے شروع کر دیے۔ ماں اسے خاموش کرواتی یا اس کے منہ پر ہاتھ رکھتی تو وہ اور زیادہ زور سے یہی کہتا اور ان کی قید تنہائی میں مزید اضافہ ہو جاتا، نجانے اس کا سبب بچہ تھا یا وہ جنھوں نے اسے یہ کلمہ سکھایا تھا، لیکن قیمت اسے چکانا پڑ رہی تھی۔

ہم سے پہلے قطنا میں جسر شغور کی رہائشی ام ہیثم بھی تھیں۔ وہ اپنے چار بچوں اور شوہر کے ہمراہ اخوان کے حامیوں کے ایک گھر میں رہ رہی تھیں۔ خفیہ والوں نے اچانک چھاپا مارا اور ان سب کے ساتھ انھیں بھی دھر لیا۔ بعض لوگ مارے گئے اور بعض فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ ابو ھیثم بھی اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ گرفتار ہو گئے اور ان سب کو بہت بری طرح تعذیب کا نشانہ بنایا گیا۔ شوہر کو اسی قید خانے میں حکومتی احکامات کے تحت قتل کر دیا گیا اور ان پر لوگوں کے جذبات مشتعل کرنے کا الزام لگایا گیا۔ یہی الزام محکمہ میدانیہ کی طرف سے ان کی ساتھی قیدیوں ام معقل اور ام عبدالباسط اور ان کی بیٹی عائدہ پر لگایا گیا اور ان سب کی رہائی ۱۹۸۵ء میں عمل میں آئی۔

جہاں تک سمیحہ اور فاطمہ کا تعلق ہے تو وہ محافظہ لاذقیہ کے علاقے مرج خوخہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ اپنے بعض اخوانی رشتے داروں کے ہمراہ بستی کے قریبی پہاڑ پر چلی گئی تھیں۔ فاطمہ کی عمر ۱۵ برس تھی اور سمیحہ کی ۱۶ برس، ان کے ساتھ ان کی ۱۸ سالہ بچازاد غنیتہ بھی تھی۔ ان پہاڑوں پر وہ حکومت کے ظلم سے بھاگے ہوئے افراد کے لیے کھانا تیار کرتیں اور دوسرے چھوٹے موٹے کام کر دیتیں، خفیہ والوں نے ان پر کریک ڈاؤن کیا، تو بعض نوجوانوں کے ساتھ غنیتہ بھی شہادت کے مرتبے پر فائز ہو گئی، جب کہ سمیحہ اور فاطمہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ انھیں دو تین دن تک سجن الشیخ حسن دمشق میں رکھا گیا، وہاں ان پر کوئی تعذیب نہ کی گئی اور پھر انھیں قطنا جیل میں پہنچا دیا گیا۔ ان ظالموں نے غنیتہ کی میت بھی اس کے گھر والوں کو نہ دی اور خود ہی

اسے دفنا دیا اور وہ تمام نوجوان جنھیں وہاں سے گرفتار کیا گیا تھا ان سب کو اکٹھا شہید کر دیا گیا۔

دوسرے بلاک کی قیدیوں میں لاذقیہ سے ام محمود بھی تھیں جو پچاس کے پیٹے میں تھیں۔ وہ پانچ بیٹوں کی ماں ہونے کے ساتھ ساتھ دادی بھی تھیں۔ ام محمود کو ہم سے کچھ دن قبل اخوان کے حامی نوجوانوں کی مدد اور اپنے ایک قرابت دار کے ذریعے انھیں سفری دستاویزات پہنچانے کا الزام تھا۔ انھیں پہلے کفر السوسہ لایا گیا اور ہماری آمد سے قبل ہی انھیں قطنا جیل منتقل کر دیا گیا۔ انھوں نے بتایا کہ انھوں نے انھیں تعذیب دی اور ان کی عمر کا خیال کیے بنا انھیں مارا پیٹا۔ وہ ہماری رہائی تک وہیں قید رہیں۔

## دُہری جاسوسہ

قطنا ہی کی قیدیوں میں معروف ترک کیمونسٹ رہنما ریاض کی بیوی اُسماء فیصل بھی تھیں۔ وہ خود پیشے کے اعتبار سے ایک ڈاکٹر تھیں اور عمر کے پچاس برس گزار چکی تھیں۔ وہ بھی ہم سے پہلے دوسرے بلاک کی مکین تھیں، میرا خیال ہے کہ وہ تقریباً تین برس سے یہیں قید تھیں، ہمارے یہاں آنے کے چند ماہ بعد انھیں رہائی مل گئی، لیکن اس مختصر عرصے میں بھی انھوں نے ہم پر اپنے اعلیٰ اخلاق کا گہرا اثر چھوڑا۔ ان کا ہمارے ساتھ معاملہ بہت اچھا رہا، وہ بلاک میں اپنی ساتھی امیرہ زرکلی سے بالکل مختلف خاتون تھیں۔ امیرہ کی شادی ایک عراقی سے ہوئی تھی اور وہ اس کے ساتھ ہی عراقی سفارت خانے میں کام کرتی تھی۔ اس پر عراق اور شام دونوں کی جاسوسی کرنے کا الزام تھا۔ اس کا پول کھلنے کے بعد اسے شام میں قید کیا گیا اور اس کی غیر موجودگی میں عراق میں اس پر مقدمہ چلا جہاں اسے پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ ان حالات میں اس کے شوہر نے اسے طلاق دے دی۔ ہماری رہائی تک وہ جیل میں قید تھی۔ یہ خاتون ہمیشہ ہمیں تکلیف دینے میں پیش پیش رہتی۔ اس کا رویہ برانگیختہ کرنے والا ہوتا۔ وہ اخوان کے بارے میں ہمیشہ بری بری باتیں کرتی، اسے اس بات کی بھی چنداں پروانہ ہوتی کہ اس کی باتوں کی آواز ہم تک

پہنچ رہی ہے، وہ بولے چلی جاتی:

''دیکھ لینا۔ ساری قیدی رہا ہو کر گھروں کو پہنچ جائیں گی، لیکن مسکین اخوانی قیدی اس وقت بھی نظریں پھاڑ کر جیل کی سلاخوں کو تک رہی ہوں گی۔''

لیکن ہوا کچھ یوں کہ ہم سب کو تو اکٹھے رہائی مل گئی اور وہ پتھرائی نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔ سبحان اللہ اور اسے اس کے بھی تقریباً دو سال بعد رہائی ملی۔

## قربانیاں

بلا شبہ قطنا جیل میں زندگی کے شب و روز کفر السوسہ میں گزارے دنوں سے بڑے مختلف تھے۔ یہاں ہمیں حسن معاملہ کی بہترین نعمت ملی تھی، لیکن جیل ہر اعتبار سے جیل ہی ہوتا ہے اور قید سونے کی سلاخوں کے پیچھے بھی قید ہی ہوتی ہے اور جس نے بھی آزاد فضا میں سانس لی ہو وہ قید کے احوال سمجھ سکتا ہے، جہاں مشکلات، آلام اور پریشانیوں کی کتنی ہی صورتیں ہوتی ہیں۔ جب بھی اس حال میں ہمارا دل گھٹنے لگتا تو کہیں سے ٹھنڈی ہوا کا کوئی جھونکا ہمارے لیے آسانی پیدا کر دیتا۔

ابتدا میں ہمارا مجرم قیدیوں سے کوئی رابطہ نہ تھا، کیونکہ ہمارے دروازے باری باری کھولے جاتے تھے۔ کچھ کو صبح میں باہر نکلنے کا موقع ملتا اور کچھ کو شام میں، اور باری باری یہ ترتیب الٹ دی جاتی۔ پھر ہم نے آہنی سلاخوں کے پیچھے سے آپس میں بات چیت شروع کر دی۔ ہم ان کی آپ بیتیاں بھی سن لیتے اور ہمیں ان سے کافی تسلی بھی ملتی۔ ہم انھیں مختلف معاملات میں نصیحت بھی کرتے اور ان کی غلطیوں کی نشاندہی کرتے۔ ان میں سے اکثر خواتین گھر والوں کی غلط تربیت کی وجہ سے جرم کی دنیا میں داخل ہو گئی تھیں اور بعض حالات کی چکی میں پستے ہوئے اس مقام پر آ گئی تھیں۔ اسی ربط کے نتیجے میں ہم نے ایک مظلوم خاتون کو تاریک مستقبل سے بچانے کی بھرپور کوشش کی اور الحمد للہ اس میں کامیاب بھی ہو گئے۔ اسے گھریلو

ناچاقی کی بنا پر اس کے شوہر نے طلاق دے کر گھر سے نکال دیا تھا، اس کا کوئی آسرا نہ تھا جہاں وہ جا کر پناہ لیتی اور یوں وہ ایک نائکہ کے چنگل میں پھنس گئی، جہاں اس نے اسے اپنے راستے پر لگا دیا، جب ہمیں محسوس ہوا کہ وہ تو خود مظلوم ہے اور دوسروں کے گناہوں کی سزا بھگت رہی ہے، تو ہم نے ایک اجتماعی مسائل کی سوشل ورکر تک رسائی حاصل کی، جو قیدی خواتین کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرتی تھی اور اس کے باوجود کہ ہمارا اس سے رابطہ کسی خطرے سے خالی نہ تھا، بلکہ ہم تو قانون کے ان طالب علموں سے بھی فاصلے پر رہتے تھے جو مجرموں کی منڈی کے لیے آتے، لیکن ہم نے بڑے محتاط انداز میں اس سے رابطہ کیا اور اسے اس قیدی کے بارے میں معلومات فراہم کیں، یوں نہ صرف اس کی عدالت تک رسائی ہوگئی، بلکہ اس کا نفسیاتی علاج بھی کیا گیا، بلکہ کچھ لوگوں نے ذاتی دلچسپی لے کر اس کی رہائی کے بعد ایک نوجوان سے اس کی شادی بھی کروادی۔

## جیل کی ضیافت

اس مقام پر موضوع بحث تجن قطنا ہے، تو مناسب ہوگا کہ اس کھانے کا بھی تذکرہ کر دیا جائے جو اس نئے گھر میں ہمیں ملتا تھا۔ ہمارے لیے بیشتر کھانا تجن قلعہ حلل یا صوافی معدنیہ سے آتا، لیکن ''جیل کا کھانا'' ہم تک پہنچنے میں اتنی تاخیر ہو جاتی کہ بھوک کے مارے ہم مرنے کے قریب پہنچ چکے ہوتے۔ جیل کی جو گاڑی قیدیوں کو عدالت میں پیش کرنے لے کر جاتی، وہی واپسی پر کھانا بھی لے کر آتی۔ پولیس اہل کار جیل کے احاطے میں کھانا اتروا تا اور قیدی خواتین سے کہتا کہ آکر کھانا وصول کر لیں اور خود ہی تقسیم کر لیں۔ جیل میں اچانک ہڑبونگ مچ جاتی اور چھینا جھپٹی شروع ہو جاتی۔ ہر خاتون چاہتی کہ وہ آگے بڑھ کر تقسیم کا فریضہ انجام دے، لیکن باقی خواتین کو یہ قبول نہ ہوتا۔ بات اسی پر ختم نہ ہوتی، بلکہ دلوں میں کدورت بڑھ جاتی۔ تلخیاں روز بروز بڑھنے لگیں۔ جب مسائل زیادہ گھمبیر ہو گئے تو جیلر نے غزوہ کی ذمہ داری لگا دی

اور وہ بے چاری اپنی رہائی تک یہ فرض نبھاتی رہی۔

اگر یہ کھانے کی تقسیم کا مسئلہ تھا، تو اسی نوعیت کے کئی اور مسائل بھی تھے۔ اکثر جب کھانا پیش ہوتا تو نجانے کہاں سے لال بیگ حملہ آور ہو جاتے۔ کبھی وہ روٹیوں پر رینگ رہے ہوتے تو کبھی سالن کی پلیٹوں میں۔ کبھی وہ شوربے میں ڈوبے ہوتے اور ہمارے دانتوں تلے پس رہے ہوتے اور یہ تو بالکل عام بات تھی کہ کھانے پر چوکیداروں کے پیروں کے نشان ہوتے اور اسے منتقل کرتے ہوئے بیدردی سے زمین پر گھسیٹا ہوا ہوتا اور کنکریاں بھی کھانے میں شامل ہو جاتیں۔ گاڑی کا ڈرائیور جلدی میں ہوتا تو وہ کھانے کا ''قروانہ'' باہر ہی اتار کر چلا جاتا اور جیلر کے وہاں پہنچنے اور دروازہ کھولنے سے قبل ہی کتے اور بلیاں اس پر حملہ کر چکے ہوتے اور پھر یہی معمول بن گیا۔ ہم قیدیوں سے اصرار کرتے کہ وہ چپکے سے ہمارے کھانے کے لیے کچھ خرید لائیں۔ بعد میں ہمیں اس کی سرکاری طور پر اجازت بھی مل گئی اور ام دیو ایک قیدی خاتون نے کینٹین طرز پر کچھ چیزیں بیچنا شروع کر دیں، مگر دگنی قیمت پر۔

ایک دوسری مشکل پانی کے معاملے میں تھی، جو بلاک کے غسل خانوں کی ٹونٹیوں میں نہ آتا تھا، بلکہ جیل کے مرکزی نلکے سے سب بلاکوں میں پائپ کے ذریعے باری باری تقسیم ہوتا تھا اور کبھی کبھار ساتھ والے بلاک کو بھی دینا پڑتا تھا۔ اس طرح پانی بھی ہمارے لیے مسائل پیدا کرتا تھا۔

کچھ عرصے بعد جیل میں ٹیلی وژن بھی آ گیا، جو خفیہ والوں کی جانب سے فراہم کیا گیا تھا، تاکہ ہم ''انقلاب'' کی خبر اپنے کانوں سے سن لیں اور اس بات کی بھی کہ اس حکومت نے کیا کیا کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ کچھ ہی دنوں میں یہ قیدیوں کے درمیان نئے جھگڑے کا سبب بن چکا تھا۔ یہ ٹیلی وژن کا ہی کارنامہ تھا کہ الحاجہ ریاض پورے سکون اور اطمینان سے تمام خبریں سنتیں اور اگر ہم کوئی بھی خبر جاننا چاہتے تو ان ہی کے پاس جاتے تھے۔ ان ہی دنوں (یعنی ۱۹۸۵ء میں) حافظ اسد کی تاحیات بیعت کی خبر نشر ہوئی، جس کی خوشی میں اس نے تمام عسکری

باغیوں کے لیے عام معافی کا اعلان کر دیا، لیکن الحاجہ ریاض جن کے کان نجانے کب سے ایسی خبر کے منتظر تھے یہ سمجھیں کہ اس اعلان میں یہ قیدی خواتین بھی شامل ہیں، وہ پوری طاقت سے چلائیں:

''الحمدللہ اب تو میں اپنی ماں کو دیکھوں گی اور بے ہوش ہو گئیں۔''

جب ہم نے اس خبر کی تفصیلات سنیں تو ہمارے بھی دل بجھ گئے اور ہماری ہمت جواب دے گئی، لیکن الحاجہ ریاض کے لیے یہ تشریح کسی بھونچال سے کم نہ تھی۔ وہ کتنے ہی دن غم کی تصویر بنی آنسو بہاتی رہیں۔

## جیل میں آگ

سجن قطنا کی نہ بھلائی جانے والی یادوں کے مناظر میں وہاں پے در پے لگنے والی آگ بھی ہے، جو زندگی کی قساوت اور الم، کشیدگی اور اضطراب کو آخری درجے پر پہنچا دیتی تھی۔ سب سے پہلے قتل کی مجرمہ فاطمہ کے غسل خانے میں اچانک آگ بھڑک اٹھی، جو اپنے شوہر کے قتل کے جرم میں قید تھی۔ یہ آگ تھوڑی ہی دیر میں پورے بلاک میں پھیل گئی اور فاطمہ کو بُری طرح جھلسا دیا، کئی دوسری قیدی بھی اس کی لپیٹ میں آ گئیں۔ اس وقت میں اور ماجدہ بلاک کی اوپر کی منزل میں نمازِ مغرب کے بعد قرآن کریم کی تلاوت کر رہی تھیں اور کھڑکی سے اسی جانب رخ کیے بیٹھے تھے۔ انھوں نے چلانا اور مجھے مدد کے لیے پکارنا شروع کیا، لیکن سب دروازے اندر سے مقفل تھے، ہم نے ام دیبو کو آوازیں دیں، لیکن بلاک بند ہو جانے کے بعد وہ نہ تو ہماری بات سنتی تھیں نہ جواب دیتی تھیں۔ آگ کے شعلے جب صحن تک پہنچنے لگے اور ہر طرف دھواں بھر گیا اور آگ بجلی کی تاروں اور ساتھ والے بلاک کے باورچی خانے کے چولھوں تک جا پہنچی، تو آخر کار ام دیبو نے الارمنگ بیل بجائی اور اہل کار بغیر کسی تیاری کے آگ کے مقام کو تلاش کرنے لگے۔ ہر جانب شور مچ گیا اور اسی ہڑبونگ میں بلاک کی کچھ قیدی خواتین نے اپنی مدد آپ کے تحت آگ بجھانے کی بھرپور کوشش کی، انھوں نے اپنا کمبل فاطمہ پر ڈال کر

اس کی آگ بجھائی، جو مکمل طور پر شعلوں کی لپیٹ میں آ چکی تھی، انھوں نے ہی بلاک کی آگ بجھائی۔ فاطمہ کے جسم کا بڑا حصہ جل چکا تھا اور چند ہفتے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ اس بے چاری کی آہیں اور کراہیں ہمیں سونے نہ دیتیں۔ وہ بے ہوشی ہی میں روتی رہتی اور ہماری روح سلگتی رہتی اور اس کے جلے بدن سے اٹھنے والی بو سے سارا بلاک عجیب دکھ اور تکلیف میں رہتا۔

دوسری مرتبہ ہمارے بلاک کے لیمپ سے آگ بھڑک اٹھی، جبکہ ایک قیدی نہانے کے لیے غسل خانے میں موجود تھی، وہ اس قدر گھبرائی کہ دروازے کا قفل الٹی جانب کھولنے کی کوشش میں اسے مقفل کر لیا اور گھبراہٹ میں دوسری جانب سے زور آزمائی کرنے لگی، آگ پھیل کر دروازے کے قریب پہنچ چکی تھی اور وہ اس کی لپیٹ میں آنے ہی والی تھی، لیکن اللہ کی مہربانی کہ اس نے اسے اور ہمیں محفوظ رکھا۔ ہم قفل توڑنے میں کامیاب ہو گئے، ماجدہ کو اللہ جزا دے، وہ اندر داخل ہوئی اور بھڑکتے شعلوں کی پروا کیے بغیر لیمپ کو اٹھا کر باہر پھینک دیا، اگرچہ اس کوشش میں اس کے ہاتھ جل گئے۔

## اللہ ان پر رحم فرمائے

قطنا جیل کے حالات کفر السوسہ سے ایجابی انداز میں اس قدر مختلف تھے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں سرفہرست ملاقاتوں کی اجازت تھی اور کچھ ہی عرصے میں ہمیں خطوط لکھنے کی سہولت بھی میسر آ گئی، تو میں نے اپنے بھائی کو حلب میں اور پھوپھی کو خط لکھا، حتیٰ کہ ام شیما نے سعودیہ میں اپنے گھر والوں کو مکتوب بھیجا اور مجھے بھی ان سب کے خطوط ملنے لگے، لیکن یہ سلسلہ دو یا تین ماہ سے زیادہ نہ چل سکا اور پھر خطوط پر سخت پہرے لگا دیے گئے اور اسی طرح کتابوں اور مطبوعہ مواد پر بھی۔ اگرچہ ہفتہ وار ملاقات ہر جمعے کو ہوتی رہی اور اس میں کبھی تعطل نہ آیا۔

گھر والے مختلف علاقوں سے صبح سویرے ہی قطنا آ جاتے اور ملاقات کی باری کا انتظار کرنے لگتے اور کتنے گھنٹے دروازے پر منتظر رہنے کے بعد انھیں اندر بلوایا جاتا۔ یہ ملاقات کے

پہلے قدم کی کامیابی ہوتی، ان زائرین کی مکمل جامہ تلاشی لی جاتی، ان کی لائی ہوئی اشیا کو ٹھونک بجا کر چیک کیا جاتا، ان سے ان اشیاء کو لانے کا سبب معلوم کیا جاتا، جو اشیا قانون کے مخالف معلوم ہوتیں انھیں چھانٹ کر الگ کر دیا جاتا اور وہ اشیاء بھی الگ کر لی جاتیں جن پر کسی تفتیشی اہل کار کی نظر خاص پڑ جاتی۔ وہ اسے اپنے لیے مانگ لیتا یا اس میں سے من مانا حصّہ وصول کر لیتا یا اسے عطیۂ خاص کے طور پر قبول کر لیتا۔ اگلے مرحلے میں زائر کو ہمارے سامنے لایا جاتا، ہمارے اور ان کے بیچ آہنی سلاخیں حائل رہتیں، پولیس اہل کار ان ہی گزرگاہوں کے بیچ آ جا رہے ہوتے اور کبھی تو ہماری گفتگو میں بھی شریک ہو جاتے تھے۔

وہ رات میں کبھی بھلا نہیں سکتی جب یہاں آنے کے بعد پہلی بار جمعہ کو ہماری ملاقات آنا تھی۔ ہمارے گھر والوں کو ہمارے متعلق خبر مل چکی تھی کہ ہمیں یہاں منتقل کیا گیا ہے۔ گزشتہ جمعہ غزوہ کے گھر والے آئے تھے اور میرا خیال تھا کہ انھوں نے میرے گھر والوں سے رابطہ کیا ہوگا۔ اس وقت تک مجھے معلوم نہ تھا کہ میرے گھر والے یہ خبر سننے کو زندہ نہیں رہے اور آٹھ ماہ قبل حمات کے واقعات میں وہ اپنی نذر پوری کر چکے ہیں، لیکن غزوہ کے گھر والوں کو یقیناً معلوم تھا۔ اگر چہ اس کی والدہ بھی اس واقعے میں شہادت کے رتبے پر فائز ہو چکی تھیں، اس ہفتے وہ غزوہ سے ملنے آئے تو انھوں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ حمات میں بڑی تبدیلیاں آ چکیں ہیں اور وہ میرے گھر کے بارے میں یقینی طور پر نہیں جانتے کہ کہاں واقع ہے۔ وہ مجھے ان حوادث کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگے، لیکن کسی نے بھی میرے اہل خانہ یا خاندان کے بارے میں تذکرہ نہ کیا۔ اگلی ملاقات میں ہماری ساتھی سناء کے گھر والے آئے، تو میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ دمشق میں میرے چچا کے گھر جائیں اور انھیں میرے بارے میں بتائیں اور جب وہ ان کے پاس گئے تو چچا نے انھیں میرے کنبے کی شہادت کے بارے میں بتایا، وہ میرے بارے میں خوف زدہ ہو گئے اور چچا کو میرے قطنا منتقل ہونے کے بارے میں کچھ نہ بتایا۔ اگلے ہفتے مجھے یہی کہہ دیا کہ انھیں چچا کا گھر نہیں مل سکا۔ اس سے اگلے ہفتے وہ کہنے لگے

کہ ہمیں گھر تو معلوم ہو گیا ہے مگر وہاں ایک خاتون بیمار تھیں اس لیے ہم نے انھیں آپ کے بارے میں بتانا مناسب نہیں سمجھا۔ مجھے محسوس ہونے لگا کوئی بات ضرور ہے جو مجھ سے چھپائی جارہی ہے۔ وہ چلے گئے تو میں نے سناء سے علاحدگی میں پوچھا:

آؤ میں تمھیں بتاؤں۔ تمھاری والدہ میری چچی کے پاس گئی ہیں اور میری چچی نے انھیں کچھ بتایا ہے۔ بتاؤ کیا بات ہے؟ کیا میرے والد فوت ہو گئے ہیں؟

وہ اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکی اور ہولے سے بولی:

اللہ ان پر رحم فرمائے۔

میں نے کہا: اللہ ان پر رحم فرمائے۔ اگر وہ فوت ہو گئے ہیں تو اللہ ان پر رحم فرمائے گا۔

وہ کہنے لگی: اتنے آرام سے کہہ رہی ہو "اللہ یرحمہ"۔

میں نے کہا کہ شاید جیل کے آلام انسان کے لیے بہت کچھ سہل بنا دیتے ہیں۔ اللہ ان پر رحم فرمائے اور اگر وہ فوت ہو گئے ہوں تو میں ان کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟ اگر میں دیواروں سے سر ٹکراؤں تو بھی وہ لوٹ کر نہیں آئیں گے۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور ابھی بات اس کے منہ میں ہی تھی جب میں نے اس سے پوچھا:

کیا ان کے علاوہ بھی کوئی فوت ہو گیا ہے؟

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے پوچھا: امی فوت ہو گئی ہیں؟

وہ بولی: اللہ ان پر رحم فرمائے۔

میں بے قراری سے چیخ اٹھی: میرے بہن بھائی؟ ان کے پاس کون ہے؟

وہ سسک اٹھی: وہ تمھاری ماں کے ساتھ ہی چلے گئے ہیں۔ وہ انھیں چھوڑنے پر راضی نہ

تھیں تو انھوں نے ان کو بھی ان کے پاس ہی بھیج دیا۔

میں نے اسے جھنجھوڑ کر کہا:

یہ کیا ہذیان بک رہی ہو۔ کیا تم مجھ سے مذاق کر رہی ہو؟ میرے سب بھائی بہن مر گئے؟

بولی: ہاں سب کے سب۔ اللہ ان سب کو اپنی رحمتوں میں رکھے۔ کیا اچھا نہیں ہو گیا، اگر ان میں سے کوئی بچ جاتا تو تمھیں اس کی پریشانی رہتی۔

میں بولی تو میری آواز کسی کنویں میں سے آ رہی تھی: اچھا خلاص۔ اب مزید کچھ نہ کہنا۔

اس سانحۂ ارتحال کی خبر کے بعد میں کچھ سننے اور سمجھنے کی حالت میں نہ رہی۔ اگلی ملاقات میں چچا جان اور چچی جان آئے، میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو چچی جان نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔

میں نے حیرت سے پوچھا:

چچی جان۔ آپ نے سیاہ لباس کیوں پہن رکھا ہے؟

وہ بدقت بولیں: بخدا ہم پر سیاہ دن آ گئے ہیں

میں نے پوچھا: کیا دادی جان فوت ہو گئی ہیں؟

وہ کہنے لگیں:

نہیں۔

میں نے کہا: پھر آپ نے سیاہ لباس کیوں پہن لیا ہے؟

چچا جان نے مجھے آنکھ سے اشارہ کیا کہ کوئی اور بات کروں، لیکن میں اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکی اور ان ہی سے سوال کیا:

چچا جان آپ نے مجھے اشارہ کیوں کیا ہے کیا کوئی بات ہے؟

وہ چچی جان کی حالت اور صدمے کے اثرات کے سبب کوئی بات دہرانا نہ چاہتے تھے،

اس لیے کہنے لگے:

کچھ نہیں۔ کچھ نہیں ہوا۔

میں نے چچی جان سے پھر کہا: ٹھیک ہے لیکن آپ نے سیاہ لباس کیوں پہن رکھا ہے؟ آپ دل شکستہ دکھائی دیتی ہیں۔

وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دیں اور چچا کے یہ کلمات میرے لیے کسی زلزلے کی مانند تھے:

تم ان سے کیسے پوچھ رہی ہو۔ کیا تمھیں خبر نہیں ملی؟

میں گویا اپنے حافظے میں سب باتیں دہراتے ہوئے گویا ہوئی:

ہاں۔ مجھے خبر ملی ہے کہ میرے گھر والے شہید کر دیے گئے ہیں، لیکن میں تو یہ پوچھ رہی ہوں کہ انھوں نے ماتمی لباس کیوں پہن رکھا ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ کہیں انھوں نے اسے میرے گھر والوں کی وجہ سے نہ پہنا ہو اور میں بھول گئی کہ انھیں اپنے بھائی کے گھر والوں کا صدمہ ہے۔ میرے چچا عجب حیرت سے میرے سامنے آ کر کہنے لگے:

یہ تمھارے گھر والوں پر صدمے میں ہے۔ سمجھیں تم!!

میں نے ٹھنڈے لہجے میں چچی جان سے کہا:

دیکھیے، اگر آپ آئندہ ماتمی لباس میں مجھ سے ملنا چاہیں تو بہتر ہے کہ نہ آئیں۔ کیوں کہ شہید زندہ ہوتے ہیں مردہ نہیں اور اگر آپ اس لیے غم زدہ ہیں کہ وہ زندہ ہیں تو پھر بھی میرے پاس نہ آیئے گا۔

## خلط ملط گواہیاں

یہ باتیں چچی جان پر سخت گراں گزر رہی تھیں، لیکن میری حالت ان سے بھی بری تھی اور پھر وہ زور زور سے رونے لگیں۔ چچا جان نے انھیں چپ کروانے کی کوشش کی اور وہ بڑی

مشکل سے خاموش ہوئیں، انھیں میری بات بھی سمجھ آ گئی اور اگلی مرتبہ جب وہ میرے پاس آئیں تو ماتمی لباس اتر چکا تھا۔ لیکن مجھے ابھی تک اپنے گھر والوں پر ٹوٹنے والے ستم کی تفصیل معلوم نہ ہوئی تھی۔ یہ سب مجھے ام ماجدہ سے معلوم ہوا۔ وہ ماجدہ کے والد کو اس سے ملاقات کروانے لائی تھیں۔ اس کے والد کا سر سفید ہو گیا تھا اور وہ اس کی گرفتاری کی خبر سن کر انھیں وہیل چیئر پر لائی تھیں۔ ماجدہ کو خبر ملی کہ وہ اس کے والد ہیں تو وہ چھلانگ لگا کر ان کے پاس پہنچی، ناقابلِ بیان خوشی کے لمحات نے اسے گنگ کر دیا، اس کی زبان پر گرہ لگ گئی اور کچھ دیر بعد اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور معذرت خواہانہ انداز میں بولی:

بخدا میں نے آپ کو پہچانا نہیں تھا۔ آپ کتنے بوڑھے ہو گئے ہیں۔

وہ بولے: اللہ کی قسم مجھے تو نے بوڑھا کر دیا ہے بیٹی۔

ماجدہ کے والد اخوان مخالف جماعت کے ممبر تھے اس لیے اس کا خیال تھا کہ اس گرفتاری پر وہ اس پر ناراضی کا اظہار کریں گے، لیکن جب وہ اس سے پہلی مرتبہ ملے تو رندھی آواز میں کہنے لگے:

''دیکھو بیٹا۔ میں یہاں سر اونچا کر کے آیا ہوں اور میرے لیے یہ بات شرف کی ہے اور میں اس پر الحمدللہ کہتا ہوں۔''

اور اگلی ملاقات میں ام ماجدہ آئیں تو ہماری خوشی دیدنی تھی اور ام ماجدہ نے سب سے پہلے مجھے وارف بھائی کی شہادت کے واقعے سے آگاہ کی۔ انھوں نے شروع سے ساری تفصیلات بتائیں۔ انھوں نے بتایا کہ خفیہ والوں نے جب امی کو جیل سے رہا کیا تو وہ ہمارے گھر کے باہر گھات لگا کر بیٹھ گئے، ان کا خیال تھا کہ بیٹے ماں سے ملنے ضرور آئیں گے اور وہ انھیں پکڑ لیں گے، لیکن جب ان میں سے کوئی بھی نہ آیا تو انھوں نے میرے والد کو تعذیب دینا شروع کر دی۔ وہ گاہے بگاہے انھیں مارتے ہوئے گھر کے سامنے واقع باغ میں لے آتے۔

کبھی لوگوں کے سامنے انھیں پیٹتے اور کبھی ان کی داڑھی کو آگ لگانے کی کوشش کرتے۔ انھیں سڑکوں پر گھسیٹتے اور ان سے انتہائی ذلت آمیز سلوک کرتے۔ وہ ان سے حقارت سے پیش آ کر دوسروں کو بھی دھمکاتے۔ میری والدہ اس ظلم وستم کو دیکھ کر گھر سے باہر نکل آتیں اور شور مچاتیں اور انھیں بددعائیں دیتیں۔ مسؤل الدوریہ نہایت ڈھٹائی سے کہتا:

''اپنے بیٹے ہمارے حوالے کردو، ہم تمھارے شوہر کو بھی چھوڑ دیں گے اور تمھاری بیٹی بھی تمھیں لوٹا دیں گے۔''

وہ اپنے مزاج کے مطابق غضب ناک ہو کر کہتیں: اسے اپنے ہاتھوں سے میرے حوالے کرو۔ تاکہ میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں اور اس کا ہاتھ تھام کر تمھیں بتاؤں کہ میرے باقی بچے کہاں ہیں، لیکن اللہ کی قسم کھا کر کہتی ہوں جب تک میری بیٹی میرے حوالے نہ کرو گے تمھیں کسی چیز کو ہاتھ نہ لگانے دوں گی، خواہ میری جان ہی چلی جائے۔

پھر حلب میں بھائی وارف کی شہادت کا سانحہ پیش آیا، (اس وقت ان کی عمر تقریباً اٹھارہ برس تھی) گھر پر حملے کے دوران انھیں اخوان ساتھیوں کے ہمراہ گرفتار کیا گیا اور یہ میرے گھر والوں کی شہادت سے کچھ دن پہلے کا واقعہ ہے۔ اتنی اچانک خبر کو امّی نے بڑے حوصلے سے سنا اور اپنے دل کے دبیز خانوں میں چھپا لیا۔ انھوں نے ابا جان کو بھی اس کی ہوا نہ لگنے دی جو پہلے ہی نیزوں کی زد پر تھے۔ امی بہت بے چین ہوتیں تو وارف کی تصویر اٹھا کر ام ماجدہ کے پاس چلی جاتیں اور وارف کی تصویر اپنے سینے سے لگا کر خوب رو لیتیں اور خاموشی سے آنسو پونچھ کر گھر چلی جاتیں اور ان زرد دنوں میں بھی وہ مجھ سے ملاقات کے وسیلے تلاش کرتی رہتیں۔ اسی طرح ایک مرتبہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ۔ ام ماجدہ کے ہمراہ کفر السوسہ جیل پہنچ گئیں اور ناصیف سے مل کر مجھ سے ملاقات کی اپنی سی کوشش کر لی، مگر ناصیف نے بڑے کٹھور پن سے یہ کہہ کر مایوس کر دیا:

اللہ کی قسم کھا کر افسوس سے کہتا ہوں، ہمارے ہاں اس نام کی کوئی قیدی نہیں۔

اُم ماجدہ کہتی ہیں کہ یہ جواب سن کر میری ماں پاگل ہونے کے قریب تھیں۔ وہ اس کے دفتر سے نکل کر ہمارے بلاک کے قریب آ گئیں اور ایک اہل کار سے بڑی منت سے کہا کہ وہ انھیں اشارتاً ہی بتا دے یا کوئی حرکت ہی ایسی کر دے کہ انھیں معلوم ہو جائے کہ ان کی بیٹی یہاں موجود ہے، لیکن اس ظالم نے اتنی مدد بھی نہ کی اور وہ اسی طرح سینے میں بھڑکتی آگ کے ساتھ واپس چلی گئیں اور یہی حالات حمات کے حوادث کی ابتدا تھی۔

## شہدا زندہ ہیں

ہم اس وقت کفرالسوسہ جیل میں ہی تھے جب ماہ فروری ۸۲ء میں حمات کا حادثہ پیش آیا، جس سے میں اس قید اور مشقت کے دوران میں بالکل بے خبر تھی، کڑے پہروں کے باوجود بھی کچھ کانوں میں اس کی بھنک پڑ گئی، لیکن افسر ناصیف نے انھیں سختی سے دھمکایا کہ وہ اس بارے میں کوئی بات نہ کریں، بلکہ میرے بارے میں خصوصی طور پر کہا کہ مجھے میرے گھر والوں کے انجام کے بارے میں کچھ نہ بتایا جائے، لیکن جب ہم قطنا جیل آ گئے تو کئی خبریں آ گئیں اور یہاں وہاں سے کتنے ہی دردناک اور اندوہ ناک قصے مجھ تک بھی پہنچ گئے۔ اُم ماجدہ جیل میں ملاقات کو آئیں تو ان سے بھی کئی تفصیلات معلوم ہوئیں، خاص طور پر میرے گھر والوں کے بارے میں تفصیلات سے انھوں نے ہی آگاہ کیا۔ انھوں نے بتایا کہ سب سے پہلے انھوں نے ہی خواب میں میرے چھوٹے بہن بھائیوں کو ایک چارپائی پر سوئے ہوئے دیکھا تھا، کہ وہ پانی میں ڈوبے ہوئے ہیں اور کتنی عجیب بات تھی کہ صاف عمدہ پانی کے اندر وہ زندہ تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ میری امی اندر داخل ہوتی ہیں اور اس پر لیٹ جاتی ہیں اور ان کی گود دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ جب وہ بیدار ہوئیں تو ان کا دل دھڑک اٹھا کہ میرے گھر والے کسی خطرے سے دوچار ہیں۔ وہ فوراً اٹھیں اور اپنے شوہر سے کہا کہ وہ میرے گھر والوں کا پتا لگائیں اور کوشش

کر کے انھیں اپنے ساتھ یہاں ہی لے آئیں۔ ماجدہ کے گھر والے ہمارے پڑوس ''حی طوافرہ'' میں طویل عرصہ رہنے کے بعد نئے محلے میں حمص روڈ پر منتقل ہو گئے۔ یہ عملاً دیہاتی علاقہ تھا اور پرانے شہر کا پورا چکر کاٹ کر وہاں جانا پڑتا تھا۔ ام ماجدہ کے شوہر فجر کی نماز کی ادائیگی کے فوراً بعد وہاں کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ حمات کے قریب پہنچے تو اس کے سب داخلی دروازوں پر سخت پہرے لگے ہوئے تھے۔ وہ ہر طرح کی کوشش کے بعد ناکام و نامراد واپس آ گئے اور پھر حالات ناگفتہ بہ ہو گئے۔ اندھے قتل اور تباہی و بربادی۔ حمات کا رابطہ بیرونی دُنیا سے مکمل طور پر منقطع کر دیا گیا تھا، جبکہ اس کی شاہراہیں ذبح خانوں میں تبدیل ہو گئیں اور اس کے باشندے سینکڑوں کی تعداد میں قتل ہونے لگے۔ اس دوران میرے چچا جان نے بھی کوشش کی کہ وہ دمشق کے راستے حمات میں داخل ہو کر میرے گھر والوں کا پتا لگائیں اور ان کی کسی طرح مدد کریں، مگر اس میں خود ان کی جان کو خطرہ تھا، اس لیے ان کی بیوی نے انھیں نہ جانے دیا اور دیگر ذرائع سے کوشش کرنے کو کہا۔ چچی جان خود آگے بڑھ کر ہمارے محلے تک پہنچ گئیں، مگر فوجیوں نے انھیں واپس لوٹا دیا اور انھیں کسی طرح آگے نہ جانے دیا، اس وقت میرے ابا جان کو شہید ہوئے چار دن ہو گئے تھے۔ ان کی میت سڑک پر پڑی تھی اور کسی میں اتنی جرأت نہ تھی کہ لاشے کو وہاں سے اٹھا ہی لیتا۔

## صرف روٹی کا ٹکڑا

ان کی شہادت کا واقعہ کچھ یوں ہے کہ ہمارے محلے کے کچھ افراد نے جدوجہد شروع کی اور حکومتی اہل کاروں پر چڑھائی شروع کر دی، تو ان کے خلاف حکومت نے محاصرہ کر دیا اور پورے محلے کی بجلی، پانی اور خوراک پہنچنے کے راستے بند کر دیے۔ میری معلومات کے مطابق یہ محاصرہ سات دن تک جاری رہا اور ہمارے گھر میں کھانا اور پانی بالکل ختم ہو گئے۔ اس کے باوجود میرے ابا جان باہر نکلے اور حکومتی اہل کاروں سے درخواست کی کہ بچوں کے لیے کچھ کھانا

دے دیں۔ میرے ایک ماموں جو قریب کے گھر کی کھڑکی کے سوراخ سے سارا منظر دیکھ رہے تھے، بتاتے ہیں کہ اس فوجی نے میرے ابا جان کو بری طرح ڈانٹا اور واپس لوٹنے کا حکم دیا، لیکن آدمی بھوک اور پیاس سے بلکتے ہوئے بچوں کو کب تک دیکھ سکتا ہے۔ ابا جان بے چین ہوکر دوبارہ باہر نکل آئے اور فوجی سے کہا:

''ہمیں چھوٹے بچوں کے لیے روٹی کا ایک ٹکڑا ہی دے دو۔

سپاہی نے جھڑک کر کہا: بہتر ہوگا کہ تم لوٹ جاؤ، اگر تم اپنے آپ کو آگ میں جھلسا اور زمین پر پڑا ہوا نہیں دیکھنا چاہتے تو فوراً واپس چلے جاؤ۔

ابا جان ایک لمحے کو اندر آئے، لیکن بچوں کے درد بھرے چہرے اور ان کا روتا بلکنا نہ دیکھ سکے اور ایک مرتبہ پھر باہر چلے گئے اور انھیں چیخ کر کہا کہ روٹی کا ایک ٹکڑا ہی دے دو، میرے بچے بھوک سے مر جائیں گے۔ اب کی بار فوجیوں کی جانب سے کوئی جواب نہ آیا، بلکہ ایک سنسناتی ہوئی گولی آئی اور ابا جان زمین پر گر پڑے۔ میرے ماموں کی چیخیں نکل گئیں اور وہ بے ہوش ہوکر گر پڑے۔ جب ان کی بہو انھیں اٹھانے کے لیے آگے بڑھی تو وہ فوجیوں کی نظر میں آگئی، انھوں نے ان کے گھر پر روشنی کا گولہ پھینکا اور تفتیش کے بہانے ریڈ شروع کر دیا اور گھر میں موجود سب افراد کو خواتین اور بچوں سمیت پکڑ کر لے گئے۔ ان ہی لمحات میں جب میرے بھائی ماہر نے گھر کے تہہ خانے میں گولی چلنے کی آواز سنی، جہاں سب لوگ ہائیڈ آؤٹ میں بیٹھے تھے۔ وہ حالات کی خبر لینے باہر نکلا۔ جب اس نے ابا جان کو اپنے سامنے گرا ہوا دیکھا تو وہ فوراً اندر گیا اور ''شبیبہ ثورۃ'' کا اسلحہ نکال لایا، جو ''امن ثورۃ'' کے دفاع کے لیے اسے دیا گیا تھا، لیکن ابھی تو اس کی اپنی عمر تیرہ برس بھی نہ ہوئی تھی۔ ماہر بھاگا اور فوج پر فائرنگ کرنے لگا جنھوں نے اس کے باپ کو مار دیا تھا، لیکن اس کی گولی ان تک پہنچنے سے پہلے ہی اس پر گولیوں کی بوچھاڑ ہوگئی اور وہ بھی شہید ہوگیا۔ اس واقعے کے بعد ناصیف نے ماجدہ اور میری دوسری ساتھیوں سے بڑی نخوت کے ساتھ کہا تھا:

"ہم نے اسے اسلحہ دیا تھا تا کہ وہ ہمارا دفاع کرے اور وہ ہمیں ہی مارنے اٹھ کھڑا ہوا، تو ہم نے اسے مار دیا۔ یہ سب لوگ خائن ہیں۔ اسی لیے ہم نے انھیں چار چار ٹکڑے کر دیا، یہ اخوان کی پنیری ہیں، یہ بھی بڑے ہو کر اخوان ہی بن جائیں گے۔

اس کے بعد میری امی ان پر روتی ہوئی باہر نکلیں، وہ انھیں برا بھلا کہہ رہی تھیں اور ان پر لعنت برسا رہی تھیں، ان ظالموں نے اپنے جرائم کی انتہا کر دی اور وہ ابھی دروازے تک بھی نہ پہنچی تھیں کہ ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی گئی۔ پھر وہ گھر کے اندر داخل ہو گئے اور گھر میں جو بھی نظر آیا اس کا کام تمام کر دیا: یاسر چار برس کا تھا اور قمر پانچ سالہ بیٹی تھی، رنا چھٹے برس میں تھی اور سات برس کی صفا نے ابھی نیا نیا سکول جانا شروع کیا تھا۔ ان سب کو مارنے کے بعد میری بیس سالہ بہن ظلال کو بھی شہید کر دیا۔ میرے تین بھائی جو باقی بچ گئے تھے ان میں سے صفوان شام سے باہر تھے اور غسان اور سامر حلب میں کسی مقام پر چھپے ہوئے تھے۔ بس یہی خاندان میں زندہ رہ گئے تھے، باقی سب نے تو اپنی نذر اکٹھے ہی پوری کر دی اور ان کے لاشے یوں ہی بے گور و کفن پڑے رہے، حتیٰ کہ جب شہر کا کریک ڈاؤن ختم ہوا اور قتل و غارت اور تباہی و بربادی کا سلسلہ ختم ہوا تو دوسرے مقتولین کے ساتھ ان کو بھی کسی تمیز اور تخصیص کے بغیر اجتماعی طور پر دفن کر دیا گیا اور جب لوگوں کے لیے ممکن ہوا کہ وہ اپنے گھروں سے نکل کر اس تباہی کے اثرات دیکھیں، تو میرے چچا اور چچی جان بھی ان کا حال پتا کرنے نکلے، مگر انھیں ہمارے گھر سے دروازے کے پاس گرا ہوا میری امی کا دوپٹہ ملا، جو بیچ میں خون سے بھرا ہوا تھا اور گھر کے فرش اور دیواریں میرے بہن بھائیوں کے خون سے لتھڑی ہوئی تھیں، مگر ان کی میتوں کا کوئی پتا نہ تھا۔

## آؤ جہاد کی طرف

میرا چودہ برس کا بھائی عامر بھی ان ہی حادثات کے دوران شہید ہوا مگر اپنے گھر سے دور، شارع ۸ آزار میں۔ امی نے عامر کو ہمارے چچا جان جو سعودیہ گئے ہوئے تھے ان کے ہاں

دادی جان کے پاس رہنے کے لیے بھیج دیا تھا، کیونکہ خالی گھروں پر خفیہ والے قبضہ کر لیتے اور اس کا سارا سامان چوری کر لیتے، تاہم حقیقت میں خفیہ والوں نے یہاں آ کر جو کچھ کیا وہ اس سے بھی بدتر تھا۔ انھیں وہاں ایک آلۂ موسیقی نظر آ گیا۔ ایک اس پر بیٹھ کر اسے یوں ہی بجانے لگا اور باقی بلا روک ٹوک کمرے کی دوسری اشیاء کو چھیڑنے لگے۔ پھر انھوں نے اپنے فاجرانہ قہقہوں کے درمیان میری دادی سے مطالبہ کیا کہ وہ رقص کریں، اس وقت عامر پلنگ کے نیچے چھپا ہوا تھا اور وہ ہر حال میں اسے ان کی نظروں سے بچانا چاہتی تھیں۔ بس میری ستر سالہ دادی ان کا مطالبہ پورا کرنے کے لیے یوں ہی کھڑے ہو کر ہاتھ پاؤں چلانے لگیں، تاکہ وہ دوسری جانب مشغول رہیں۔ وہ یوں ہی چیزیں ادھر ادھر گراتے اور توڑتے ہوئے باہر نکل گئے۔ جاتے ہوئے حسب عادت کئی اشیاء لوٹ کر بھی لے گئے۔ ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد منادی کرنے والے کی آواز سنائی دی: ''حی علی جہاد۔ آؤ جہاد کی طرف''۔ میرا بھائی اسی وقت اٹھا اور اس نے وضو کیا، دو رکعت نماز سنتِ شہادت ادا کی اور اپنی گھڑی اتار کر دادی جان کو دے کر کہا:

''یہ گھڑی میری نشانی کے طور پر رکھ لیں اور اسے میری امی جان کو پہنچا دیں اور ان سے کہنا کہ میرے لیے دعا کریں۔''

پھر وہ چھلانگیں لگاتا باہر نکل گیا۔ میری دادی اسے آوازیں ہی دیتی رہ گئیں، مگر اس نے مڑ کر نہ دیکھا۔ اسے دیکھنے والوں نے دیکھا کہ وہ طویل بازار سے گزر کر اس عمارت میں داخل ہو گیا جہاں اخوان پناہ گزین تھے۔ وہاں سے وہ صرف ایک بار ہی باہر نکلا۔ وہ ننگے پاؤں پھٹے ہوئے کپڑے پہنے پڑوس کے ایک گھر میں گیا اور ان سے کھانے پینے کا کچھ بھی سامان اور کپڑے مانگے، اس نے انھیں بتایا کہ اس کے ساتھی بھوک اور سردی سے ٹھٹھر کر مر رہے ہیں۔ جس گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا ان کے ہاں بیٹے نہیں تھے صرف بیٹیاں تھیں۔ پہلے تو وہ کچھ ہچکچائے پھر انھوں نے اسے بیٹیوں ہی کی جیکٹس اور کھلے گھیر والی فراکیں دے دیں کہ ہوسکتا ہے وہ نوجوانوں کے کسی کام آ جائیں۔ انھوں نے کچھ کھانا بھی تیار کر کے دے دیا، اگلے روز عامر

اسی سڑک پر شہید پایا گیا۔اس کے ساتھیوں کو پتا چلا تو وہ آئے اور اسے اس مسجد کے احاطے میں دفن کر دیا جسے خفیہ والوں نے شہید کر دیا تھا۔ان حادثات کے ختم ہونے کے بعد وہ دوبارہ آئے اور اسے قبرستان منتقل کر دیا، لیکن افسوس ہم اس کی قبر کے بارے میں بھی نہ جان پائے کیونکہ اسے جس ساتھی نے دفن کیا وہ خود بھی بعد میں شہید ہو گیا۔

اس طرح جب یہ خبر مجھ تک پہنچی تو مجھے والدین اور آٹھ بہن بھائیوں کی شہادت کی ایک ساتھ خبر ملی اور آخر کار وہ خبر مجھے مل ہی گئی جسے میری ساتھی قیدی خواتین مجھ پر رحم کرتے ہوئے اور مجھے غم میں مبتلا نہ کرنے کی خاطر اتنا عرصہ چھپائے ہوئے تھیں۔یہ الگ بات ہے کہ اس خبر کا مجھ پر ایسا اثر نہ ہوا جو یہ سمجھ رہی تھیں اور الحمد للہ، اللہ نے مجھے اس ناگہانی خبر پر بھی صبر اور حوصلہ دیا، بلکہ مجھ سے ان کا غم زیادہ تھا جو اس راہ میں کھو گئے تھے، کیونکہ یہ سب تو ان شاء اللہ شہادت کے درجے پر فائز ہوں گے اور شہادت کی آرزو تو ہر مسلمان کرتا ہے اور یہ ہمارے دلوں کی سب سے بڑی آرزو ہے، تو میں اس بات پر کیسے غم زدہ ہو سکتی ہوں جو مجھے خود محبوب ہے، بلکہ سب لوگوں کی تمنا ہے۔ہم موت سے اسی لیے تو ڈرتے ہے کہ ہمارے اعمال کے بارے میں سوال ہوگا اور ہم سے حساب لیا جائے گا اور امتحان ہوگا۔رہی شہادت، تو یہ حقیقی زندگی ہے اور یہ نعمت تو بڑے نصیبے والوں ہی کو ملتی ہے۔

## بانجھ پن کے انجکشن

دن گزرنے لگے، زندگی میں تھکاوٹ اور بوریت بھر گئی تھی، ایسا لگتا تھا جیسے سینے پر کسی نے بھاری چٹان رکھ دی ہو اور اس کے بوجھ سے سانس گھٹتا رہتا ہو اور پھر امراض ایک ایک کر کے میرے جسم پر حملہ آور ہونے لگے، گویا میں ان کا شکار ہوں۔اس سے پہلے تو میں کبھی اس کیفیت کا شکار نہ ہوئی تھی اور جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک درندہ صفت ڈاکٹر کے ہاتھوں میں تھی، ہاں وہ اسی نظام میں پرورش پانے والا ایک ڈاکٹر ہی تو تھا، جو کسی راہزن سے بھی بڑھ کر تھا۔

اس نے میرے مرض کو ہتھیار بنالیا اور میرے ساتھ وہ سلوک کیا جس کا خیال کبھی ابلیس کو بھی نہ آیا ہوگا۔

ڈاکٹر سمیر جسے وزٹنگ ڈاکٹر کے طور پر تعینات کیا گیا تھا، وہ مجرم خواتین کا علاج کرتا تھا، لیکن جب جیل میں سیاسی قیدیوں کی تعداد بڑھ گئی تو ان کی صحت کے مسائل بھی سامنے آنے لگے۔ ان میں سے جس کی حالت زیادہ خراب ہوتی، اسے ڈاکٹر کو دکھا دیا جاتا اور وہ ان پر رحم کھاتے ہوئے انھیں مسکن ادویات کی چند گولیاں دے دیتا اور یہ سمیر انتہائی گھٹیا ڈاکٹر تھا جو ہم سے کسی معالج کی طرح نہیں بلکہ کسی تفتیشی افسر کی مانند بات کرتا تھا۔ جب ہم اسے اپنی کیفیت بتاتے تو وہ نہایت استہزاء کے ساتھ ایک ہی بات دہراتا: ''تمھیں تو کوئی بیماری نہیں'' اور اس کا یہ جملہ ہم نے اس تکرار کے ساتھ سنا کہ ہم نے اس سے کچھ پوچھنا ہی چھوڑ دیا۔ میرے مرض کی ابتدا یوں ہوئی کہ کفر السوسہ میں لگنے والے زخموں میں سے ایک تازہ ہو گیا اور اس میں تکلیف شروع ہو گئی۔ درد اس قدر بڑھ گیا مجھے اس کے پاس جانا پڑا، میں نے اسے اپنی تکلیف بتانا شروع کی تو وہ درمیان ہی میں میری بات کاٹ کر بولا:

اس معمولی تکلیف کی کوئی دوا نہیں، اس کا تو خود ہی علاج کرلو۔

اور یہ اللہ کا خصوصی کرم تھا کہ وہیں ایک قیدی کے رشتہ دار نے جو ماہر ڈاکٹر تھے، میرا زخم دیکھ لیا اور چپکے سے دوا بھی بھجوادی۔ میں ان کا حسن سلوک بھلا نہیں سکتی۔ ان کی اس عنایت سے آہستہ آہستہ زخم بھی بھرنے لگا، لیکن کئی دوسرے امراض مجھے گھیرنے لگے، ابتدا میں میرے ماہانہ معمولات ڈسٹرب ہو گئے اور مجھے شدید تکلیف شروع ہو گئی۔ میری حالت بدتر ہوتی چلی گئی اور میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ میں ایک مرتبہ پھر ڈاکٹر سمیر کے پاس جاؤں اور اس سے درخواست کروں کہ مجھے اس تکلیف سے چھٹکارے کے لیے کوئی دوا دے، خواہ وہ نیند آور ادویہ ہی کیوں نہ ہوں۔ اس کے چند دن بعد اس نے خود الحاجہ مدیحہ کو بلوایا اور بتایا کہ کمیٹی نے میری تکلیف کو دیکھتے ہوئے علاج کی غرض سے کچھ انجکشن لگانے کی تجویز دی ہے اور وہ عملاً

مجھے دوا انجیکشن لگا چکا تھا جب اچانک وہی مہربان ڈاکٹر ہسپتال آیا، اس کی رشتے دار خاتون کی میری تکلیف اور علاج کے بارے میں اسے بتایا، تو اس نے وہ انجیکشن دکھانے کو کہا۔ انھیں دیکھ کر اسے اپنی بصارت پر یقین نہ آیا، وہ بے بسی سے چلایا:

یہ انجیکشن درد دور کرنے کے لیے نہیں، بانجھ پن پیدا کرنے کے لیے ہیں۔

وہ غصّے سے چلاتا ہوا اسی وقت مدیر منطقہ اور جیلر کے پاس پہنچا اور انھیں ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ ڈاکٹر سمیر کو فوری طور پر نکال دیا گیا اور پھر کبھی ہمیں اس کی خبر نہ ملی۔ لیکن مجھ سے کوئی بھی استفسار کرنے نہ آیا اور نہ ہی اس جرم کی کوئی تحقیق کی گئی، بلکہ حد تو یہ ہے کہ اس کی جگہ کوئی دوسرا ڈاکٹر بھی تعینات نہ کیا گیا اور خواتین کو طبی سہولتوں سے مکمل طور پر محروم کر دیا گیا۔

## اجابت یا خون

ڈاکٹر سمیر نہ معلوم کہاں چلا گیا، لیکن میری تکلیف اور درد جوں کے توں موجود رہے۔ نہ ختم ہونے والی آزمائش۔ بلکہ میں جسم کے کئی حصّوں میں تکلیف محسوس کرنے لگی۔ نہ جانے کتنے ماہ میں اسی حالت میں رہی۔ ایسا لگتا تھا میرا وجود ہولے ہولے ختم ہو رہا ہے۔ مجھے مستقل طور پر اسہال کی شکایت رہنے لگی جو بعد میں خونی پیچش میں تبدیل ہو گئی۔ میری صحت اس قدر خراب ہو گئی کہ مجھے زندہ بچنے کی امید نہ رہی اور جون ۱۹۸۴ء ۱۴۰۴ کا رمضان کا مہینہ اس طرح گزرا کہ میں ایک بھی روزہ نہ رکھ سکی، حتیٰ کہ نماز کی ادائیگی بھی ممکن نہ رہی۔ میں ہر وقت آہیں بھرتی اور کراہتی رہتی اور سارا بلاک میری کراہوں کے سبب سو نہ سکتا۔ کمزوری اس قدر بڑھ گئی تھی کہ میں خود سے غسل خانے تک بھی نہ جا سکتی اور لڑکیاں مجھے اٹھا کر لے جاتیں۔

ان ہی دنوں جیل میں کھٹمل پھیل گئے اور یوں میری آزمائش مزید بڑھ گئی۔ اگر کسی لمحے تکلیف کم ہوتی تو کھٹمل خون چوسنا شروع کر دیتے اور ایک نئے الم کا دروازہ کھل جاتا۔ اللہ ماجدہ کو دنیا و آخرت میں بہترین جزا دے، جب وہ مجھے بے چین دیکھتی تو میرے تکیے کی جانب بیٹھ

کران کھٹملوں کو میرے جسم سے چنتی اور مارتی رہتی۔ آخر کار جب میں موت سے کچھ فاصلے پر تھی جیل کے عملے کو میرا خیال آ گیا اور مجھے جیل سے نکال کر سپیشلسٹ ڈاکٹر کو دکھانے کے احکامات صادر کر دیے گئے۔ وہ مجھے پولیس وین میں لے کر قطنا کی ایک میڈیکل سپیشلسٹ لیڈی ڈاکٹر سے معائنہ کروانے لے گئے۔ اس نے مجھے نیند آور انجکشن دیا اور سٹول ٹیسٹ کروانے کے لیے جیل کے متعلقہ اہل کار کو دیا جو مجھے یہاں لے کر آیا تھا، وہ نمونہ دیکھ کر حیرت سے چلایا:

''یہ پاخانہ ہے یا خون۔ یا اس بوتل کا رنگ ہی سرخ ہے؟

لیبارٹری رپورٹ کو دیکھتے ہوئے مجھے انجکشن کا کورس کرنے کی سفارش کی گئی۔ ام معقل مجھے روزانہ چھ انجکشن لگاتیں، لیکن میری حالت پھر بھی نہ سنبھلی۔ جیل حکام نے کفر السوسہ کے امن دولہ کے ادارے کو میری کیفیت لکھی اور میرا علاج مواسات ہسپتال میں کروانے کی اجازت طلب کی اور وہاں کے میڈیکل بورڈ نے اجازت دے دی۔ اگلے ہی روز مجھے پولیس وین میں نیم غنودگی اور نیم بیداری کے عالم میں ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ وہاں میڈیکل کالج کے طلبہ بھی موجود تھے۔ وہ اس طرح لپک کر میری جانب بڑھے گویا ان میں سے ہر ایک میرا معائنہ کرنا چاہتا ہو، لیڈی ڈاکٹر آگے بڑھی اس نے میرا جلباب اتارا اور تیزی سے معائنہ کیا۔ اس نے مجھے بے ہوشی کا انجکشن لگا دیا، اس کے بعد مجھے کچھ احساس نہ رہا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں پھر سے بلاک میں تھی۔ میرے اردگرد اس طرح سب قیدی کھڑی تھیں گویا میں حالت نزع میں ہوں اور چند گھڑیوں کی مہمان ہوں۔ کچھ ہی دیر میں مسکن انجکشن کا اثر ختم ہو گیا اور میرے سارے درد بھی جاگ اٹھے۔ دو تین روز بعد وہ مجھے پھر ہسپتال لے گئے، لیکن اس سے ہر بار میری تھکن اور تکلیف میں اضافہ ہی ہوتا۔ یہ آخری بار کی بات ہے کہ میری ساتھی قیدی نے مجھے بتایا کہ اس کا رشتے دار ڈاکٹر مجھے وہاں میرے بھائی اور چچا زاد بہن کے ساتھ ملنے کی کوشش کرے گا، جو اسی ہسپتال میں کام کرتا ہے۔ وہاں پر وہ مجھے فوراً اوپر کی منزل میں لے گئے،

جہاں بڑی توجہ سے میرا اسارا معائنہ کیا گیا۔ وہیں میں نے دیکھا کہ ایک ڈاکٹر تیزی سے بھاگتا ہوا میرے پاس آیا اور حیرت سے پوچھنے لگا:

''آپ صفوان دباغ کی بہن تو نہیں؟

میں نے کہا: ہاں

وہ کپکپاتے ہونٹوں سے بڑی مشکل سے بولا: اسے کیا ہوا اور آپ کیوں قید میں ہیں؟ اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ آہستگی سے بولا: اللہ آپ کی مدد فرمائے۔

ایسا لگ رہا تھا وہ اپنے آنسو بہنے سے روک رہا ہے۔

معائنے کے دوران اس نے چپکے سے بتایا کہ وہ کالج میں صفوان کا ہم جماعت تھا اور یہ بھی کہ وہ کوشش کرے گا کہ مجھے ہسپتال میں ایڈمٹ ہونے کی اجازت مل جائے، تا کہ میرا مکمل علاج ہو سکے۔ اس نے میری رپورٹ میں اس کی سفارش کی۔ جیلر تو مان گیا لیکن ہنوز امن ادارے کی موافقت درکار تھی۔ میرے ساتھ آئے ہوئے پولیس اہل کار نے بھی اس پر خوشی کا اظہار کیا۔ اس نے مجھے کہا کہ میں ہسپتال کے دروازے پر ہی اپنے بھائی کے ساتھ اس کا انتظار کروں اور وہ ابھی امن دولہ سے اجازت لے کر آتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسے تجن قلعہ ہی سے موافقت کے احکامات مل جائیں۔

## فرار کا سنہری موقع

پولیس وین چلی گئی، مجھے کمزوری کے سبب چکر آ رہے تھے۔ مجھے اپنے سامنے زینہ بھی نظر نہ آ رہا تھا، میرا بھائی میرا ہاتھ پکڑ کر اس طرح مجھے گھسیٹتے ہوئے لایا گویا میں اندھی ہوں۔ ہم دونوں انتظار میں بیٹھ گئے۔ اچانک بھائی کے دل میں نجانے کیا خیال آیا، کہنے لگا:

کیا خیال ہے اگر ہم ابھی فرار ہو جائیں، مجھے اس بیماری میں نہ تو آزادی درکار تھی نہ کوئی خوشی۔ میں نے کہا:

میں نہیں چاہتی۔ وہ کسی بھی ناکے سے ہمیں دوبارہ پکڑ لیں گے اور پھر آزمائشیں دو چند ہو جائیں گی۔

ابھی چند منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ پولیس وین دوبارہ آ گئی اور اہل کار کہنے لگے کہ یہاں بیٹھ کر اکتانے سے بہتر ہے کہ آپ بھی ہمارے ساتھ ہی چلیں۔ گاڑی فراٹے بھرتی دمشق کی سڑکوں پر دوڑنے لگی اور اس کے قدیم محلوں کے درمیان واقع تجن قلعہ پہنچی۔ میں نے دیکھا کہ بازاروں میں گاہک اور دکاندار بھاؤ تاؤ میں مشغول تھے اور طلبہ اور ملازمین، مزدور اور تاجر اپنی زندگیوں میں کس قدر مشغول تھے، انھیں کسی دوسرے کو دیکھنے اور سننے کی فرصت کہاں تھی۔ زندگی کی مشقت نے انھیں اس قابل کہاں چھوڑا تھا کہ وہ جان سکیں کہ ان ہی کے ملک میں کچھ لوگ کس طرح ظلم کی چکی میں پیسے جا رہے ہیں۔ تجن قلعہ میں پہنچتے ہی اہل کار منظوری کے دستخط کروانے بھاگا، لیکن متعلقہ اہل کار نے ساری بات سننے کے بعد سر ہلا کر انکار کر دیا اور درخواست رد کر دی۔ گزشتہ کئی برسوں سے میں جو کچھ برداشت کر رہی تھی مجھے اس انکار پر ذرا بھی حیرت نہ ہوئی۔ ہم تجن قطنا واپس لوٹ آئے اور زندگی ستم زدہ ایام کی تاریخ رقم کرنے لگی۔ میری قیدی ساتھی کا رشتے دار ڈاکٹر اس سے ملنے آتا تو میرے لیے بڑی باقاعدگی سے دوائیں لے آتا اور یوں میری حالت آہستہ آہستہ بہتر ہونے لگی اور تقریباً ایک ماہ بعد میں پہلی مرتبہ اس قابل ہوئی کہ کسی کے سہارے کے بغیر خود حمام میں جا سکوں اور اگلے دو برس تک میں اس قابل نہ تھی کہ سیل میں کوئی خدمت انجام دے سکوں۔ باقی ساتھی باری باری یہ کام کرتی رہتیں، بلکہ میں بھی مکمل طور پر ان پر بوجھ بن چکی تھی۔ وہی مجھے غسل کرواتیں، میرے کپڑے دھوتیں اور جس قدر ممکن ہوتا میرے لیے صحت بخش غذا، مشروبات اور طاقت ور چیزوں کا بندوبست کرتیں۔

## گمشدہ بچہ

جیل جہاں ستم کا گھر ہے وہاں اسی طرح حیرتوں کا سمندر بھی ہے۔ اس سمندر میں آپ

کسی بھی وقت کسی بھی چیز کی توقع کر سکتے ہیں اور آپ کو ایسے ایسے واقعات دیکھنے کو ملتے ہیں کہ آپ یقین بھی نہ کر سکیں۔ جیل میں آدمی ایک عجیب و غریب اور پر اسرار دُنیا میں داخل ہوتا ہے اور قید کی مدت پوری ہونے تک آپ اس کی کھلی اور چھپی حقیقتوں کو آنکھیں پھاڑے دیکھتے رہتے ہیں۔ یہاں پر ایک گم شدہ بچہ لایا گیا، جسے گشتی پولیس نے دمشق کے ایک محلے سے پکڑا تھا اور غیر متوقع طور پر یہ واقعہ کافی دن تک چلتا رہا۔

یہ احساس ہی ذہن میں کرب پیدا کرتا تھا کہ ایک چھے برس کا بچہ جیل میں رہے اور خاص طور پر وہ عادی مجرم خواتین کے سیل میں رہ رہا ہو، لیکن پولیس نے اسے پکڑا اور اس کے گھر والوں کے ملنے تک اسے اسی سیل میں چھوڑ دیا، لیکن پانچ ماہ گزر جانے کے بعد بھی نہ تو اس کے گھر والوں کا سراغ ملا نہ ہی کسی رشتے دار کی خبر مل سکی۔ ہم اسے حسرت سے دیکھتے اور یہ حسرت اس وقت دوچند ہو گئی جب ہمیں معلوم ہوا کہ بچہ گونگا بھی ہے اور اپنا نام تک نہیں بتا سکتا۔ بس سب نے خود ہی اسے احمد کہہ کر پکارنا شروع کر دیا اور قیدی خواتین کو تو احمد کے روپ میں ایک مطیع خادم مل گیا۔ وہ اس کے لیے احکامات صادر کرتی رہتیں، بلکہ اگر ذرا سی کوتاہی بھی دیکھتیں تو بعض اوقات اس کی پٹائی کر دیتیں۔ ایک روز جب میں افطار کے بعد بلاک کی کھڑکی میں بیٹھی مٹھائی کھا رہی تھی اور افطار کے بعد کھڑکیاں ہوا کے لیے کھول دی جاتی تھیں، احمد میرے قریب پڑے ڈبے میں جھانک کر کہنے لگا:

''ایک مجھے بھی دیں''۔

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ کتنے مہینے بیت گئے، وہ یہاں رہ رہا تھا، اس نے کبھی ایک حرف بھی نہ بولا تھا اور اب وہ اچانک ہی بولنے لگا تھا وہ بے اختیار چلا کر بولی:

لڑکیو سنو۔ احمد بات کر سکتا ہے۔

ہم نے اس سپاہی کو بتایا تو وہ لاپروائی سے کہنے لگا:

چھوڑ وا سے، اب وہ تمھارے پاس رہے گا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ہم سے انسیت محسوس کرنے لگا ہے۔

ہم سب اس کے گرد جمع رہتے اور وہ بھی فطری انداز میں ہم سے باتیں کرتا رہتا تھا۔

الحاجہ نے اس سے بڑی اپنائیت سے اس کا نام پوچھا، وہ بولا:

احمد بدر دین۔

انھوں نے پھر پوچھا:

تمھارے والدین کہاں سے ہیں؟

بولا: میں حمات سے ہوں۔

ہم سب اس کے جواب پر حیران رہ گئے، انھوں نے پھر پوچھا:

تم شام کس طرح آ گئے؟

وہ بڑی عاجزی اور مسکنت طاری کر کے بولا: میں بھی ان لڑکوں کے ساتھ تھا جنھیں حمات سے قتل و غارت کے دوران پکڑا گیا، مجھے یہاں لا کر انھوں نے جامع اموی میں چھوڑ دیا، پھر مجھے کچھ احساس نہیں کہ میں کہاں نکل گیا۔

الحاجہ نے سوال کیا: اور تمھارے گھر والے کہاں ہیں؟

وہ پھوٹ کر رونے لگا: وہ مر گئے۔

وہ آہستگی سے بولیں: کیسے؟

بولا: میری امی نے مجھے ابو کے پاس دکان پر بھیجا، وہاں پہنچا تو سب کچھ الٹا ہوا تھا، دکان کی دیوار گر چکی تھی اور میرے والد اس کے نیچے دبے ہوئے تھے، ان کی میت سے خون بہہ رہا تھا۔ میں بھاگ کر والدہ کو بتانے گیا تو وہ بھی قتل ہو چکی تھیں۔

پھر وہ مضطربانہ الحاجہ کی جانب لپکا اور ہولے سے بولا: آپ یہ سب کسی سے نہ کہیے گا۔

اگر کسی نے مجھے اس نام سے پکارا تو میں جان جاؤں گا کہ اسے آپ ہی نے بتایا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ کسی کو نہیں بتائیں گی۔

ہم سب بچے کی حالتِ خوف کو سمجھ رہے تھے اور ہمارے دلوں میں اس کے لیے گداز تھا۔ ہم سب لڑکیاں اسے بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں۔

ایک روز جب میں ہاتھ کی مشین سے کچھ سلائی کر رہی تھی تو وہ میرے پاس کھسک آیا اور یہ مشین بھی رغداء کے والدین کی بڑی منت سماجت کے بعد ہمیں جیل میں ملی تھی وہ مجھے کہنے لگا: خدا کے لیے آپ میرے سامنے مشین نہ چلائیں۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی کو سلائی کرتے دیکھوں۔

میں نے پوچھا: کیوں؟

تو وہ رو پڑا۔ الحاجہ اسے ایک جانب لے گئیں اور اسے بڑی مشکل سے بولنے پر راضی کیا:

میری امی بھی درزن تھیں اور ان کے پاس بھی ہو بہو جیسی ہی مشین تھی۔

میری امی بھی ایسی ہی جائے نماز سلائی کرتی تھیں جیسی یہ کر رہی ہیں۔

اسی طرح ہم نے ایک مرتبہ عائشہ کو عیشہ کہہ کر بلایا تو وہ بگڑ گیا، بولا:

خدا کے لیے اسے عیشہ نہ کہو۔

انھوں نے پوچھا: پھر ہم اسے کیا کہیں؟

بولا: آپ انھیں ام نظارات کہہ کر بلا لیں۔

میں نے مداخلت کی: لیکن کیوں؟

کیوں کہ میری امی کا نام عائشہ ہے۔

اور تمھارے ابو؟ وہ کیا کرتے تھے؟

ان کا قرآن پاک کا مکتبہ تھا۔

کہاں؟

اس نے اس طرح اس کے بارے میں بتانا شروع کیا گویا اسے آنکھوں سے دیکھ رہا ہو۔

ہم اس کی حالت دیکھ کر پسیج کر رہ گئے اور اس پر مزید شفقت شروع کر دی۔

ہمارے ساتھ رہتے ہوئے احمد روز بروز مزید کھل رہا تھا۔ وہ عام بچوں سے بہت مختلف بچہ تھا۔ عبقری قسم کا۔ وہ ہمیں جو بھی کام کرتے دیکھتا بڑی تیزی سے سیکھ لیتا۔ وہ بڑی پیاری آواز میں اذان دیتا اور خوش الحانی سے تلاوت کلام پاک کرتا اور جب نماز پڑھ چکتے تو وہ ہمیشہ ایک ہی دعا مانگتا: اے اللہ اس جیل پر ایک بم گرا دے تاکہ یہ تباہ ہو جائے۔

جیلر صاحب کے کان تک بچے کی بپتا پہنچی تو وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کے اندر کا مہربان شخص جاگ اٹھا، وہ اسے اپنے گھر لے گئے اور نہلا دھلا کر صاف کپڑے پہنائے۔ ایک افسر کی ایک بیٹی اور بیٹا اسی کے ہم عمر تھے، وہ ان دونوں کے ساتھ اسے بھی پیرا کی پر لے جاتے۔ انھوں نے ایک گاڑی اور ڈرائیور اسے جیل سے گھر اور گھر سے جیل لے جانے کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ ایک مرتبہ وہ اسے ساتھ لے کر ایک سٹور میں گئے جہاں سے وہ گھر کا سودا سلف لایا کرتے تھے۔ کچھ دنوں میں بچہ خود سے اس سٹور پر جا کر اس افسر کے نام سے سامان خریدنے لگا۔ وہ یہ اشیا ایک ڈبے میں ڈال کر ریلوے سٹیشن لے جاتا اور انھیں بیچ کر جیل واپس آجاتا تھا۔ گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ مہربان افسر اسے گھر میں موجود نہ پا کر سمجھتا کہ وہ جیل میں ہے اور ہم یہ سمجھتے رہتے کہ وہ اس کے گھر میں ہے۔ حتیٰ کہ مہینہ مکمل ہو گیا۔ اسے دکاندار کی جانب سے ایک بھاری بل ملا تو وہ چکرا کر رہ گیا۔ دکاندار نے جب وضاحت کی کہ یہ تمام اشیاء احمد اس کے نام پر لے کر گیا ہے، تو وہ سن ہو کر رہ گیا۔

## بچے کی دہری شخصیت

احمد ایک کہانی کا کردار بن گیا، وہ جیل کی قابل قدر شخصیت بن گیا تھا۔ دوسروں کے

ملاقاتی اس کے لیے بھی تحائف لے کر آتے، بلکہ ملاقاتی آپس میں جھگڑا کر کے اس سے ملنے میں بازی لے جانے کی کوشش کرتے تھےاور سب کی عنایات نے اسے کچھ خودسر بھی بنا دیا تھا، بلکہ وہ اتنا نازک مزاج ہو گیا تھا کہ اگر کوئی اسے ذرا سی کوئی بات کہہ دیتا یا پوچھ لیتا کہ یہ کیوں کیا؟ تو اس کی نکسیر بہہ نکلتی اور وہ بے ہوش ہو جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ کچھ لوگوں کی آنکھ کا تارا اور کچھ لوگوں کے لیے ناقابل برداشت ہو گیا۔ وہ معمولی بات پر قیدی خواتین کی شکایت سپاہی سے کر دیتا اور جواباً انھیں ملاقات کی بندش کی دھمکی مل جاتی۔

اور اس کا اصل راز بھی ایک روز فاش ہو گیا، الحاجہ مدیحہ اپنے اقارب سے ملاقات کرنے جا رہی تھیں جن کا تعلق حمص سے تھا، انھوں نے اسے نیا جوڑا پہنایا، وہ اسے پہلو میں لیے بیٹھی تھیں کہ ایک سپاہی پکارا:

سمیر جفان۔

لڑکا ایک دم ڈر گیا اور اس کی ناک سے نکسیر بہنے لگی اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ الحاجہ نے حیرت سے پوچھا:

آپ کس پر چلا رہے ہو؟

وہ بولا: دیکھ نہیں رہی یہ کیسے زمین پر گر پڑا ہے، اسی کو پکارا ہے۔

بولی: وہ کیوں؟

کہنے لگا: اس کا نام احمد نہیں ہے۔ اس کا اصلی نام سمیر جفان ہے۔ کیا کچھ عرصہ قبل تم نے ٹیلی وژن پر اس کے لیے اعلان نہیں سنا؟ اسے تو ہر جگہ تلاش کیا جا رہا ہے۔

مجھے یاد آیا کہ اس نام کا اعلان تو ہم نے سنا تھا۔ ٹی وی پر تصویر بھی دکھائی جا رہی تھی، مگر احمد نے کھیلتے کھیلتے ٹی وی بند کر دیا تھا اور ہم نے اسے کوئی اہمیت نہ دی تھی۔ لوگ حیرت اور تعجب سے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگے اور ایک سن رسیدہ شخص سر جھکائے روتے

ہوئے آگے بڑھا۔ ہمیں پتا چلا کہ وہ اس کا والد ہے۔ سپاہی اسے افسر اعلیٰ کے پاس لے گیا، اس نے اس سے پوچھا کہ تمھیں کس نے کہا تھا کہ اپنا یہ نام بتاؤ اور تم نے تو کہا تھا کہ تمھارے گھر والے حمات کے حوادث میں شہید ہو گئے ہیں؟

بولا: ہبہ نے۔

پوچھا: کیا واقعی ہبہ نے؟

بولا: ہاں۔ وہی مجھے کہتی تھی، یہ کہو اور یوں کرو۔

تھوڑی ہی دیر میں مقدم نے مجھے بلا لیا اور پھر اس کی گالیاں تھیں اور میں تھی، وہ جو منہ میں آیا بکتا چلا گیا، کہ میں ملک دشمن، کینہ پرور اور نجانے کیا کیا ہوں اور وہ مجھے اس سے مختلف گمان کرتا تھا۔

میں واپس آئی تو الحاجہ مدیحہ نے میرا حال جان کر فیصلہ کیا کہ وہ خود اس افسر سے اس سلسلے میں بات کریں گی، بلکہ سیل کی باقی خواتین بھی میرے بارے میں گواہی دینے اٹھ کھڑی ہوئیں اور اس سے کہا:

یہ لڑکا بہت جھوٹا ہے، یہ ہم سب سے مذاق کرتا رہا کہ وہ یتیم ہے، حالانکہ اس کے گھر والے موجود ہیں۔

وہ بولا: اس کے ماں باپ بھی یہ بتا رہے ہیں کہ وہ کچھ عرصے بعد ایسے ہی غائب ہو جاتا ہے اور اس کا کوئی نیا کارنامہ سامنے آتا ہے۔ وہ لوگوں کو اس طرح من گھڑت کہانیاں سنا کر فریب دیتا ہے۔

افسر بچے کو کمرۂ تفتیش میں لے گیا اور اس سے اس کے باپ کی موجودگی میں دوبارہ پوچھا، تو اس نے اعتراف کر لیا کہ یہ سب کچھ اس نے کسی کے کہنے پر نہیں بلکہ از خود کیا ہے۔ افسر اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکا اور اسے دو زوردار تھپڑ رسید کیے۔ بچے کے چہرے پر کہیں بھی

احساس ندامت یا معذرت کی رمق نہ نظر آتی تھی ۔ وہ بڑی ڈھٹائی سے قدم اٹھاتا اپنے باپ اور گھر والوں کے ہمراہ چلا گیا اور ہم یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں یوں ساکت بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے گویا سینما میں کسی فلم کا سین دیکھ رہے ہوں۔

## رہائی

سن چوراسی کا نصف حصہ بیت چکا تھا اور ہماری زندگی کے ماہ وسال کس طرح گھل رہے تھے ہم نے اس کی پروا کرنا چھوڑ دیا تھا، بلکہ اب تو ہم نے اسے گننا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہ دن بھی جیل کے سینکڑوں اکتاہٹ سے بھرپور دنوں جیسا ایک دن تھا، جب جیلر اُبو مطیع اچانک جیل کے ہمارے حصے میں آیا اور بلاک سے باہر ہی سے چلا کر بولا:

امِ شیما، ایمان، عائشہ، حلیمہ۔

جب وہ اس کی جانب متوجہ ہوئیں، تو اگلی خبر کسی دھماکے سے کم نہ تھی، وہ اسی کھردرے لہجے میں بولا:

آ جاؤ۔ اپنی تیاری کرلو۔ تمھیں رہائی مل گئی ہے۔

دیگر لڑکیوں نے بھی کوئی توجہ نہ دی۔ انھوں نے سوچا کہ ان سے کوئی غلطی ہوگئی ہوگی۔ انھیں کہیں اور منتقل کیا جا رہا ہوگا یا ان سے بات کرنے کے لیے لے جایا جا رہا ہوگا۔ لیکن جب اُبو مطیع دوبارہ آیا اور بتایا کہ انھیں رہائی مل گئی ہے تو کئی زبانیں گنگ ہوگئیں اور دل اختلاج محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے۔ امِ شیما اور ایمان بھی سسکے بغیر نہ رہ سکیں۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولیں:

ہم بھی باقی سب کی رہائی کے بغیر نہیں نکلیں گے۔

ایمان میرے قریب آ کر کھڑی ہوگئی، اس وقت تک میری صحت کافی بہتر ہو چکی تھی، وہ بڑی لجاجت سے بولی:

میں اکیلے نہیں جاؤں گی، میرے ساتھ ہبہ کو بھی رہا کرو۔

اُبو مطیع درشتی سے بولا:

تم بڑی خوشی اور چاؤ سے اس وقت تک یہاں رہ سکتی ہو جب تک رہائی کے آرڈر نہ آئیں، لیکن ان احکامات کے بعد تم یہاں نہیں رہ سکتی، ہاں چاہو تو جیل کے دروازے پہ جب تک چاہو انتظار کر سکتی ہو۔

وہ بولی: نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی۔

اس کے ہمراہ کھڑی ام شیما الگ سسک رہی تھیں: میں آپ سب کو یہاں چھوڑ کر کیسے چلی جاؤں؟

اور آخر کار وہ ان دونوں کو دھکیلتے ہوئے لے گئے، وہ کبھی کھڑکی کا پٹ پکڑ لیتیں اور کبھی جیل کی آہنی سلاخیں اور پھر یوں ہی حسرت واندوہ کی تصویر بنی وہ دونوں رخصت ہو گئیں۔ ہمیں پتا چلا کہ انھیں پہلے امن دولہ کے دفتر لے جایا گیا، پھر رہا کر دیا گیا۔ اس کے بعد سے اب تک مجھے ان کی کوئی خبر نہیں ملی۔ اسی طرح کچھ دنوں بعد سناء کی رہائی کا پروانہ آ گیا اور پھر ہم سب بھی ایک ایسی ہی پکار کے منتظر رہنے لگے جو ہماری رہائی کی نوید لائے، ہمیں امید ہو چلی تھی، کہ یہ آہنی قفل ہمارے لیے بھی عنقریب کھلنے والا ہے۔ لیکن آنے والے دنوں نے ہمارے گمان کو جھٹلا دیا۔ کچھ وقت مزید گزر جانے کے بعد رہائی کی موہوم امید بھی دم توڑ گئی، بلکہ کیے بعد دیگرے کئی قیدی خواتین میں اضافہ ہو گیا۔ ہمارا غم کسی پرانے پھوڑے کی مانند نئے سرے سے رسنے لگا اور یہی احساس پختہ ہونے لگا کہ ہم اب مر کر ہی یہاں سے نکلیں گے۔

## ستر سالہ بزرگ کی سوختہ داڑھی

اُم خدامیہ......اور ام زبیر......کو قطنا سے پہلے ایک برس تک تجن تحقیق عسکری دمشق میں

رکھا گیا، یہ دونوں ہی اپنے کئی پیاروں سے محروم ہو چکی تھیں۔ اُمیہ دمشق کے مشہور عالم شیخ احمد کی بیٹی تھیں، جن کے دو بیٹے (علاء اور مصطفیٰ) شہید ہو چکے تھے اور تیسرا بیٹا شہاب جو عمر میں سب سے بڑا تھا قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہا تھا۔ اس کے بارے میں پتا چلا کہ ظالموں نے اسے بھی بعد میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کے گھرانے کے تمام افراد کو دو یا تین مرتبہ گرفتار کیا گیا۔ ان گرفتار شدگان میں سب سے کم عمر قیدی شیخ احمد کی ایک پوتی شیما تھی، جس کی عمر صرف دو برس تھی، جبکہ احمد شیخ خود ستر کے پیٹے میں تھے اور میں اس توہین کو کبھی بھلا نہیں سکتی کہ کس طرح رائد عبدالعزیز بلیجہ نے دوران تفتیش مجھے دھمکاتے ہوئے ان کے بارے میں کہا:

دیکھو۔ یہ شیخ احمد ہے، میں نے اس بڑھاپے میں اس کی ڈاڑھی کو آگ سے جلا دیا ہے۔

ان کے گھرانے کو پہلے قید کیا گیا، پھر رہائی کے کچھ عرصے بعد ان کے دو بیٹوں کو شہید کر دیا گیا اور ان سب کو بھی دوبارہ قید کر لیا گیا۔ امیہ بے چاری کو کبھی ان کے والد اور بھائیوں کے سبب گرفتار کیا جاتا اور کبھی ان کے شوہر صالح خ۔ کے سبب جو حلب میں ڈاکٹر تھے بلکہ سب سے پہلے صالح ہی کو اخوان سے تعلق اور ان کی امداد کے شبہے میں گرفتار کیا گیا۔ ان کا سولہ برس کا بیٹا بھی دھر لیا گیا، پھر اسے اس شرط پر چھوڑا کہ وہ ان کے ساتھ کام کرے گا، رہائی کے بعد امیہ اسے لے کر خاموشی سے ترکی چلی گئی، تا کہ وہ ان کے شر سے محفوظ رہے، مگر جب وہ واپس آئی تو اسے گرفتار کر لیا گیا اور قطنا منتقل ہونے سے قبل اسے تقریباً ایک برس تک جن تحقیق عسکری میں رکھا گیا۔ پھر ام خالد نے اسے اپنے ذرائع استعمال کر کے رہائی دلوائی، لیکن ڈاکٹر صالح کو ہماری رہائی کے بھی ایک برس بعد آزادی ملی۔

مجھے اب تک یاد ہے کہ ام خالد جب قطنا میں ہمارے بلاک میں داخل ہوئیں تو مجھے اپنے سامنے پا کر چیخ اٹھیں:

تم یہاں ہو؟ انھوں نے تمھیں طیارے میں کریش نہیں کروا دیا تھا؟

میں حیرت زدہ ہو کر بولی: کیا؟ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟

بولیس: ہم نے سنا تھا انھوں نے تمھیں جہاز سے پھینک دیا تھا، ہم تو بہت عرصہ پہلے تمھیں رو چکے ہیں۔

اُم زہیر جن کی عمر چالیس سے تجاوز کر چکی تھی اور ان کے دو بھائی بھی شہید کیے جا چکے تھے، انھیں ابتدا میں دمشق کی خفیہ پولیس نے گرفتار کیا۔ اُمِ زہیر حج کر کے واپس لوٹیں تو خفیہ والوں نے بلا سبب انھیں گرفتار کر لیا۔ وہ تقریباً ایک برس فوجی جیل میں رہیں اور پھر اُمِ خالد کے ساتھ ہی انھیں قطنا لایا گیا اور ان کے ہمراہ ۸۵ء میں انھیں رہائی ملی۔

## خشک سال

سیدہ ابتسام۔ کی شادی کو ابھی تین دن ہی گزرے تھے، اس کا شوہر لاذقیہ میں ڈاکٹر کے طور پر خدمات سرانجام دیتا تھا، جب اسے اور اس کے بھائی کو نجانے کس جرم میں گرفتار کر لیا گیا، ابتسام آج تک اس کا سبب نہیں جان پائی۔ اس کے خاندان نے بڑا پیسہ لگایا اور ہر طرح کا اثر و رسوخ بھی استعمال کیا مگر بے سود، حالانکہ وہ لاذقیہ کے معروف خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ بڑی کوششوں کے بعد ابتسام کو صرف پانچ منٹ ملاقات کی اجازت ملی اور وہ ابھی سانس بھی نہ لینے پائی تھی کہ ملاقات کا وقت مکمل ہو گیا۔ وہ بتا نہیں سکتی تھی کہ تعذیب اور تشدد سے اس کے شوہر کی حالت کس قدر بگڑی ہوئی تھی۔ اس ملاقات کے ایک ماہ بعد ابتسام کو بھی ہتھکڑی لگا دی گئی اور اسے خفیہ والے مخابرات لاذقیہ میں گھماتے گھماتے اسے اس کے مرکز دمشق میں لے آئے۔ یہاں وہ کئی برس زندگی کی رعنائیوں سے محروم تڑپتی رہی۔ اسے کچھ معلوم نہ تھا کہ اس کا شوہر کہاں ہے، بلکہ جیل سے نکلنے کے بعد بھی اسے اس کا سراغ نہ ملا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اسے ٹی بی ہو گئی تھی اور اسے جیل کی ہلاکت خیز بارکوں سے کسی نامعلوم مقام میں منتقل کر دیا گیا۔

ابتسام کو آئے ہوئے چند ہفتے ہی ہوئے تھے جب ایک نئی مہمان ال ل۔ کا اضافہ ہوا،

جو بجن امن سیاسی حمات سے یہاں منتقل کی گئی تھی۔ جب حمات میں حالات بگڑے تو امل اپنے بھائی کے پاس امارات چلی گئی تھی اور جب ۱۹۸۵ء میں وہ اپنے گھر والوں سے ملنے شام آئی، انھوں نے اسے ایرپورٹ ہی سے گرفتار کرلیا اور اسے فوری طور پر امن سیاسی حمات کے حوالے کردیا گیا، جہاں اس پر شدید تشدد کیا گیا کہ وہ کسی تنظیم سے تعلقات اور ان کو مدد دینے کو تسلیم کرلے۔ میری چچی جو اس عرصے میں اسی جیل میں قید تھیں بتاتی ہیں کہ وہ تعذیب کے دوران امل کی چیخوں کی وجہ سے رات کو سو نہیں سکتی تھیں۔ امل قطنا جیل میں ہمارے ساتھ ہی رہی اور تقریباً پانچ برس قید و بند کی مصیبتیں برداشت کرنے کے بعد ہمارے ساتھ ہی رہا ہوئی۔

## بوڑھی بچی

چند ہفتوں بعد کچھ اور مہمان ہمارے ہم سفر بننے جیل میں داخل ہوئے۔ ایسا لگتا تھا کہ ہمارے وطن کی سرزمین صالح خواتین کے لیے تنگ ہوگئی ہے اور ان صالحات کو چن چن کر جیل کی بیرکوں میں ٹھونسا جا رہا ہے۔

اس مرتبہ جیل کی آہنی دیواروں کے پیچھے آنے والی حلب کی دو سگی بہنیں رغیدہ۔ جو تربیت اسلامی کی معلمہ تھی اور عائشہ جو انگریزی زبان کی معلمہ تھی داخل ہوئیں۔ ان کے مصائب کی ابتدا کچھ یوں ہوئی کہ رغیدہ کا شوہر جو ایک انجینئر تھا، اچانک غائب ہوگیا اور رغیدہ اور اس کے دو بیٹے اور ایک بیٹی اس کی صورت دیکھنے کو ترس گئے۔ پھر ایک روز خبر آئی کہ اسے دمشق میں شہید کر دیا گیا ہے۔ رغیدہ کے لیے زندگی گزارنا مشکل ہوگیا، شوہر کی شہادت کے بعد وہ معاشی بحران کا بھی شکار ہوگئی۔ اسے حصول رزق کا کوئی وسیلہ نظر نہ آیا تو وہ اپنے کنبے کی کفالت کرنے کے لیے سعودیہ چلی گئی تاکہ وہاں ٹیچر کے طور پر کام کر سکے۔ اس کے ساتھ اس کی بہن عائشہ اور اس کا شوہر بھی چلے گئے۔ وہاں چند برس گزارنے بعد جب وہ پہلی مرتبہ گھر والوں سے ملنے شام آرہے تھے اور ارادہ تھا کہ اپنی ایک بھتیجی کی شادی کر کے جائیں گے۔ دونوں خاندان

تحائف سے بھری ''جیمس'' گاڑی لیے واپس آ رہے تھے، جب وہ درعا کی حدود میں داخل ہوئے انھیں کسٹم حکام نے روک لیا اور ان کے قیمتی سامان کو قبضے میں لے لیا، جس میں بیٹی کا جہیز بھی شامل تھا۔ وہیں انھیں بتایا گیا کہ وہ امن الدولہ کے ادارے کو مطلوب ہیں۔ کسٹم حکام نے سارا سامان ہڑپ کر لیا اور دونوں بہنوں اور عائشہ کے شوہر کو جیل کفر السوسہ بھجوا دیا۔ عائشہ کے نو بچوں اور رغیدہ کے تین بیٹوں کو ان کے خاندان کے حوالے کر دیا۔ کفر السوسہ میں دونوں بہنوں کو بے انتہا اذیت دی گئی اور اس بات کی بھی پروانہ کی گئی کہ عائشہ چھ سات ماہ کی حاملہ ہے۔ نہ معلوم اس بات پر رویا جائے یا ہنسا کہ رغیدہ سے دوران تعذیب اس کے شوہر کے بارے میں تحقیق کی گئی جو کئی برس قبل شہید ہو چکا تھا۔ آخر کار دونوں بہنوں پر تنظیم سے تعلقات ہونے کا الزام لگایا گیا اور دو ماہ تک مسلسل تشدد کرنے کے بعد انھیں قطنا جیل بھیج دیا گیا۔ وہ قطنا آئیں تو عائشہ کی مدتِ حمل تقریباً پوری ہو چکی تھی اور یہ بھی اللہ کی قدرت تھی کہ اتنے تشدد کے بعد بھی بچہ محفوظ تھا۔ ہم نے ایک رات افسر سے اجازت چاہی کہ عائشہ کی بہن رغداء کو اس کے بلاک میں رات گزارنے کی اجازت دی جائے، جو دوسرے بلاک میں رہتی تھی۔ اس نے بلا تحقیق اجازت دے دی اور اسی رات کے آخری حصے میں قبل سحر عائشہ نے بیٹی کو جنم دیا جس کا نام تسنیم رکھا گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہ بڑی عید (عید بقر) کی صبح تھی۔ جب میں نے بچی کو دیکھا تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ ہو گئی کہ بچی کے بال بالکل ایسے تھے جیسے کسی بڑھیا کے آخری عمر میں ہو گئے ہوں۔

رغیدہ جیل سے نکلنے تک ہمارے ساتھ رہی جبکہ عائشہ کو اس سے کچھ پہلے رہائی مل گئی اور اس کے شوہر کو ہماری رہائی کے بھی کچھ عرصہ بعد آزاد فضا میں سانس لینا نصیب ہوا۔ رہائی کے بعد جب انھوں نے اپنی گاڑی اور سامان کی بازیابی کے لیے کوشش کی تو انھیں کسٹم حکام کی جانب سے جواب بھی نہ ملا۔

جیل کی زندگی کسی مقفل قبر کی مانند ہولناک ہے۔ اس میں داخل ہونے والا اسی کی

بھول بھلیوں میں گم ہو جاتا ہے اور اس سے باہر نکلنے والا نئی زندگی پاتا ہے

جب ایک جیل سے خواتین اجتماعی طور پر ہمارے ہاں منتقل ہوئیں تو یہ کسی معجزے سے کم نہ تھا، کیونکہ ہمیں تو ایک طویل ہڑتال کے بعد یہاں منتقل کیا گیا تھا۔

جلد ہی ہمیں اس کا سبب معلوم ہو گیا کہ انھیں ٹی بی اور جلدی امراض پھیل جانے کے سبب یہاں بھیجا گیا ہے۔ مزید براں جیل کی عمارت کو نئے سرے سے تعمیر کرنا تھا، اس لیے قیدیوں کے معاملات نمٹائے جانے لگے۔ کچھ قیدیوں کو حکومت سے معاملات طے کر کے رہائی مل گئی، جنھیں سزائے موت سنائی جا چکی تھی ان کی سزاؤں پر فوری عمل درآمد شروع کر دیا گیا اور جن کی سزائیں باقی تھیں انھیں دیگر جیلوں میں منتقل کر دیا گیا۔ ساری خواتین کو قطنا جیل بھیج دیا گیا اور یہاں لا کر ایک ہی جگہ ٹھونس دیا گیا۔ اسی کے نتیجے میں پانچ خواتین ہمارے بلاک میں منتقل ہوئیں، جن کے ساتھ یہاں بھی امتیازی برتاؤ کیا جاتا تھا۔

## اُمِ حسان کا سانحہ

ان میں سے تین خواتین ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں: ام حسان خدیجہ۔ پچاس برس کی تھیں اور ان کے ساتھ ان کی دو بیٹیاں سلوی اور یسریٰ تھیں۔ ان کے شوہر نے حمات میں کچھ اخوان کے حامیوں کو پناہ دی تھی اور ایک بیٹی کی شادی بھی ان ہی میں سے ایک نوجوان سے کر دی تھی۔ جب حمات کے حوادث شروع ہوئے تو یہ خاندان بھی پناہ کے لیے قریبی گاؤں منتقل ہو گیا، لیکن یسریٰ اپنے شوہر کے ہمراہ وہیں مقیم رہی، لیکن خفیہ والوں کو اس کی خبر ہو گئی اور انھوں نے مکان پر دھاوا بول دیا۔ یسریٰ کا شوہر جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو گیا، لیکن ان کے ہمراہ رہائش پذیر ایک نوجوان ابو خالد شہید ہو گیا، جس کا آدھا دھڑ پہلے ہی مفلوج ہو چکا تھا، اس کی بیوی لیلیٰ اور بیس روزہ بیٹی کو یسریٰ کے ہمراہ قید کر لیا گیا۔ لیکن ننھی منی بچی راستے میں ہی خاموشی سے دم توڑ گئی۔ یسریٰ پر وحشیانہ تشدد کیا گیا، مجبوراً اس نے انھیں گاؤں

میں اپنے والدین کا پتا بتا دیا، پس سلویٰ اور ام حسان کو گرفتار کر لیا گیا اور ان کے شوہر جان بچا کر بھاگ نکلے۔ ام حسان کی بہن اور بہنوئی اسی مکان سے ان کے قابو میں آ گئے اور کہا جاتا ہے کہ ان کی بہن اور بہنوئی نے سیل میں تفتیش سے قبل ہی زہر آلود گولی زبان پر رکھ لی اور موت کو گلے لگا لیا، لیکن خفیہ والوں نے عین وقت پر ام حسان کو گولی منہ میں ڈالتے ہوئے پکڑ لیا اور مزاحمت کر کے گولی ضبط کر لی، یہ بے چاری جیل میں جانے والوں کو یاد کر کر کے اور پس ماندگان کے حال پر افسوس کرتے ہوئے روتی رہتیں۔ خاص طور پر انھیں یہ غم کھائے جاتا کہ ان کی بہن کے سات بچوں کی کفالت کون کرے گا۔ ان کا اپنا چھوٹا بیٹا فواز تین سال کا تھا اور اس سے بڑے امل، نرجس اور غزوان چھٹی جماعت سے آگے نہ پہنچے تھے۔ ان کی پریشانی دوچند ہو گئی جب ۸۵ء میں ان کے شوہر بھی گرفتار ہو گئے اور غزوان کو پڑھائی ترک کر کے اپنے بھائی کے ہمراہ ایک ورکشاپ میں گاڑیوں کی مرمت کے کام مصروف ہونا پڑا۔ گرفتاری کے بعد ان کے والد وحشیانہ تشدد برداشت نہ کر سکے اور جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ ام حسان پر یکے بعد دیگرے اتنے غم پڑے تھے کہ ان کے اعصاب جواب دے گئے۔ وہ چلا چلا کر رویا کرتیں اور جو کچھ ان کے ہاتھ آتا زمین پر پٹخ دیتیں۔ ان کے بچے ان سے ملنے آتے تو ماں کے قریب جانے کے لیے ایک دوسرے سے خوب جھگڑتے، ہر ایک آگے بڑھ کر آہنی سلاخوں کے پیچھے کھڑی ماں سے لپٹ جانا چاہتا تھا اور وہ سلاخوں پر چڑھ چڑھ کر ان کے قریب ہونا چاہتے تھے۔ جب بچے واپس چلے جاتے تو ان کا غم اور بڑھ جاتا اور ان کی حالت دیکھی نہ جاتی، وہ بے بسی سے اپنے چہرے پر طمانچے لگاتیں اور گھنٹوں روتی رہتیں، بلکہ کبھی تو یہ سلسلہ کئی دنوں تک چلتا رہتا۔ ام حسان اور ان کی بیٹیوں کو ہمارے ساتھ ہی رہائی ملی، گھر پہنچ کر انھیں معلوم ہوا کہ کچھ سونا جو انھوں نے کسی کی امانت کے طور پر گھر میں رکھا ہوا تھا چرا لیا گیا ہے اور انھیں مجاہدین کا ساتھی قرار دے کر ان کا حمات والا گھر بھی منہدم کر دیا گیا ہے۔ ام حسان نے بڑی مشکل سے مٹی کے دو چھوٹے چھوٹے کمرے بنائے اور اسی میں رہائش پزیر ہو گئیں۔ ان کا حال یہ تھا کہ بارش

برسی تو چھت پھاڑ کر بلا اجازت ان کے کمرے میں گھس آتی۔

دوسری جانب ام حسان کو اپنی بہن کے لاوارث بچوں کا غم تھا، مگر اللہ نے ان کے والدین کو واپس بلا لیا تو ان کے لیے دُنیا کا وسیلہ عطا کر دیا، کیونکہ کچھ مشفق بندگانِ خدا انھیں اپنے ہمراہ عمان لے گئے، تا کہ وہ شام کی پناہ گزین بستیوں میں رہیں، انھی خیموں میں ان کے چھوٹے بیٹے کا انتقال ہوگیا، پھر ان کے کفیل حضرات نے ان کی بیٹیوں کی سن رشد کو پہنچ جانے کے بعد جلد ہی شادی کردی۔

## سیلون میں

اس بدنصیب خاندان کی آزمائشوں کا سلسلہ اسی پر ختم نہیں ہوا، بلکہ شاید یہی اس کا سب سے ہلکا حصہ تھا۔ فرح امن سیاسی حماقت نے ان پر تشدد کر کے ان سے اعتراف کروالیا کہ وہ نوجوان اخوان کی مدد کرتے رہے ہیں۔ لیلیٰ اور سلویٰ کو خوب اذیت دی گئی، اسی ٹارچر سیل میں سلویٰ کو دردِ زہ شروع ہوگیا، ان کے پاس نہ کوئی معالج تھا نہ نومولود کو پہنانے کے لیے کوئی کپڑا لیکن یہ اللہ ہی کی خاص رحمت تھی کہ اس سیل میں رغداء س۔ نامی خاتون موجود تھی جو ولادت میں مدد کرنا جانتی تھی۔ ولادت کے بعد بڑا مسئلہ نومولود کے رونے کی آواز کو چھپانا تھا، تاکہ زچہ اور دوسروں پر کوئی نئی مصیبت نہ آجائے۔ ایک چوکیدار بچی کے رونے کی آواز سن کر بھاگا آیا اور سوال کرنے لگا۔ انھوں نے خوف زدہ آواز میں اسے ساری بات بتائی، وہ ان بھیڑیوں کے غول میں ایک ایسا شخص تھا جس کی انسانیت پوری طرح مری نہ تھی۔ وہ ایک برتن اور پانی گرم کرنے کا تسلہ لے آیا، انھوں نے پانی گرم کر کے نومولود کو غسل دیا، اسے اس کے لائے ہوئے کپڑوں میں لپیٹا، سلویٰ اس نیک شخص کی عنایت کو بھلا نہ سکتی تھی۔

ایک مسئلہ تو حل ہوا مگر ابھی نجانے کتنے مسئلے باقی تھے اور اس معصوم جان جس کا نام سمیہ رکھا گیا تھا نجانے کتنے ستم سہنے تھے۔ ایک عیسائی قیدی خاتون جس کا نام طونی تھا اس پر اخوان

کے حامیوں کو پاسپورٹ فروخت کرنے کا الزام تھا، جب یہ جیل آئی تو سوشلسٹ خواتین کے ساتھ رہ کر کافی تبدیل ہوگئی۔ وہ جیل کے عملے کو مختلف چیزیں تحائف کے طور پر بانٹتی رہتی تھی اور اسلام پسند قیدی خواتین کی شکایتیں لگاتی۔ اس نے اس معاملے کو بھی خوب مرچ مسالا لگا کر اور اپنی بڑائی ثابت کرنے کے خیال سے پیش کر دیا۔ بس پھر کیا تھا جیلر فیصل غانم گالیاں بکتا آ گیا اور ان کی توہین شروع کر دی۔ اس نے ایک قیدی عائدہ کو ہاتھ سے پکڑ کر ایک دوسری قیدی خاتون کے ساتھ باہر نکالا اور آگے بڑھ کر اس کا حجاب نوچ کر پھینکنے کی کوشش کی۔ اس میں ناکام ہو گیا تو اس کی مغلظات میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جب خاموش ہوا تو اس نے پورے بلاک کو سزا کے طور پر "سیلون" جانے کا حکم دے دیا۔ سیلون ایک سیم زدہ اندھیری عمارت کا نام تھا، جس میں سانس بھی گھٹتا تھا اور اس میں مکڑی کے جالے جگہ جگہ لگے ہوئے تھے۔

اسی سیم زدہ اندھیرے سیلون میں مکڑیوں، کاکروچوں اور کیڑے مکوڑوں کے بیچ تمام قیدیوں کو چھوڑ دیا گیا اور ننھی سمیہ جس کی عمر اس وقت بمشکل بیس دن تھی اسے بھی باقی قیدیوں کے ساتھ وہیں بھیج دیا گیا، وہیں اس پر دمہ کا شدید حملہ ہوا اور یہ مرض اس کی زندگی کا ساتھی بن کر اسے چمٹ گیا۔

اور دو سال تک اس ہلاکت خیز فضا میں رہنے کے بعد انھیں حمص منتقل کر دیا گیا۔ حمص جیل میں جب خواتین کی لیڈی پولیس تلاشی لے رہی تھی وہ کمزور سی بچی معصومیت سے ان کی ٹانگوں کے بیچ سے گزر کر لپک کر میرے پاس آگئی، میں نے بے اختیار آگے بڑھ کر اسے گود میں لے لیا، میں حیرت زدہ رہ گئی، کیوں کہ اس کا وزن ناقابل یقین حد تک کم تھا، ایسا لگتا تھا وہ میرے ہاتھوں سے ہوا میں اچھل پڑے گی۔

## اعصابی تناؤ

جن دنوں ام حسان اپنی دو بیٹیوں کے ہمراہ جیل میں داخل ہوئیں ان ہی دنوں متاثرہ

جیل کی گیارہ خواتین کو یہاں لایا گیا۔ان میں سے پانچ کا ذکر گزر چکا ہے، بقیہ چھ عائشہ۔ نہلہ۔عائدہ۔سلسبیلہ۔لیلی اور ام طونی شامل تھیں۔بعد میں عائدہ اور عائشہ کو حلب جیل بھیج دیا گیا اور سلسبیلہ کو انھوں ابتدا میں ام حسان کے ہمراہ حمص جیل بھیجا اور اسے کئی برسوں کے لیے بھول گئے۔رہی لیلیٰ، نہلہ اور ام طونی۔ لیلیٰ کو بااثر شخصیات کی مداخلت کے بعد ان تباہ کن حالات سے چھٹکارا مل گیا۔نہلہ جب مرض کی شدت سے موت کے منہ میں جانے کو تھی، انھوں نے اسے آزاد کر دیا اور ام طونی نے جیل حکام کے ساتھ ساز باز کر لی، وہ ان کے اشاروں پر قیدیوں کی مخبری کرتی اور ایک جاسوسہ ہی کی حیثیت سے اسے رہائی مل گئی۔

رغداء اور منی گہری سہیلیاں تھیں، دونوں حمات سے تھیں۔رغداء مڈوائف تھی اور منی کلیہ الشریعہ و مدرسہ دیانہ کی ڈگری ہولڈر تھی، منی اور اس کے شوہر نے کئی اخوان نوجوانوں کو پناہ دی تھی، حمات کے حوادث کے بعد اس کا شوہر تو فرار ہو گیا مگر یہ مسکین خفیہ والوں کے ہتھے چڑھ گئی، اسے ادارہ امن سیاسی حمات نے کافی تعذیب دی تا کہ وہ قاعدہ کی آرگنائزر ہونے کا اعتراف کر لے اور اپنے شوہر کے خفیہ ٹھکانے کا پتا بتا دے، اسے بجلی کے اتنے کرنٹ لگائے گئے کہ بے چاری شدید اعصابی دباؤ کا شکار ہو گئی۔وہ اس وقت تک سو نہ سکتی تھی جب تک اس کے پاؤں کے رخ پر پنکھا نہیں چلا دیا جاتا تھا۔خوب تعذیب دینے اور تحقیقات مکمل کرنے کے بعد اسے موت کی سزا پانے کے لیے بھیج دیا گیا۔رغداء کو بھی اسی عرصے میں ہسپتال سے گرفتار کیا گیا تھا، جہاں وہ مڈوائف کے طور پر فرائض انجام دیتی تھی۔رغداء پر جو ستم ڈھائے گئے ان کے بارے میں اس نے اپنے لب سی لیے تھے۔وہ کسی سے کچھ نہ کہتی، وہ اپنا غم چھپائے بظاہر پرسکون نظر آتی، وہ ان تمام مصائب کو اللہ کی طرف سے آزمائش سمجھتی تھی اور بس۔

## فراموش کردہ قیدی

یہ پانچ خواتین تھیں، جو اس جیل سے ہمارے پاس قطنا آئیں، بقیہ چھ خواتین میں سے

تین سے ہماری ملاقات ہماری قید کے اگلے مرحلے میں ہوئی۔ بقیہ خواتین کی سرگزشت ہم نے دوسری ساتھیوں کی زبانی سنی، مگر ہماری ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔

عائدہ پیشے کے اعتبار سے انجینئر تھی، حلب کے حوادث کی ابتدا میں اس کا بلاوہ آیا مگر رہائی بھی مل گئی اور چونکہ وہ اپنے گھر میں تنہا تھی، اس لیے اس کے والد اسے ہمارے گھر دمشق لے آئے، تاکہ وہ طالبات کے بیچ میں رہے، لیکن اس کا اطمینان نہ ہوا اور وہ واپس حلب لوٹ گئی اور وہاں کافی عرصہ امن سے رہی، جب وہاں حالات بگڑے تو انھوں نے اسے بھی ساتھ کیا ئی کی مخبری پر پکڑ لیا۔ پتا چلا کہ اسے ذیلی شاخ مخابرات میں بہت شدید ٹارچر کا نشانہ بنایا گیا اور بدنام زمانہ اہل کاروں عمر حمیدہ اور مصطفیٰ تاجر نے اسے ناقابل برداشت تعذیب دی، وہ اس ٹارچر کے بارے میں زیادہ تر خاموش رہتی، اس سے ہماری ملاقات بھی دمشق میں اچانک ہو گئی، جب کہ ہم تجن تحقیق عسکری میں رہائی کے احکامات کے منتظر تھے۔

ان ہی دنوں ہماری ملاقات عائشہ سے بھی اسی مقام پر یعنی تجن تحقیق عسکری میں ہوئی، جسے عائدہ کے ساتھ ہی نامعلوم جرم کی پاداش میں قید کیا گیا تھا۔

سلسبیلہ مربیہ تھیں، ان کا تعلق حمص سے تھا، وہ ساٹھ کے پیٹے میں تھیں، انھیں اپنے بھائی کے اخوان کے ساتھ تعلقات کے جرم میں گرفتار کیا گیا۔ ان کے ساتھ ان کا سولہ سالہ بیٹا بھی تھا۔ انھیں بھی کافی تعذیب دی گئی، میری ان سے ملاقات رہائی سے قبل آخری ہفتوں میں ہوئی۔ خفیہ والے انھیں حمص جیل میں ڈال کر بھول ہی گئے تھے۔ جبکہ ان کی دیگر قیدی ساتھیوں کو مخدوش جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ جب باقی قیدیوں کو رہائی ملی تو ان کی بھی ڈھنڈیا مچی۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں ہیں، آخر میں تجن تحقیق عسکری کا مدیر خود ہماری جیل میں آیا اور ہماری ساتھی قیدیوں سے پوچھنے لگا:

کیا آپ اس نام کی قیدی کو پہچانتی ہیں اور وہ کہاں ہو گی؟

اسے لڑکیوں نے بتایا: ہاں، وہ حمص جیل میں ہمارے ہمراہ تھیں اور ہوسکتا ہے اب تک وہیں ہوں۔

وہاں گئے تو انھوں نے انہیں جیل میں قیدِ تنہائی کے سیل میں موجود پایا۔ انھیں جیل میں سڑنے سے تو بچالیا گیا مگر گھر میں نظر بند کر دیا گیا اور آج تک انھیں شام سے باہر جانے کی اجازت نہیں، حالانکہ ان کے شوہر اور بچے سعودی عرب میں مقیم ہیں اور ان کا وہ بھائی جوان کے ہمراہ گرفتار کیا گیا تھا اس کے بارے میں اب تک معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ کہاں ہے۔

## لکڑی کے تختے پر

نہلہ۔ بھی عائدہ کی ساتھیوں میں سے تھی جنھیں منتقل کیا گیا تھا۔ اس کے شوہر نے بعض مطلوب افراد کے لیے اپنے گھر کے دروازے کھول دیے تھے، لیکن حکام کو اس کی خبر ہوگئی۔ خفیہ والے دھاوا بول کر ان کے گھر میں داخل ہوگئے اور وہاں چھپ کر بیٹھ گئے تاکہ اخوان سے متاثرہ نوجوانوں کو پکڑ سکیں۔ ان وحشیوں کی آمد سے نہلہ بہت خوف زدہ ہوئی اور اپنی عصمت کو بچانے کے لیے فلیٹ کی تیسری منزل سے چھلانگ لگادی۔ نیچے گرنے سے اس کی متعدد ہڈیاں ٹوٹ گئیں مگر وہ زندہ بچ گئی۔ اردگرد لوگ سمجھے کہ اسے گاڑی نے ٹکر ماری ہے اور انھوں نے بھاگ دوڑ کر کے ایمبولینس منگوالی۔ ہسپتال میں جب اس سے حادثے کی تفصیلات پوچھی گئی تو اس نے جھوٹ موٹ کہہ دیا کہ ہمارے گھر میں اخوان زبردستی گھس آئے اور انھوں نے مجھے بند کرنے کی کوشش کی تو میں نے بھاگ کر فلیٹ سے چھلانگ لگادی۔ پس خفیہ والوں کی دوسری پارٹی آئی اور یوں گھر میں چھپے ہوئے اہل کاروں اور خفیہ والوں میں جھڑپ شروع ہوگئی اور تماشا یہ کہ ہر ایک دوسرے کو اخوان سمجھ کر ان پر فائرنگ کرتا رہا، حقیقت واضح ہونے تک دونوں جانب کے کئی اہل کار ڈھیر ہو چکے تھے۔ اس سارے واقعے کا غصہ نہلہ پر نکالا گیا، انھوں نے لمبے عرصے تک اسے بغیر علاج کے یوں ہی لکڑی کے ایک تختے پر تڑپتے ہوئے چھوڑ دیا۔ وہ کمر

کی ہڈی ٹوٹ جانے کے سبب حرکت بھی نہ کرسکتی تھی، اس کے زخم اتنے خراب ہو گئے تھے کہ ان میں کیڑے پڑ جانے کا خطرہ تھا۔ اس کے بعد انھوں نے اس کے علاج کی جانب توجہ دی تو اس بے چاری کی حالت مزید قابل رحم ہو گئی جب اسے معلوم ہوا کہ وہ تین ماہ کی حاملہ بھی ہے، اسے مسلسل خون جاری رہا، یہاں تک کہ اسی تختے پر اس کا اسقاط ہو گیا، اس کی حالت روز بروز خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی، حتیٰ کہ اس کے علاج کی ذمہ داری سر سے اتارنے کے لیے اسے سات آٹھ ماہ بعد رہا کر دیا گیا۔

اور آخری قیدی ام طونی مسیحی خاتون تھی۔ یہ اخوان کے حامی نوجوانوں کو غیر ملکی ویزے فروخت کرنے کے جرم میں پکڑی گئی۔ جیل میں آکر وہ جیل کے عملے کی مخبرہ کے طور پر کام کرنے لگی۔ یہ مختلف خواتین کی شکایتیں لگا لگا کر ان کے لیے تعذیب کا سبب بنتی، آخر کار جب عام معافی کا اعلان کیا گیا تو اسے بھی رہائی مل گئی۔

## میں زیر آب سانس لے رہی ہوں

تقریباً ایک ماہ گزرنے تک نئی آنے والی قیدی خواتین اس ماحول اور ''نئے گھر'' سے مانوس ہو چکی تھیں اور ہم بھی ان سے گھل مل گئے تھے۔ ان کے اور ہمارے بلاک کے بیچ حائل آہنی سلاخیں ہی ہماری دوری کا سبب تھیں۔ کچھ دن نہ گزرنے پائے کہ شام کے مختلف حصوں سے گرفتار شدہ خواتین لائی گئیں اور ان سے میل ملاقات ان علاقوں سے دلی قربت کا باعث بن گیا۔

اس مرتبہ تین قیدیوں کو لایا گیا: سمیرہ۔ نجوئی اور ام زہیر نجاح۔ ام زہیر کو حمات سے پکڑا گیا اور کفر السوسہ سے ہوتے ہوئے یہاں منتقل کر دیا گیا۔ نجوئی تجن المسلیہ حلب میں تھی، اسے کفر السوسہ اور پھر یہاں منتقل کیا گیا اور سمیرہ کو امن دولہ کے اہل کار حمات سے یہاں لے آئے۔ نئی آنے والیاں اپنے ساتھ ظلم و قہر، درندگی اور وحشت کے کتنے ہی قصے لے کر آئیں۔

پورے شام میں درندوں کی حکمرانی تھی اور اہل شام پر زندگی کے شب و روز تنگ ہو رہے تھے۔ کیا کسی کو اس الم، عذاب اور ظلم کا اندازہ بھی تھا جو ان کمزوروں سے روا رکھا جا رہا تھا۔ سمیرہ کی عمر بیس سے زائد تھی، وہ تین بچوں کی ماں تھی جن میں سے تیسرا آٹھ ماہ کا تھا جب اس کے شوہر کو حمات کے حوادث کے دوران شہید کر دیا گیا۔ اس کا جرم کیا تھا اور اسے کس نے اس حال کو پہنچایا وہ کچھ نہیں جانتی تھی، اسے فقط اتنا معلوم ہوا کہ حکومت مخالفین کے قتل عام کے بعد ایک میدان میں سب کی میتیں دھری تھیں اور ان میں سے ایک میت کے سوختہ بدن پر اس کے شوہر کے نام کی تختی تھی۔ لاش شناخت کے قابل بھی نہ تھی۔ اس کا شوہر معمار تھا، اس کی شہادت کے بعد اس کی نئی آزمائش شروع ہوگئی، کیونکہ خفیہ والوں کا خیال تھا کہ وہ نوجوانوں کو پناہ دیتا ہے، گھر کے چھاپے کے دوران انھوں نے ایک خفیہ کمرے کا بھی پتا لگا لیا جس کے بارے میں اس نے بیوی کو بھی نہ بتا رکھا تھا۔ اس کمرے میں چند کتابوں کے سوا کچھ نہ تھا، لیکن ان کے لیے تعذیب دینے کے لیے یہی جواز کافی تھا، انھوں نے اسے چارپائی کی رسّی سے باندھا، اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور اس سے پوچھنے لگے کہ اس خفیہ کمین گاہ میں کون کون آتا تھا، اس کی بے خبری پر وہ اسے اس کے گھر میں ہی مارنے پیٹنے لگے، ان میں سے ایک نہایت اہانت آمیز انداز میں گانے لگا: میں زیر آب سانس لے رہی ہوں۔ میں ڈوب رہی ہوں۔ اسے امن سیاسی کے دفتر میں لے جایا گیا، لیکن کچھ بھی ثابت نہ ہونے کے باوجود وہ آخر تک قید رہی اور اسے سب کے ساتھ ہی رہائی ملی۔

اُم زہیر پچاس سے زائد برس کی تھیں، ان کے شوہر دل کے عارضے میں مبتلا تھے، وہ ان کا علاج کروانے عمان گئیں، تاکہ ان کا آپریشن کروا سکیں۔ ان کا آپریشن بھی ہوا مگر وہ صحت یاب نہ ہو سکے اور مالک حقیقی سے جا ملے۔ ام زہیر انھیں وہیں دفنا کر شام واپس آگئیں۔ حمات کے حوادث کے بعد مخبری کرنا بھی ایک اہم پیشہ بن گیا تھا۔ مخبر معصوم لوگوں کو پھنسوا کر خود تو رقم وصول کر لیتے مگر جس کا نام لیا جاتا اس پر حیات کا دائرہ تنگ ہو جاتا۔ خفیہ والے بار بار ان

سے اس پیسے بارے میں سوال کرتے جو وہ عمان سے لائی تھیں۔ انھیں بھی امن سیاسی نے گرفتار کیا اور اب وہ قطنا میں تھیں۔ ام زہیر کا اس کے سوا کچھ جرم نہ تھا کہ وہ اپنے خاندان کے دشمن ایمان فروشوں کے ہتھے چڑھ گئیں اور یہ تو بہت پہلے کی بات تھی کہ جب اخوان کے حامی نوجوانوں، ڈاکٹروں اور اہل ثروت پر ظلم کی چکی چلنا شروع ہوئی تھی۔ طاہر حداد، وغیرہ ایک میدان میں تین بھائیوں کو لے کر آئے اور انھیں لاٹھیاں اور کوڑے مارتے اور گالیوں کو بوچھاڑ کرتے ہوئے پورے بازار میں پھرایا۔ پھر انھوں نے انھیں چھوڑنے کے احکام صادر کیے، مگر وہ مظلوم ابھی چند قدم بھی نہ چلنے پائے تھے کہ ان تینوں پر اچانک فائر کھول دیا گیا، گولیوں کی تڑتڑاہٹ کے ساتھ ہی تین وجود ایک دوسرے کے اوپر زمین پر گرے۔ اہل کار اپنا کام پورا کر کے چل دیے، انھیں خبر بھی نہ ہوئی کہ سب سے نیچے گرنے والے بھائی کو گولی پاؤں میں لگی ہے اور وہ کچھ دیر بعد گھسٹتا ہوا انھیں میاں بیوی کے گھر پہنچ گیا ہے، جنھوں نے اس کو طبی امداد پہنچائی اور تندرست ہونے کے بعد وہ کبھی نہ لوٹ کر آنے کے لیے اپنے وطن سدھار گیا۔

## ان کی غذا تسبیح و تہلیل ہے

جیل میں ہر آن کڑواہٹ کا جام پینا پڑتا ہے، مگر کچھ قیدیوں کے حصے میں حنظل کا انتہائی کڑوا جام آجاتا ہے، جسے نگلتے بن پڑتا ہے نہ اگلتے اور کسی کسی پر ظلم کا کوڑا اس شدت سے برسایا جاتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی بچانے والا نہیں ہوتا۔ ایسی ہی کہانی ہالہ کی بھی تھی جسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بالآخر بچا ہی لیا اور ایسی ہی کہانی نجویٰ۔ کی بھی تھی جسے نفسیاتی طور پر اس قدر تعذیب دی گئی کہ وہ غریب اب تک اس کے الم سے چھٹکارا نہیں پا سکی۔

نجویٰ حلب میں میڈیکل کالج میں سال دوم کی طالبہ تھی، وہ ہزاروں اخوان نوجوانوں میں سے ایک کی منگیتر تھی، اس کا منگیتر ظالم حکام سے بچتا بچاتا اردن چلا گیا۔ نجویٰ اپنے والد کی منت سماجت کر کے ان کے ہمراہ اس کا پتا لینے اردن گئی۔ وہ جوں ہی واپس پہنچے ان دونوں کو

اخوان کی آمد ورفت میں مدد کرنے کے جرم میں پکڑ لیا گیا، نجویٰ کی والدہ سخت پریشان ہوئیں، کیونکہ وہ بیٹی اور شوہر دونوں ہی کی معاونت سے محروم ہوگئی تھیں۔ نجویٰ کے والد گھر کے واحد کفیل تھے، ان کے پکڑے جانے سے گھر کا نظام اور انتظام چلنا مشکل ہوگیا۔ نجویٰ کے تین چھوٹے بہن بھائیوں کا سکول چھوٹ گیا، ان میں سے بڑا بچہ جو کہ چھٹی ساتویں کا طالب علم تھا، باقی خاندان کو فاقوں سے بچانے کے لیے چاکلیٹ فیکٹری میں مزدوری کرنے لگا۔ نجویٰ کی والدہ پر اس صدمے کا اتنا اثر ہوا کہ ان کے رحم میں شدید تکلیف شروع ہوگئی، آخر کار ڈاکٹرز کو رحم نکالنا پڑا۔ جیل میں نجویٰ کو اپنے گھر والوں کا حال معلوم ہوا تو وہ حساس لڑکی برداشت نہ کر سکی، اسے ایک جانب اپنے گھر والوں کی پریشانی تھی اور دوسری جانب اپنے باپ کا غم، جس کے بارے میں اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کس قید خانے میں ہے اور کس حال میں ہے۔ اسے یہ احساس کانٹے کی طرح چبھنے لگا کہ یہ سب اس کی وجہ سے ہوا ہے، وہ اپنے خاندان کی مجرم ہے، وہ اندر ہی اندر کڑھنے اور خود کو ملامت کرنے لگی۔ اس کی حالت روز بروز بگڑنے لگی، اس کے اندر احساس ندامت تھا تو باہر تحقیق پر مامور جلادوں کی مار پیٹ، تعذیب اور اذیت۔ وہ ایسے لوگوں میں گھری تھی جن کے دل رحم اور انسانیت کے معنی سے نا آشنا تھے۔ جب اسے حلب سے قطنا منتقل کیا گیا تو ہم جب دیکھتے وہ مستقل ہیجانی کیفیت میں مبتلا ہوتی، گویا اپنے آپ سے لڑ رہی ہو۔ اس کی حرکتیں عجیب وغریب ہوتیں، ہمارے دوما منتقل ہونے کے بعد اس کی حالت اس سے بھی خراب ہوگئی، بلکہ اس کی حالت کا ہم پر اتنا اثر ہوا کہ وہ ہمارے اعصاب پر سوار ہوگئی۔

نجویٰ کا بستر میرے قریب ہی تھا۔ بس درمیان میں ماجدہ کا بستر تھا، اسے جب خود اپنے مرض کا احساس ہوا تو وہ ایک دن ہم سے بڑی بے چارگی سے کہنے لگی:

او لڑکیو اور بہنو۔ سنو۔ میرے سامنے کبھی بھی سوئی، قینچی، چھری، کانٹا یا چمچ بلکہ کوئی بھی لوہے کی چیز نہ رکھنا۔

وقت گزرنے کے ساتھ اس کا مرض بھی پلنے لگا۔ اس کی نیند ختم ہوگئی، وہ رات دن بلاک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلتی رہتی۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ مرض بھی اسے کسی ادھار کی طرح چمٹ گیا ہے، وہ لباس میں حد درجہ ستر کا اہتمام کرنے لگتی، وہ اپنی لمبی لمبی قمیصیں میرے پاس لے آتی اور کہتی ہے انھیں اور لمبا کر دو۔ گھر والے ملاقات کو آتے تو اس کے لیے صابون لاتے، وہ بیٹھی گھنٹوں اسے ناخنوں سے کھرچتی رہتی، حتیٰ کہ بعض اوقات نچلی تہہ تک پہنچ جاتی، ایک روز مجھے کہنے لگی:

سنو۔ انسان جو کچھ بھی سیکھتا ہے وہ اسے ایک لفظ ''جلہ'' (مراد جل جلالہ) کی جانب لے کر جاتا ہے دیکھو۔ اس صابن کی کھرچن میں لکھا ہے۔ لا الہ الا اللہ۔ میں نہیں جانتی کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔

رات سوتے وقت وہ ہمارے ساتھ بستر پر لیٹ جاتی، لیکن اس کی آنکھیں مسلسل کھلی رہتیں، حتیٰ کہ آدھی رات کے وقت وہ سوجی ہوئی آنکھوں سے ماجدہ کے بستر کی جانب چل دیتی اور اسے لے کر وہ میرے بستر کے پاس آتی اور میرے پاؤں کو ہلا کر کہتی:

آؤ مل کر بیٹھیں۔

اور میں اس اچانک افتاد پر بھی آنکھیں کھول کر اس کے ساتھ چل پڑتی۔ وہ ہمیں اپنے بستر پر لے آتی اور کبھی ہمارے بستر پر ہی بیٹھ جاتی اور مجھے اپنے ساتھ چمٹا کر کہتی:

آؤ آج کی رات اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔

وہ کئی کئی دن بھوکی پیاسی ادھر ادھر پھرتی رہتی، میں حیرت سے اس سے پوچھتی:

تمھیں بھوک نہیں لگتی؟

تو وہ بے خودی سے کہتی: ان کا کھانا تسبیح وتہلیل ہے

میں اس کے ساتھ بیٹھ جاتی اور ہم مل کر تسبیح وتہلیل کرتے۔ پھر وہ اٹھتی اور اپنے کپڑے

اور دوسری اشیا دیگر قیدیوں میں بانٹنے لگتی، حتیٰ کہ بدن کے کپڑوں کے سوا سب کچھ تقسیم کر دیتی۔ اس نے زیادہ تر اشیا ایک مجرمہ کو دے دیں جو اسی کی مانند نفسیاتی مریضہ تھی اور ذہنی امراض کے ہسپتال سے بھاگتے ہوئے پکڑی گئی تھی۔

نجوئ ابتدا میں اس قیدی سے بہت ڈرتی تھی مگر آہستہ آہستہ اس کا ڈر ختم ہو گیا اور وہ اس کے ساتھ وقت گزارنے لگی۔ یہ شاید اس دوستی کا اثر ہی تھا کہ نجوئ کا مرض بھی شدت اختیار کرنے لگا اور اس کے اثرات اردگرد کے ماحول پر بھی ہونے لگے۔ اس کا سب سے زیادہ شکار اس کے پڑوسی تھے؛ یعنی میں اور ماجدہ۔ ہم اس کا خیال رکھتے رکھتے خود بے خوابی کا شکار ہو گئے اور بلا ارادہ ہی ہمارا دھاڑیں مار کر رونے کو جی چاہتا۔ ماجدہ کو ڈراؤنے خواب نظر آتے، وہ راتوں کو چلانے لگتی اور بڑی عاجزی سے نیند آنے کی دعائیں مانگ رہی ہوتی۔

نجوئ کی اس حالت کا برا اثر اس کی والدہ پر بھی پڑا، ان کا فشارِ خون بلند رہنے لگا۔ حتیٰ کہ نجوئ اور اس کے باپ کی رہائی کے بعد بھی وہ مکمل طور پر صحت یاب نہ ہو سکیں۔ ایسا لگتا تھا ان کی یادداشت مکمل طور پر یا بڑی حد تک ختم ہو چکی ہے۔ وہ یوں ہی سرگرداں سڑکوں پر پھرتیں یا اپنے گھر والوں کو بتائے بغیر عزیز و اقارب کے ہاں چلی جاتیں اور ان کے ہاں کئی کئی روز تک قیام کرتیں، جبکہ ان کے گھر والے ہسپتالوں کی ایمرجنسیز اور پولیس سٹیشنوں کی خاک چھان رہے ہوتے تھے۔

آخر کار ہماری رہائی کا فیصلہ ہوا تو ان ظالموں نے اس نفسیاتی مریضہ کو کسی نامعلوم سڑک پر اتار دیا، گویا انھوں نے اس کی رہی سہی عقل بھی گم کرنے کا پورا اہتمام کر دیا۔ رہائی کے وقت وہ بے چاری اکیلی تھی، اسے اس کے شہر پہنچانے کے بجائے اسے دمشق ہی میں اتار دیا گیا، حالانکہ باقی قیدیوں کو ان کے شہروں میں پہنچایا گیا۔

اس قید میں ہمارے ہمراہ قتل کے الزام کی ایک ملزمہ جورجینا رزق بھی رہی (جو اپنے

وقت کی لبنان کی ملکۂ حسن تھی)، اس پر اپنے شوہر کو قتل کرنے کا الزام تھا۔ جیل حکام کو اس کے بارے میں خوف لاحق رہتا تھا کہ کہیں اس کے مقتول شوہر کے اقارب (آل جندی) میں سے کوئی آگے بڑھ کر اسے قتل نہ کر دے۔ ان دنوں جیل میں بہت شدید پہرا ہوتا اور اسے خاص طور پر مجرم خواتین کے بجائے ہمارے بلاک میں رکھا گیا۔ وہ تقریباً ایک سال تک ہمارے ساتھ رہی۔ پھر اسے بے گناہ قرار دے کر رہا کر دیا گیا۔ وہ عدالت میں پیشی کے روز خاص طور پہ ہم میں سے کسی سے مانگ کر سیاہ لباس پہن کر جاتی اور اپنا سر ڈھانپتی گویا اسے شوہر کا بہت غم ہو۔ ہمارے ساتھ اس کا معاملہ بہت اچھا رہا، پھر اس کی رہائی کے بعد ہمیں اس کے بارے میں کوئی خبر نہ ملی۔

## مشاورتی کمیٹی اور استحصال

جیل میں دو طرح کی قیدی خواتین تھیں: مجرم یا ملزم قیدی اور نظریاتی قیدی۔ جیل کے اہلکار سب کے لیے ایک جیسے تھے مگر ہم محسوس کرتے تھے، کسی جرم سے وابستہ خواتین کو ہم سے کہیں زیادہ آزادی حاصل تھی۔ ان پر پابندیاں بھی کم تھیں۔ لیکن لوگ ہماری جانب احترام کی نگاہ سے دیکھتے، کیونکہ ہم ضمیر کے قیدی تھے اور ہم نے کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا تھا۔ جیل کے عملے کا طرزِ عمل ہمیشہ ظالمانہ ہوتا، وہ ہمارا کوئی بھی مطالبہ ماننے یا اسے متعلقہ اہل کاروں تک پہنچانے میں کوئی تعاون نہ کرتے تھے۔ دوسری جانب وہ ہمیں ایکسپلائٹ کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ اسی پس منظر میں ایک ایڈوائزری کمیٹی بنائی گئی، تا کہ اچھے کردار کے حامل قیدیوں کو کچھ کرنے کا موقع دیا جائے۔ ہم نے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سن چوراسی میں یونیورسٹی کے باقی رہ جانے والے امتحان دینے کی درخواست دے دی، کیوں کہ ہماری تعلیم کا سلسلہ ان ہی کی مداخلت کے سبب ٹوٹ گیا تھا۔ درخواست اہل کاروں کو دی گئی تو انھوں نے کہا، جب تک اس کا آفیشل جواب آئے تم پڑھنا شروع کر دو۔ ہم پڑھائی میں جت گئے

اور امتحان کی تیاری کر چکے تو نامنظوری کا جواب آ گیا۔ اسی طرح ایک بار لجنہ کی جانب سے ہمیں وقت گزاری کے لیے ریشم کو درست کرنے کا کام سونپا گیا۔ ہمیں کہا گیا کہ ہمیں اس کام کی پوری اجرت دی جائے گی، ہم نے اس کٹھن کام پر کتنا ہی وقت لگا دیا، اہل کار آئے اور سلجھا ہوا ریشم لے کر چلے گئے اور ہمیں پھوٹی کوڑی تک نہ دی گئی۔ ہمیں سمجھ نہ آرہی تھی کہ اس کام کا ثواب بھی ملے گا یا نہیں، اگر اس ریشم سے رقص کے لباس تیار کیے جاتے ہیں، تو کیا اس میں ہمارا حصہ بھی ہوگا۔ بس ہماری محنت اور اجر دونوں ہی ایڈوائزر کمیٹی نے غبار میں اڑا دی۔

## شادی کا پیغام

قطنا جیل میں رہتے ہمیں کتنا عرصہ ہو گیا تھا، ہم زندگی کی رعنائیوں سے دور آہنی فصیلوں اور سلاخوں کے پیچھے قید تھے۔ اکتا دینے والے جیل کے پروگرام کے تحت روز و شب گزار رہے تھے۔ ان سب تکلیفوں کے باوجود جب ملاقات کے اوقات میں ہمارے اہل اور اقربا ہم سے ملنے آتے تو کچھ راحت کا احساس ہوتا، مگر کچھ نئی ملاقاتوں نے اس بارے میں بھی مجھے شدید کرب اور غم سے دوچار کر دیا اور اس کا سبب ملاقاتی تھے۔

یہ سن ۸۵ء کے آخری ایام تھے، جب اچانک میری خالہ مجھ سے ملاقات کو آ گئیں، حالانکہ میں نے انھیں کئی ذریعوں سے اس سے پہلے سلام بھجوایا اور ملاقات کی خواہش بھی کی تھی، مگر ان کی جانب سے کوئی جواب نہ آیا تھا۔ میں نے انھیں سلاخوں کے اُس پار دیکھا، تو میں خود پر قابو نہ رکھ سکی اور زور زور سے رونے لگی، مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میری امّی میرے سامنے کھڑی ہوں اور شاید پہلی مرتبہ ہی ان کے کھو جانے کا مجھے اس شدت سے احساس ہوا، لیکن آہستہ آہستہ میرے اندر ایک گھٹن کا احساس ہونے لگا۔ میں انھیں حیرت سے دیکھ رہی تھی اور میرے کان ان کے آنے کے مقصد کو بڑی اجنبیت سے سن رہے تھے۔ میری خالہ نے کہا کہ وہ اس سے پہلے اس لیے مجھ سے ملنے نہ آئیں کیوں کہ انھیں میرے بھائی نے ڈرا دیا تھا اور

ملاقات سے منع کیا تھا اور اب وہ اس لیے آئی ہیں کہ انھیں کچھ اتھارٹیز نے میری رہائی کی یقین دہانی کروائی ہے۔ بس ایک شرط ہے کہ میں جیل سے شادی کر کے باہر نکلوں جب میں نے اس شرط پر تعجب کا اظہار کیا اور انھیں بتایا کہ یہ شرط تو میرے مزاج سے بھی مطابقت نہیں رکھتی اور نہ ہی ان اتھارٹیز کے شایان شان ہے کہ وہ مجھ سے ایسا مطالبہ کریں، تو انھوں نے بات بدل ڈالی اور کہنے لگیں کہ یہ تو ان کی پہلی شرط ہے۔ میں نے شادی والی شرط سے صاف انکار کر دیا، کہ میں جس حال میں ہوں، اس میں رہائی کو شادی سے مشروط کرنا ناقابل عمل مطالبہ ہے۔ وہ پھر بھی جاتے ہوئے کہہ گئیں کہ وہ میرے جواب کا انتظار کریں گی اور جلد ہی دوبارہ حاضر ہوں گی۔ اگلے ہی روز وہ اپنے بیٹے سمیت آ حاضر ہوئیں، میں کمرۂ ملاقات میں پہنچی تو اس نے اپنا تعارف کروایا کہ وہ عسکری ادارے میں ملازمت کرتا ہے اور صرف میری خاطر اس نے اپنا تبادلہ قطنا میں کروایا ہے۔ صرف اس وجہ سے کہ وہ میرے قریب رہے اور اس نے نہایت بے حیائی سے جہالت آمیز فضول باتیں شروع کر دیں۔ مجھے اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ میں اسے وہیں چھوڑ کر اپنے بلاک میں واپس آ جاؤں۔ دو تین روز بعد وہ پھر ملاقات کو آ حاضر ہوا، میں نے اس کے سامنے داروغہ جیل سے کہا: اگر یہ اس کے بعد ملاقات کو آئے تو اسے اندر نہ بلانا کیونکہ میں اسے ملنا نہیں چاہتی۔ اسی ہفتے کے آخر میں وہ پھر میری خالہ کو ساتھ لے کر آ گیا، بلکہ وہ اپنے ساتھ منگنی کی انگوٹھی بھی لے آئے۔ فطری طور پر میرا لہجہ تلخ ہو گیا۔ میں ان سے اجنبیوں کی مانند ملی اور میں نے سختی سے ان سے پوچھا:

''آپ سے کس نے کہا کہ میں رضامند ہوں؟ میں نہ تو منگنی کرنا چاہتی ہوں نہ ہی رہائی مجھے مطلوب ہے، پھر آپ کیا چاہتی ہیں؟

بولیں: کیوں...... کیا تمھیں میرا بیٹا پسند نہیں؟

میں نے کہا: نہیں۔ آپ کے بیٹے کی حیثیت سے سر آنکھوں پر، لیکن میں اسے نہیں پسند نہیں کرتی۔

بولیں: ٹھیک ہے، اگر تمھیں منگنی نہیں کرنی تو بھی انگوٹھی اپنے پاس رہنے دو۔ وہ انگوٹھی پھینک کر چلی گئیں۔ میں نے داروغہ کو انگوٹھی واپس لوٹانے کے لیے بھیجا تو وہ جا چکی تھیں۔ اگلے روز خالہ زاد پھر اکیلا آ گیا۔ وہ مجھے کہنے لگا کہ میں ایک سفید کاغذ پر ہی اپنے بھائی صفوان کو لکھ دوں تو وہ خود ترکی جا کر اس سے منگنی کی منظوری لے آئے گا۔ اس کے اس پینترے سے مجھے ان کی سازش کا پتا چل گیا، وہ میرے ذریعے سے میرے بھائی صفوان تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ سارا کھیل خفیہ والوں کا رچایا ہوا تھا اور میرا خالہ زاد خود خفیہ ادارے کا اہل کار تھا، بلکہ میری خالہ بھی خفیہ والوں کی آلہ کار بنی ہوئی تھی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ مجھے میرے بھائی صفوان کے چارے کے طور پر استعمال کیا جائے اور جب وہ ترکی میں کسی مقام پر مجھ سے ملنے آئے تو اسے گرفتار کر لیا جائے۔ اس کے تقریباً ایک ہفتے بعد انھوں نے ایک تیسرے شخص کو بھیج کر اس کھیل کو پورا کرنے کی کوشش کی یہ عید الاضحیٰ کی چھٹیوں کے دن تھے یہ شخص میرے بھائی غسان کا سالا تھا اور اس کا نام حسنی ابراہیم پاشا تھا اور یہ بھی پہلی مرتبہ ہی میری ملاقات کو آیا تھا۔ میں اس کا نام ملاقاتیوں میں سن کر ہی چونک گئی، کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ حکومت کا مخبر ہے۔ میرے اس کے بارے میں تحفظات بڑھ گئے اور میں چونک کر رہ گئی جب میں نے اسے کہتے سنا:

ہم آپ کے لیے کام کر رہے ہیں، ہم نے بہت بڑا واسطہ استعمال کیا ہے۔ اگر آپ ہم سے تعاون کریں تو آپ عید کے چوتھے روز جیل سے باہر بلکہ ترکی میں ہوں گی۔ میں نے حیرت سے پوچھا:

میں فوراً ہی شام سے باہر کیوں چلی جاؤں؟ میں ایسا نہیں چاہتی۔ میں اپنے وطن میں رہنا چاہتی ہوں۔

وہ بولا: آپ کی رہائی کی شرط یہی ہے۔

اور جب میں نے اس سے پوچھا:

میں ترکی میں کیا کروں گی؟

بولا: تم اپنے بھائی کے پاس جاؤ گی۔

یوں میرے شکوک مزید بڑھ گئے اور جلد ہی سازش کی ساری کڑیاں میری سمجھ میں آ گئیں۔

اس روز حسنی کے جانے کے بعد جب ہمارے دروازے مقفل کیے گئے اور اس وقت غروب آفتاب ہونے کو تھا، ہم سب افطار کی تیاری کر رہی تھیں۔ ہم نے ذی الحجہ کے نفل روزے رکھے ہوئے تھے، جب جیل کا ایک نیک اہل کار غیر معمولی طور پر اندر آیا، وہ ہم سب کو ایک ایک کر کے دیکھنے لگا، پھر اس کی نظریں مجھ پر آ کر ٹھہر گئی۔ وہ واپس چلا گیا مگر جلد ہی لوٹ آیا، وہ دروازے کے سامنے کھڑا مسلسل لاحول پڑھ کر مجھ پر پھونک رہا تھا۔ جب ہم نے دیکھا کہ وہ کچھ نہیں کہہ رہا تو الحاجہ مدیحہ نے اس سے سوال کیا:

بابا کیا بات ہے؟ مجھے بتایئے۔ کیا کچھ ہوا ہے؟

وہ انھیں بلاک سے باہر لے گیا اور لرزتے کلمات میں بتایا:

امن دولہ کے اہل کار آئے ہیں، وہ ہبہ کو لے جانا چاہتے ہیں۔

وہ بظاہر اس سے مخاطب تھی لیکن اصل میں مجھے سنا رہی تھی:

آپ ہم سب کے سامنے بتا دیں۔ الحمدللہ ہبہ کا ایمان بہت مضبوط ہے اور وہ ہرگز خوف زدہ نہیں ہوگی۔

الحاجہ میرے پاس چلی آئیں اور بولیں:

میری پیاری اٹھو اور تیاری کر لو۔ لڑکیو اس کا سامان تیار کر دو، ٹوتھ برش اور جائے نماز بھی رکھ دینا۔

میں نے پوچھا: کیوں، کیا کوئی بات ہے؟

بولیں: وہ تجھے ہم سے لے جانا چاہتے ہیں، کچھ بھی نہیں، ڈرنا نہیں۔ خفیہ والے تجھے

لینے آئے ہیں اور ہم اس کے لیے تو تیار ہی رہتے ہیں۔

مجھے ایسا لگا کہ میرا دل کسی گیند کی مانند اچھل کر باہر آجائے گا اور برے برے خیالات مجھے ڈھا دینے کو تھے۔ مجھ سے وہ چھوٹا سا بیگ بھی نہیں اٹھایا جا رہا تھا جو لڑکیوں نے میرے ضروری سامان پر مشتمل تیار کر دیا تھا۔ میں سپاہی کے پیچھے ہولے ہولے چلنے لگی، جو خود بھی رو رہا تھا۔ اس سے میرا رعب اور خوف اور بڑھ گیا۔ میں جیلر کے کمرے میں پہنچی تو سول کپڑوں میں بیٹھا ایک شخص میرا منتظر تھا۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ اس افسر کا نام عمر ہے جو فوجی تفتیشی مرکز کا نگران ہے، اس نے مجھ سے مختصر سوال کیا:

آپ ہبہ ہیں؟

میں نے کہا: ہاں

بولا: ہمارے ہمراہ چلیے۔

میں نے پوچھا: کیا کوئی معاملہ ہے؟

بولا: نہیں۔ مختصر سی بات کرنی ہے۔

میرے ہاتھ بے جان ہو کر گر پڑے، میں بمشکل بولی: میں آپ کی مختصر باتیں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ مجھے پانچ منٹ کے لیے لایا گیا تھا، جواب تک پانچ برس ہو چکے ہیں۔

❖❖❖

## باب چہارم

# عسکری تفتیشی مرکز یا اندھا کنواں

# اگست ۱۹۸۵ـ اکتوبر ۱۹۸۵

مخابرات مدنیہ کی گاڑی مجھے لے کر فراٹے بھرنے لگی، وہ بہت تیزی سے زمین کی مسافتیں نگل رہی تھی۔ شدید اضطراب سے میری ٹانگیں بری طرح کانپنے لگیں، حتیٰ کہ انھیں اپنی جگہ رکھنے کے لیے میں نے انھیں دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ ہماری گاڑی باقی گاڑیوں کے مقابلے میں کافی زیادہ تیز ہے، میرا سر اچھل کر کبھی تو اس کی چھت سے جا ٹکراتا اور کبھی اپنے ہی کندھوں سے۔ باہر تاریکی تھی، جہاں کہیں روشنی ہوتی گاڑیاں اور لوگ پیچھے کی جانب دوڑتے ہوئے محسوس ہوتے۔ اس گاڑی کے پیچھے آنے والی حفاظتی گاڑی کی آواز بھی لوگوں پر عجب رعب طاری کر دیتی اور جب گاڑی ''نیو عرطوز'' کے پاس پہنچی اور یہ وہ مقام ہے جو عسکری پھانسی گھاٹ کہلاتا ہے، میں نے اپنے آپ سے کہا: تو یہ مجھے پھانسی دینے کے لیے لائے ہیں۔ لیکن گاڑی یہاں سے آگے نکل گئی اور اندھیرے نے ایک مرتبہ پھر ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لیا، یہاں تک کہ ہم ذیلی تحقیق عسکری المزہ پہنچ گئے، یہاں ہمارے انتظار میں دروازے پہلے سے کھلے ہوئے تھے، جلد ہی تینوں گاڑیاں بلند و بالا فصیل کے اندر داخل ہو گئیں اور اس کے ساتھ ہی میرا باہر کی دُنیا سے تعلق ختم ہو گیا۔

ہماری گاڑی عمارت کے مرکزی دروازے کے سامنے کھڑی ہو گئی، افسر آگے بڑھا اور وہیں بیٹھے بیٹھے میری پشت پر دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگا دیں اور میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی، میں نے اس سے کہا:

تفتیش کے دوران بھی کبھی مجھے ہتھکڑی نہیں لگائی گئی اور نہ ہی کبھی آنکھوں پر پٹی باندھی گئی ہے۔

وہ میرے کندھے کو جھٹکا دے کر جھڑک کر بولا: یہاں کے اپنے قوانین ہیں۔

وہ مجھے لے کر طویل زینے پر چڑھنے لگا۔ پھر ایک زینے سے نیچے اتارا اور پھر اوپر لے گیا، شاید وہ چاہتا تھا کہ میں مقام اور سمت کا احساس بھول جاؤں۔ اس اوپر نیچے کے سفر نے مجھے تھکا کے رکھ دیا، میں نے افطار کے بعد کچھ ٹھیک طرح کھایا بھی نہ تھا۔ اب مجھے کمزوری کا احساس ہونے لگا، وہ ایک جانب کافی دیر چلانے کے بعد بولا: دیوار کی سمت منہ کر کے کھڑی ہو جاؤ، پانچ منٹ یوں ہی کھڑے رہنے کے بعد قریبی دروازے سے آواز آئی:

اسے اندر لے آؤ۔

میں اندر داخل ہوئی تو بھی مجھے معلوم نہ تھا کہ میں کہاں ہوں۔ افسر میرا ہاتھ پکڑ کر ایک کرسی کے پاس لے گیا اور بولا: بیٹھ جاؤ اور میں بیٹھ گئی، میری آنکھوں کی پٹی کے ذرا ڈھیلے ہونے سے مجھے کچھ نظر آنے لگا، سامنے پڑے میز پر روشنی سے مجھے سامنے بیٹھے اہل کار اور اس کے پیچھے کھڑے شخص کا ہلکا سا ہیولہ نظر آیا، اس نے مجھ سے پوچھا: تم اپنے سامنے کیا دیکھ رہی ہو؟

میں نے کہا: کچھ نہیں۔

مجھ سے بات کرنے والا برانچ کا رئیس، جیلر کمال یوسف تھا، وہ اپنے بارے میں بہت خوف کا شکار رہتا، شاید اس وجہ سے کہ وہ مسیحی تھا۔ وہ کسی کو اپنی صورت نہ دکھاتا تھا، تاکہ کوئی اسے پہچان نہ پائے۔ وہ دوسرے اہل کار کی جانب متوجہ ہو کر بولا:

دوسرا کہاں ہے؟

وہ بولا: نیچے قید تنہائی نمبر ۲۳ میں۔

میں نہیں جانتی تھی کہ وہ کس کے بارے میں بات کر رہے ہیں، لیکن میرے دل میں خوف سا

بیٹھ گیا، ایسا نہ ہو کہ یہ دوسرا میرا بھائی ہو اور اس سے تحقیق کے دوران انھوں نے مجھے بھی بلا لیا ہو۔

عقید نے دوبارہ پوچھا: وہ کیسا ہے؟

دوسرا اہل کار بولا: زمین پر بیٹھا ہے، ہاتھ اور پاؤں زنجیروں سے بندھے ہیں اور سیدی کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہے۔

وہ مجھے واضح پیغام دینے کے بعد مجھ سے سوال پوچھنے لگا:

ہوں۔ محترمہ ہبہ صاحبہ۔ بتایئے۔ اگر آپ سچ سچ بتائیں گی تو آپکی رہائی کی ایک امید ہے اور اگر آپ نے جھوٹ بولنے کی کوشش کی تو آپ کبھی بھی یہاں سے باہر نہیں نکل سکیں گی۔

میں نے کہا: میں اپنی بہترین کوشش کروں گی۔

وہ سرد لہجے میں بولا: یہ بہترین کوشش کیا ہوتی ہے؟

میں نے کہا: کیونکہ ہو سکتا ہے کہ آپ جس بارے میں سوال کریں اس کے بارے میں میرے پاس معلومات ہی نہ ہوں، کیونکہ میں گزشتہ پانچ برسوں سے جیل میں ہوں اور جیل کے بارے میں تو آپ بھی جانتے ہی ہیں کہ یہاں نہ خبر داخل ہوتی ہے نہ یہاں سے نکلتی ہے اور میں نے تو کبھی ٹیلی وژن بھی نہیں دیکھا۔

بولا: اور تم قیدیوں میں بھی نہیں گھلتی ملتی؟

میں نے کہا: نہیں۔

بولا: کیوں؟ کیا تم ان سے مختلف چیز ہو؟

میں نے کہا: نہیں، لیکن ہر شخص کا مزاج مختلف ہوتا ہے اور میں کسی سے بات کرنا پسند نہیں کرتی۔

بولا: اور کیا سزا یافتہ قیدیوں سے بھی نہیں؟

میں نے کہا: حقیقت یہ ہے کہ میں نے سزا یافتہ قیدیوں سے کبھی کوئی تعلق نہیں رکھا۔

بولا: کیوں؟ کیا وہ انسان نہیں ہوتیں؟

میں نے کہا: نہیں، ایسی کوئی بات نہیں، میں بلاک میں اپنی ساتھیوں سے بھی بہت کم بات کرتی ہوں۔

وہ بولا: نہیں۔ میں چاہتا ہوں مجھے یہ بتاؤ کہ تمھاری رازدار کون ہے۔

میں نے کہاں: میری کوئی رازدار سہیلی نہیں اور میرے پاس ایسے کوئی راز بھی نہیں جسے چھپانے کے لیے مجھے کسی کی ضرورت ہو۔

بولا: یوں نہ کہو۔ تم یہ نہ سمجھو کہ مجھے تمھاری ساتھی قیدیوں کی کچھ خبر نہیں۔ یہ درست ہے کہ تم سول جیل میں رہی ہو مگر میں پھر بھی سب کچھ جانتا ہوں۔

میں نے کہا: اگر آپ سب کچھ جانتے ہیں تو یہ بھی بتا دیجیے کہ میری رازداں کون ہے؟

بولا: ماجدہ۔

جب اس نے اس کا ذکر کیا تو مجھے یاد آ گیا کہ میرا خالہ زاد بھی ماجدہ سے کس قدر نالاں تھا، کیونکہ وہ جب بھی ملاقات کو آتا ماجدہ میرے ساتھ ہوتی، اس نے اسے روکنے پر مجھے بہت ہمت دلائی تھی اور اس کی کئی باتوں کا جواب وہ مجھ سے پہلے ہی دے دیتی اور اسے کہتی کہ وہ میرا پیچھا چھوڑ دے۔ وہ اس سے بہت تنگ ہوتا، اسی وجہ سے جیلر کہہ رہا تھا کہ وہ میری رازدان ہے اور مجھے یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ اس فساد میں میرے خالہ زاد کا کتنا حصہ ہے۔ جب میرے ذہن میں یہ باتیں آئیں تو میں نے افسر سے کہا:

وہ نہ تو میری رازدان ہے نہ کچھ اور۔ فقط میرے پاس بیٹھنے والی ایک ساتھی ہے۔ وہ جیل میں بھی بہت عرصہ میرے ساتھ رہی اور ہم یونیورسٹی میں بھی اکٹھے پڑھے، میرے پاس کیا راز ہے جو میں چھپاؤں گی؟

بولا: یہ تو میں نہیں جانتا، بلکہ یہ تو تم مجھے بتاؤ گی۔

میں نے کہا: میرے پاس کوئی راز نہیں اور اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو مجھے اس قصور میں پھر جیل بھجوا دیجیے اور پوری عمر وہیں پڑا سڑنے دیں۔ یہ اس سے بہتر ہے کہ آپ مجھ پر ایسے الزامات تراشیں جن کا کوئی وجود نہیں۔

اس نے بات دوسری جانب گھمائی: اچھا یہ تو بتاؤ جیل میں تم سے ملنے کون آتا تھا؟

میں نے بتایا: میری چچازاد بہن آتی تھی اور سب جانتے تھے کہ وہ دمشق میں میڈیکل کی سٹوڈنٹ تھی اور کبھی کبھار مجھ سے ملنے آتی اور بس میں ایک آدھ مرتبہ میری چچی اور چچا آتے ہیں۔

بولا: صرف یہی، کوئی اور نہیں؟

میں نے کہا: نہیں۔

وہ تمسخرانہ انداز میں بولا: اور یہ حسنی۔ یہ نہیں آتا تھا؟

اور کیوں کہ یہ کھیل پوری طرح مجھ پر منکشف نہیں ہوا تھا اس لیے میں نے حسنی کا نام نہ لیا کہ کہیں اسے ملازمت میں کوئی مشکل نہ پیش آئے۔ میں نے کہا: وہ صرف ایک مرتبہ آیا تھا، شاید اسی لیے میں اس کا ذکر کرنا بھول گئی۔

وہ بولا: اچھا میں تمھیں کاغذ قلم دیتا ہوں، بلا جھوٹ بولے اپنے سب ملاقاتیوں کے نام لکھ دو۔

میں نے کہا: ان شاءاللہ جھوٹ نہیں بولوں گی۔

اس نے دوسرے کمرے میں لے جا کر میری آنکھوں سے پٹی اتاری اور کاغذ قلم دے دیا، دس منٹ بعد وہ پھر آیا اور آنکھیں باندھ کر وہیں لے گیا۔

افسر نے پوچھا: تم کچھ اور کہنا چاہتی ہو؟

میں نے کہا: نہیں۔

اس نے اہل کار کی جانب اشارہ کیا: اسے المنفرد وہ (قید تنہائی) میں لے جاؤ۔

اہل کار مجھے پھر اسی طرح ہاتھ پاؤں اور آنکھیں باندھے نچلی منزل پر لے گیا۔ مجھے گاڑی میں سوار کر کے پوری عمارت کا چکر لگایا، پھر وہ مجھے اسی دروازے پر لے آئے اور چالیس سیڑھیاں نیچے اتر کر ایک کوٹھڑی میں چھوڑ گئے

## چاند رات اور قبر مبارک

زینے پتھروں کے بنے ہوئے تھے اور لوگوں کی آمد و رفت کی کثرت نے انھیں توڑ پھوڑ دیا تھا۔ جب ہم نیچے پہنچے تو انھوں نے پہلے مجھے معلومات کے کمرے میں داخل کیا، وہاں انھوں نے مجھ سے گھڑی اتروالی، میری کنگھی اور نقدی بھی لے لی اور یہ سب چیزیں ایک جگہ رکھ کر ان پر میرا نام لکھا، الزام "اخوان المسلمین" سے تعلق کا تھا۔ پھر مجھے دفتر میں بٹھا دیا اور اہل کار جانے لگے تو میں نے کہا: میری آنکھوں کی پٹی تو اتار دیں۔

بولا: یہ نہیں ہو سکتا۔

میں نے کہا: آپ نے اس شدت سے پٹی باندھی ہے کہ مجھے سانس میں دشواری ہو رہی ہے۔

بولا: آنکھوں کی پٹی کا سانس سے کیا تعلق؟

میں نے کہا: ہو سکتا ہے۔ میرا نفسیاتی احساس ہو۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور چلا گیا۔

پھر ایک دوسرا اہل کار آیا، میں نے اس سے بھی یہی درخواست کی تو وہ کہنے لگا: اگر واقعی تمھیں تکلیف ہو رہی ہے تو خود ہی کچھ ڈھیلا کر لو۔

رات کا تقریباً ایک بج چکا تھا۔ اس قدر خوف اور تھکاوٹ کے باوجود نیند میری آنکھوں سے دور تھی، مجھے پانچ برس قبل کی راتیں یاد آنے لگیں جب اسی طرح میں بے خوابی کا شکار رہتی۔ ویسا ہی اضطراب اور پریشانی پھر لوٹ آئی تھی۔ میرے دل پر شاید کسی نے کوئی

بھاری پتھر رکھ دیا تھا۔

میرے کمرے کے سامنے لوگ آ جا رہے تھے۔ وہ اپنے انداز میں چاندرات منا رہے تھے، بالکل ایسے ہی جیسے پانچ برس پہلے کے مناظر لوٹ آئے ہوں۔ ان کے فاجرانہ قہقہے گونج رہے تھے اور ان کی فحش باتیں مسلسل میرے کانوں کے پردوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ میرے سر میں ایک ہی سوال کسی ہتھوڑے کی مانند چوٹیں لگا رہا تھا: اتنے برس گزر جانے کے بعد آج پھر وہ مجھے یہاں تنہا کیوں لے آئے ہیں؟ اور انھوں نے اب تک مجھ سے کوئی سوال کیوں نہیں پوچھا، وہ مجھ سے کیا سلوک کرنا چاہتے ہیں؟ یوں ہی بیٹھے بیٹھے صبح ہو گئی، میں نے ان سے کہا کہ مجھے بیت الخلا جانا ہے، وہ مجھے ایک ایسے بیت الخلا میں لے گئے جو اہل کاروں کے زیرِ استعمال تھا، اس کا دروازہ زمین سے ایک ہاتھ اونچا تھا۔ اہل کار سامنے بیٹھے تھے، میں ڈر گئی اور ضرورت پوری کیے بغیر باہر نکل آئی اور میں نے اسے کہہ دیا کہ مجھے حاجت نہیں رہی۔

میں واپس اسی کرسی پر بیٹھ گئی اور عصر کے وقت تک کسی نے مجھ سے کوئی سوال نہ پوچھا، یہاں تک کہ کسی نے مجھے کھانے کو بھی نہ پوچھا۔ اس کے بعد ایک اہل کار آیا اور مختلف راستوں سے گھماتا ہوا مجھے اس سیل میں لے آیا جو خصوصی طور پر مجھے الاٹ کیا گیا تھا۔ راستے میں ایک جگہ کئی قیدی مختصر لباس میں نظر آئے، ڈاکٹر ان کا معائنہ کر رہا تھا، نجانے انھیں خون کی کوئی بیماری ہو گئی تھی یا خون کی کمی تھی، ان کا خون ٹیسٹ کیا جا رہا تھا۔ میں جوں ہی ان کے قریب سے گزری، داروغہ کی بارعب آواز سنائی دی:

## منہ دیوار کی جانب

اس کے ساتھ ہی کوڑا برسنے کی آواز سنائی دی، جس کے ساتھ ہی سب کے منہ دیوار کی جانب ہو گئے۔ جب ہم قیدِ تنہائی کے حصے میں پہنچے تو سجان (داروغہ) نے اس کا بھاری پٹ کھولا، میں نے اس سے سوال کیا:

کیا میں یہاں رہوں گی؟

وہ استہزائیہ ہنسی ہنستے ہوئے بولا: ہاں۔ یہ سب سے اچھا قید تنہائی کا سیل ہے، بلکہ یہ اے کلاس کو ملتا ہے۔ اللہ کا شکر ادا کرو کہ تم یہاں رہو گی۔

میں نے پوچھا: کیا کہا؟

بولا: ہاں۔ یہ سب نئے منفردات (سیلز) ہیں، اس سے پہلے یہاں کوئی نہیں آیا۔ بس اللہ کا شکر ادا کرو اور اندر داخل ہو جاؤ۔

اس نے دو کمبل میری جانب اچھالے اور بھاری آہنی دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے میرا سانس گھٹ رہا ہو۔ ڈیڑھ میٹر لمبائی اور نصف میٹر چوڑائی اور بس۔ دیواریں بہت موٹی تھیں اور چھت اتنی نیچی تھی کہ میں اسے ہاتھ سے چھو سکتی تھی۔ اس کے درمیان میں ہوا کے لیے جگہ بنی ہوئی تھی مگر وہ بھی بند تھی اور اس کے علاوہ کوئی کھڑکی اور روشن دان نہ تھا۔ دروازے کے ساتھ والی دیوار پر طاق میں ایک ہلکی روشنی کا بلب تھا، جس سے فقط طاق ہی روشن ہوتا تھا جب اس کا دروازہ بند ہوا تو مجھے ایسے لگا کہ جیسے میں قبر میں ہوں۔ میری کیفیت بھی ایسی ہی تھی جیسے میں موت کے دروازے پر دستک دے رہی ہوں۔ میری سانسیں بے ترتیب ہونے لگیں۔

یہ لمحات بڑے کٹھن تھے، میں خود پر قابو نہ رکھ سکی، میں اپنے آپ کو اس سب کے لیے تیار بھی نہ کر سکی جو ہونے والا تھا یا میرے ساتھ یہ سب کیوں ہو رہا ہے۔ مجھے اس وقت ہوش آیا جب ایک اہل کار میرے سیل کا دروازہ کھول رہا تھا۔ باہر بھی تاریکی تھی، اہل کار چھڑی کے کنارے سے مجھے ہلا کر بولا:

اٹھو۔ اٹھ جاؤ۔

میں نے اپنے حواس پر قابو پایا اور پوری قوت سمیٹ کر اٹھی تو مجھے اندازہ ہوا کہ رات

بیت چکی ہے اور اب خط (بیت الخلا) جانے کا وقت ہے۔ شاید میں بے ہوش ہو گئی تھی، ہوش آیا تو ایسا لگا جیسے عزرائیل سامنے کھڑا ہو۔ مجھے صحیح احساس نہیں ہو رہا تھا۔ میں گھبراہٹ کا شکار تھی ...... کمزوری کا...... یا خوف کا؟ یا سب چیزیں جمع ہو گئی تھیں۔ مجھے روز و شب کا احساس نہ رہا۔ میرے پاس گھڑی بھی نہ تھی کہ کچھ اندازہ رہتا۔ جب مجھے پکارا گیا، میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے باوجود کہ اعصاب تھک چکے تھے۔ میں اس کے پیچھے حمام میں چلی آئی جو کافی وسیع تھا اور اسی قدر گندا بھی۔ میں منہ ہاتھ دھو کر نکل آئی۔ وہ کھانا لے کر آ گیا، جو خواہش نہ ہونے کے سبب میں نے لوٹا دیا۔ اب میرے پاس کچھ کرنے کو نہ تھا، میں دوبارہ قیدِ تنہائی کے سیل میں داخل ہوئی اور داروغہ نے ایک مرتبہ پھر اسے مقفل کر دیا۔ میں اندھوں کی مانند جگہ ٹٹولتی ہوئی بیٹھ گئی۔ پچھلی دیوار سے عجیب سی آواز آنے لگی، لیکن جلد ہی مجھے احساس ہوا کہ وہ مرکزی ائر کنڈیشنڈ کی آواز ہے، جو سیل میں ٹھنڈک تو نہ کرتا تھا، مگر ہر پانچ منٹ کے بعد سٹارٹ ہو کر سکون کو درہم برہم کر دیتا تھا۔ باہر سے کبھی کبھار داروغوں کی ڈانٹ ڈپٹ سکون میں خلل ڈالتی اسی حالت میں نہ جانے کب میں بے ہوش ہو گئی۔ اٹھی تو عید کی تکبیرات سنائی دے رہی تھیں۔

## ریاض ترک کے سیل سے تکبیرات عید

عید کی تکبیرات مشہور کمیونسٹ رہنما ریاض ترک کے سیل سے سنائی دے رہی تھیں، جو دس برس سے قیدِ تنہائی کاٹ رہا تھا۔ اسے جیل میں کچھ استثنائی سہولیات حاصل تھیں، جن میں ایک بڑا ریڈیو بھی شامل تھا۔ میرا سیل جس گزرگاہ پر تھا وہاں چار سیل تھے، ہر دو سیلوں کے سامنے بھی دو سیل تھے۔ میرا سیل داہنی جانب سے پہلے نمبر پر تھا۔ اس کے ساتھ والا خالی تھا اور اس کے مقابل ریاض ترک کا سیل تھا۔ میرے سامنے والا سیل بھی پہلے خالی تھا، پھر اس میں مختلف نوجوانوں کو رکھا گیا۔ میں نے ان میں سے صرف ایک کو راستے سے گزرتے ہوئے دیکھا۔ میرے سیل کا دروازہ ہوا کے لیے کھلا ہوا تھا۔ وہ اس کے لیے کھانا لائے تھے اور وہ ان سے وضو

کے لیے باہر نکلنے کی التجا کر رہا تھا۔ جہاں تک ریاض ترک کا تعلق ہے تو اسے قیدیوں میں کافی امتیاز حاصل تھا۔ اس کی ملاقات بھی آتی تھی، اسے ریڈیو رکھنے کی اجازت تھی۔ وہ اپنے لیے پسند کا کھانا بھی پکوا سکتا تھا، اہل کار اس کے لیے کھانا پکانے اور کبھی برتن دھونے میں مصروف نظر آتے تھے۔ کچھ دن گزرنے کے بعد ریاض اپنے کھانے میں سے کچھ حصہ مجھے بھی بھجوانے لگا، مگر میں اسے بغیر کھائے واپس کر دیتی تھی۔ اسی طرح وہ کبھی کبھار ٹشو پیپرز اور چائے اور کچھ دیگر چیزیں بھجوا دیتا۔ ایک مرتبہ میرے سیل کے سامنے کھڑا وہ اہل کار سے مجھے دیکھنے کی درخواست کر رہا تھا۔ اہل کار نے اسے اجازت دے دی، بس وہ مجھے دیکھ کر چلا گیا، اسی طرح چند اور بار بھی اس سے سامنا ہوا۔ اس نے مجھے دیکھا، لیکن بولا کچھ نہیں۔ عید کے روز بھی میں اس کے ریڈیو پر چلنے والی تکبیرات سے بیدار ہوئی تھی، لیکن میرا دل مبارک باد کے کلمات سے محروم تھا، لوگ آج کس قدر خوش ہوں گے، حسرت سے میرا دل گھٹنے لگا اور میں بلا ارادہ ہی زور زور سے رونے لگی۔ لوگ عید کے مزے لوٹ رہے ہوں گے، لیکن ہم سب قیدیوں کے لیے عید کا وجود کوئی معنی نہیں رکھتا، بلکہ انھیں تو رات دن کی گردش کی بھی خبر نہیں اچانک دروازہ کھلا اور ایک اہل کار جو قصیر قامت اور بڑی بڑی مونچھوں والا تھا، مجھ سے پوچھنے لگا:

تمھارا نام کیا ہے؟

میں نے کہا: کیوں؟

بولا: اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ یہاں ایک قیدی کی تم سے کافی مشابہت تھی، وہ جا چکی ہے، کہیں تم وہی تو نہیں؟

میں نے کہا: نہیں۔

ہماری ساتھی ابتسام قطنا آنے سے پہلے یہاں رہی تھی، شاید وہ اسی کا پوچھ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور جیلر افسر عمر آ حاضر ہوا، اس کے ہمراہ کئی اہل کار تھے۔

وہ ایک برتن میں دلیا لائے، افسر عمر نے اسے پاؤں سے میری جانب دھکیلا اور بولا:

اپنی چالیں چھوڑ دو۔

میں نے کہا: یہ ممکن نہیں۔

بولا: تمھارا نام کیا ہے؟

میں نے کہا: یہ تم کل جان نہیں چکے؟

بولا: جواب دو۔ یہ کیا بدتمیزی ہے۔

وہ مجھے گالیاں دینے لگا اور مجھ پر چلانے لگا، مجھے بھی غصہ آ گیا اور میں چیخ کر بولی:

کیا میں جان سکتی ہوں کہ تم نے مجھے کیوں یہاں رکھا ہے۔

یہ تم بھی اچھی طرح جانتی ہو۔

میں نے کہا: لیکن میں نے کچھ نہیں کیا۔

وہ سرد مہری سے بولا: اگر تم نے کچھ نہیں کیا تو تم کل ہی رہا ہو جاؤ گی۔

میں نے منت بھرے انداز میں کہا: مجھے اتنا تو بتا دو کہ مجھ پر الزام کیا ہے اور مجھے کب تک یہاں رہنا ہے۔

مجھے لگتا تھا کہ میں اگر یہاں رہی تو واقعی پاگل ہو جاؤں گی۔ اس کا جواب مجھے مزید اندھیرے میں ڈالنے والا تھا، وہ جاتے ہوئے کہہ گیا:

تم اپنے بارے میں اتنا بھی نہیں جانتی کہ تم مجرمہ ہو۔

پھر وہ باقی سیلز کا راؤنڈ لینے چلا گیا۔ میرے اعصاب جواب دے گئے اور میں اس اندھیری قبر میں بیٹھ کر بری طرح رونے لگی۔ میں اللہ تعالیٰ سے عرض گزار تھی، اے اللہ میرے لیے کشائش کا دروازہ کھول دے۔ کچھ منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ دروازے پر پھر سے دستک ہوئی۔ ایک اہل کار مجھے سرگوشی میں کہہ رہا تھا:

میری بہن ڈرو نہیں، مجھے اپنا بھائی سمجھ لو۔ مجھے بتاؤ: میں تمھارے لیے کب تک دروازہ کھلا رکھوں؟

مجھے اپنی سماعت پر یقین نہ آ رہا تھا: اگر تمھیں اختیار ہے تو میں کہوں گی اسے کھلا رہنے دو۔ کیونکہ دروازہ بند ہوتا ہے تو میں سانس نہیں لے سکتی اور ائر کنڈیشنڈ جو ہر وقت شور مچاتا رہتا ہے مجھے اس کی ذرا سی بھی ٹھنڈک نہیں پہنچتی۔

وہ بولا: میں اسے تمھاری خاطر رات کو بھی کھلا رکھوں گا، لیکن اگر کسی نے پوچھا تو میرا نام نہ بتانا۔

اس نے مجھے ایک لیرہ کا سکہ بھی دیا اور بولا: یہ رکھ لو، ہو سکتا ہے کبھی کام آجائے اور اگر کوئی بھی چیز چاہیے ہو تو بس دروازے پر ایک مرتبہ ہاتھ مار دینا میں آجاؤں گا۔

اور پھر یہ داروغہ چلا گیا، جسے میں یہاں ''س'' کہوں گی، بس ''س'' مجھ سے میری ضروریات پوچھ لیتا اور جب اہل کاروں میں مختلف چیزیں تقسیم ہوتی تو وہ نظر بچا کر کبھی دودھ کا ڈبہ یا کوئی اور چیز مجھے دے جاتا اور میں بھی اسے ہی اپنی ضروریات کے بارے میں بتاتی، جب اس کی ڈیوٹی ہوتی وہ مجھے حمام بھی لے جاتا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ وہ واقعی اچھا آدمی ہے اور دیانت دار ہے، تو ایک مرتبہ میں نے اس سے کہا کہ مجھے کنگھی اور ناخن تراش کٹر چاہیے، اس نے حیران ہو کر پوچھا: تمھارے پاس کنگھی بھی نہیں؟

میں نے کہا: انھوں نے میرا سامان ضبط کر لیا ہے۔

اس نے کہا: کہ میں افسر کے نام درخواست لکھ دوں۔

اس کے جواب میں کنگھی تو آگئی مگر وہ اتنی گندی تھی کہ لگتا تھا تمام قیدی اسے ہی استعمال کرتے ہیں۔ اس کے دندانوں میں اتنا گند جمع تھا کہ وہ کسی صورت صاف نہ ہوئی۔ جب میں نے دوسری کنگھی مانگی تو انکار میں جواب آگیا۔

اس وقت مجھے وہاں رہتے ہوئے دس روز ہو چکے تھے، نہ میں کنگھی کر سکی نہ غسل۔ سکارف بھی تمام وقت سر پر بندھا رہتا، حتیٰ کہ مجھے خوف لاحق ہوا کہ کہیں جوئیں ہی نہ پڑ جائیں۔ میں نے ''س'' سے کہا تو پہلے تو اس نے معذوری ظاہر کی مگر جب کوئی وسیلہ نہ ملا تو وہ ریاض ترک سے کنگھی اور ناخن تراش لے آیا۔ اس نے صابن اور پلاسٹک کی بالٹی بھی دے دی۔ رات کو تقریباً دو بجے اس نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا اور مجھے کہا کہ میں اس کے پیچھے حمام میں آجاؤں۔ میں باہر نکلی تو ہر جانب خاموشی تھی اور اس خاموشی میں عجب خوف تھا، جب ہم غسل خانوں کے پاس پہنچے تو وہاں ایک اور اہل کار یا سین ڈیوٹی دے رہا تھا، ''س'' نے اس سے کہا کہ غسل خانوں کے باہر سے دروازہ بند رکھے اور کسی کو اس جانب جانے نہ دے۔ جب میں غسل کے لیے اندر داخل ہوئی تو نجانے کیوں میری چھٹی حس مجھے کسی خطرے کا احساس دلانے لگی۔ مجھے خوف ہوا کہ کہیں یہ اہل کار اندر ہی نہ آجائے، بس میں یوں ہی غسل خانے میں کھڑی رہی اور کپڑے نہ اتارے، تھوڑی ہی دیر بعد مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے دروازے کے نچلے سوراخ سے دیکھا تو مجھے مردانہ جوتے بھی نظر آگئے۔ میں نے فوراً ہی دروازہ کھولا اور باہر کی جانب بھاگی، وہ پیچھے سے پکارتا رہا:

کہاں...... کہاں جارہی ہو؟

میں نے چلا کر جواب دیا: مجھے اسی وقت جیلر کے پاس لے چلو۔ او بدتمیز انسان تم کیا کر رہے تھے۔

وہ میرے پیچھے بھاگتا ہوا بولا:

آجاؤ۔ تم جیل کے نظام کی نافرمانی کر رہی تھی۔

میں اتنی اونچی آواز میں بولی کہ میرے سیل تک میری آواز اچھی طرح پہنچ جائے:

جیلر کو فوراً بلاؤ تا کہ جیل کے نظام کی خلاف ورزی نہ ہو۔

"س" نے شاید میری آواز سن لی تھی، وہ بھاگتا ہوا آ گیا، جب میں نے اسے اس کی کارستانی بتائی تو وہ غضب ناک ہو کر بولا:

بجائے اس کے کہ تم پہرا دو تم کیا کرنے چلے تھے او حقیر انسان۔

پھر اس نے مجھ سے معذرت کی کہ اب میں اطمینان سے غسل کر لوں، اب کچھ نہیں ہوگا۔

میں نے اندر جا کر دروازہ بند کر لیا اور تقریباً ایک گھنٹہ شش و پنج کا شکار رہی، پھر جب اطمینان ہو گیا تو غسل کیا۔ میں باہر نکلی تو یاسین اسی جگہ کرسی ڈالے بیٹھا تھا، مجھے دیکھ کر بولا:

کیا تم اس پیاری صورت کو آئینے میں نہ دیکھنا چاہو گی۔ اگر چاہو تو میرے ساتھ آ جاؤ۔

میں نے حقارت سے جواب دیا:

اللہ تمھیں عافیت نہ دے۔

اس کے دس روز بعد ایک دوپہر جب گرمی اپنی شدت پر تھی اور کوٹھڑی میں سانس لینا دشوار ہو رہا تھا اچانک پسینے کی تیز بو کے ساتھ قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی مقدم عمر کی آواز آئی۔ اس نے مجھے باہر بلا کر میری آنکھوں پر پٹی باندھی اور میرے ہاتھوں میں پیچھے سے ہتھکڑی لگا دی اور مجھے لے کر مختلف راستوں پر چلنے لگا، کچھ دیر بعد میرا سانس گھٹنے لگا، میں نے اس سے کہا کہ وہ ذرا دیر کو میری آنکھوں سے پٹی ہٹا دے کیونکہ مجھے سانس لینا دشوار ہو رہا ہے۔ وہ بیزاری سے بولا:

اگر تم مر جاؤ تو بھی اسے نہیں ہٹاؤں گا۔ یہاں کا قانون یہی ہے۔

پھر وہ مجھے جیلر کمال یوسف کے کمرے میں لے آیا، اس نے مجھ سے فقط یہی پوچھا:

کیا تم کچھ کہنا چاہتی ہو؟

میں نے حیرت سے کہا: نہیں۔ کیوں؟

اس نے میری بات کا جواب دیے بنا اہل کار کو اشارہ کیا: اسے لے جاؤ۔

وہ مجھے پھر سے قیدِ تنہائی کے سیل میں لے آئے، جہاں میں بیس روز تک اس حال میں رہی کہ نہ رات دن کا احساس تھا نہ سورج چاند کے طلوع و غروب کا۔ صبح شام کا پتا بھی داروغوں کی ڈیوٹی تبدیل ہونے سے چلتا تھا۔ ہاں ہر روز عصر کے وقت ریاض ترک کے سیل سے بی بی سی لندن کی نشریات ضرور سنائی دیتیں۔

## عسر و یسر

اللہ کی رحمت بہت وسیع ہے اور ہر جگہ چھائی ہوئی ہے، یہ کیا دن تھے کہ اللہ نے اپنے لشکر کا ایک اور سپاہی میری مدد کو بھیج دیا، جو عسکری خدمات پر مامور تھا۔ اس نے مجھ سے بہت اچھا سلوک کیا۔ وہ میرے لیے کئی چیزیں بھجوا دیتا اور اس کی وجہ سے مجھے دن میں کئی مرتبہ حمام میں جانے اور پانی پینے کی اجازت مل گئی، بلکہ اسے جب ہمارے سیلوں کے ائرکنڈیشنڈ کی خرابی کا پتہ چلا تو اس نے اسے بھی درست کروا دیا۔ میں حمام میں جاتی تو میرے باہر نکلنے تک داروغہ میرا سیل صاف کر چکا ہوتا، لیکن ایسے نمونے ان جگہوں پر بالکل استثنائی ہوتے ہیں جہاں کے رہنے والے ظالم ہوں، بلکہ ان جگہوں کا رواں سکہ بد اخلاقی، بے مروتی اور بے توقیری ہی ہوتا ہے۔ یہاں پر اہل کار درشتی سے بات کرتے، کوڑے برساتے اور زنجیروں میں باندھتے ہیں۔ افسر عمر تو جدھر بھی جاتا اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی اور آنکھوں کی پٹی ہوتی، البتہ سیل میں مجھے تعذیب کی چیخ و پکار سنائی نہ دیتی کیونکہ ٹارچ سیلز یہاں سے کافی دور تھے۔ ایک مرتبہ ایک اہل کار کھانا تقسیم کرنے کے بعد بچے ہوئے فلافل (ناشتے میں کھانے والی خوش ذائقہ بند نما چیز) لے کر میرے پاس آ گیا اور بولا:

تمھیں بھوک تو نہیں لگی؟

میں نے کہا: نہیں...... لیکن مجھے ایک سوال کا جواب تو دو، میں کب تک یہاں قید رہوں گی؟

بولا: بخدا میں نہیں جانتا۔ ہمیں ان امور کے بارے میں معلوم نہیں ہوتا۔

میں نے کہا: اچھا...... حسبی اللہ۔

لیکن واپس جانے کے بجائے وہ وہیں بیٹھ گیا، اس نے سفید باریک لباس پہن رکھا تھا، وہ پینترا بدل کر بولا:

تم چاہو گی کہ یہاں کا کوئی شخص کوشش کر کے تمھیں رہائی دلوا دے؟

میں نے کہا: نہیں۔

وہ حیرت سے بولا: عجیب بات ہے۔ میں نے تمھارے علاوہ کسی کو اس طرح جیل میں بیٹھے رہنے کا مشتاق نہیں دیکھا۔

میں نے کہا: الحمد للہ۔

کہنے لگا: لیکن خدا کی قسم مجھے حیرت ہے۔ تمھیں پانچ برس جیل میں رکھنے کے بعد وہ پھر یہاں کیوں لے آئے۔ تم اس کا سبب نہیں جانتیں؟

میں نے کہا: نہیں، میں نہیں جانتی، اللہ نے ایسا ہی لکھا ہے۔

وہ بولا: اچھا اگر اب یہ تمھیں رہا کر دیں اور اللہ کی قسم تم میری بہن کی طرح ہو، میں یہاں بالکل اکیلا رہتا ہوں، دو کمرے کا اپارٹمنٹ ہے اور تم تو جانتی ہی ہو کہ عسکری زندگی کیسی ہوتی ہے۔ بالکل مہاجروں کی طرح۔ بس ایک کمرے میں تم رہ لینا اور ایک میں میں۔

میں دیکھ رہی تھی وہ کافی پھیلتا جا رہا ہے، میں ڈانٹ کر بولی: کیا یہ مناسب ہے؟

بولا: وہ مجھے معلوم ہوا تھا کہ تمھارا اور کوئی نہیں۔

میں نے کہا: تمھیں کس نے کہا؟

بولا: میں جانتا ہوں تمھارے گھر والے حماۃ کے حوادث میں مارے جا چکے ہیں۔

میں ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی:

اور جب کسی کا کوئی نہیں ہوتا تو کیا اس کا اللہ نہیں ہوتا؟ میرے لیے اللہ کافی ہے۔

وہ کھسیانا ہو کر بولا: یعنی تم میری محبت کو قبول نہیں کرو گی۔

میں نے کہا: نہیں۔

وہ چلا گیا اور قید تنہائی کا دروازہ بھی بند کر گیا اور باہر جا کر میرے سیل کے بلب کے بٹن کو آن آف کرنے لگا تا کہ وہ فیوز ہو جائے، مجھے اس کی نیت کا پتا چل گیا کہ وہ تاریکی کا فائدہ اٹھا کر اندر آنا چاہتا ہے۔ میرے پاس اس وقت کھانے کے خالی برتن رکھے تھے۔ میں نے میلامین پلاسٹک کی بھاری پلیٹ اٹھالی اور زور سے چیخی:

یہاں سے فوراً دفع ہو جاؤ۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ میرے سیل کا دروازہ کھول کر چپکے سے اندر داخل ہو رہا ہے۔ میں نے پوری قوت سے پلیٹ اس کے چہرے پر ماری اور چلائی:

اللہ العظیم کی قسم! اگر تم فوراً نہ نکلے تو میں سارے اہل کاروں کو جمع کر لوں گی۔

وہ خباثت سے بولا: کیوں؟ میں تو تمھارا بلب درست کرنے اندر آ رہا تھا۔

میں نے کہا: تمھیں کس نے کہا کہ میرا بلب فیوز ہو گیا ہے؟ اور احمق تم خود اس سے کھیل رہے تھے تا کہ وہ فیوز ہو جائے۔

میں نے بآوازِ بلند ''س'' کو پکارنا شروع کیا اور میں پلیٹ سے زور زور سے دروازہ بجاتی رہی؛ حتیٰ کہ وہ آ گیا اور اس کے ساتھ کئی اور اہل کار بھی جمع ہو گئے۔ وہ سب مجھ سے پوچھنے لگے کہ کیا ہوا ہے۔ میں نے کہا:

اس ذلیل نے پہلے خود ہی لائٹ خراب کر دی اور اب یہ اسے ٹھیک کرنے کے بہانے میرے سیل میں داخل ہو رہا تھا۔

سب نے اسے پکڑ لیا اور اسے گالیاں دینا شروع کر دیں، بلکہ ایک آگے بڑھ کر سامنے والے سیل میں گیا اور وہاں سے بلب اتار کر میرے سیل میں لگا دیا اور اس مسکین قیدی کو

اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کو چھوڑ دیا۔

## ناکام واسطہ

اسی روز وہ سب سیلوں سے کمبل اکٹھے کر کے لے گئے، کچھ دیر بعد وہ انھیں واپس لے آئے، ایک اہل کار میرے پاس آ کر بولا:

میں تمھیں باہر نکالتا ہوں اور تم اپنی پسند کے کمبل لے لو۔

جب میں کمبل لے کر واپس لوٹ رہی تھی تو وہ ہولے سے بولا:

میں تمھیں ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔ تم عنقریب رہا ہو جاؤ گی، کیونکہ اس جیل میں اسی کو لایا جاتا ہے جو رہائی پانے والا ہو، جہاں تک میری معلومات ہیں تم عنقریب رہائی پانے والی ہو۔

میں نے کہا: ان شاء اللہ۔

بولا: لیکن کسی کو بتانا نہیں کہ میں نے تمھیں کچھ کہا ہے، اگر ان لوگوں کو کچھ پتا چل گیا تو وہ میرا حال خراب کر دیں گے۔

میں نے کہا: اللہ تمھیں بہترین جزا دے۔

اگلے ہی روز ایک اور اہل کار آیا۔ وہ بڑی بڑی مونچھوں اور بھینگی آنکھوں والا ایک کوتاہ قامت شخص تھا۔ میں اسے اہل کاروں کے دمیان پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔ میں اسے دیکھتے ہی اپنی رفتار بڑھا دیتی تھی، مگر آج وہ بلا کسی دستک اور بلا اجازت طلب کیے میرے سیل میں آ گیا اور دیکھتے ہی بولا:

تم رو کیوں رہی ہو؟

میں اس اچانک افتاد پر چونک پڑی اور حیرت سے بولی: کیا؟ میں رو نہیں رہی اور تم کیوں بلا اجازت اندر گھس رہے ہو؟

بولا: میں یہاں سے گزر رہا تھا، تو میں نے سوچا کہ دیکھوں تم پریشان نہ ہو۔

میں نے کہا: نہیں، شکریہ اور پلیز جاتے ہوئے دروازہ بھی بند کر دینا کیونکہ میں کسی سے ملنا نہیں چاہتی۔

وہ ایک قدم اور قریب ہو گیا اور بولا: نہیں، اللہ کی قسم میں تمھارا ہمدرد ہوں، میرے بارے میں اطمینان رکھو۔ واقعی میرا دل تمھارے بارے میں سوچتا رہتا ہے۔

اس وقت میں سیل میں ایسے زاویے سے بیٹھی تھی کہ مجھ پر تاریکی غالب تھی، میں تیزی سے اٹھی، کہ دروازہ بند کر لوں، لیکن اس نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے پوری طاقت جمع کر کے اسے باہر کی جانب دھکیلا اور دروازہ زور سے بند کر لیا، میں نے چلا کر کہا: فوراً یہاں سے دفع ہو جاؤ ورنہ میں پورا جیل اکٹھا کر لوں گی۔

وہ چلا گیا، لیکن ابھی میں سانس بھی درست نہ کر پائی تھی کہ وہ پھر آ گیا اور بولا:

تم تیار ہو جاؤ اور اپنی چیزیں بھی سمیٹ لو۔ تمھارا آج یہاں آخری دن ہے۔ آج تمھیں یہاں سے رہائی مل جائے گی۔

میں نے اپنی چھوٹی موٹی چیزیں سمیٹیں اور باہر کا ارادہ کیا۔ میں چند قدم ہی چلی تھی کہ اس نے بازو بڑھا کر مجھے سمیٹنے کی کوشش کی۔ میں نے غصے اور رعب سے اسے پیچھے دھکیلا، اس نے میرے برا بھلا کہنے کی بھی پروا نہ کی اور نہایت ڈھٹائی سے بولا:

بخدا میرے ساتھ چائے کا ایک کپ ہی پی لو۔ چائے کی بڑی طلب ہو رہی ہے۔ اگر تم چاہو تو۔

جب ہم دروازے کے قریب پہنچے تو اس نے مجھے اندر دھکیلا، وہاں ایک اور اہل کار بیٹھا تھا جس کا نام جلال تھا، وہ بولا:

تحقیق عسکری میں تمھاری رہائی کی سفارش آئی تھی، ہم تو رہا کرنا چاہتے تھے مگر امن دولہ

والوں نے انکار کر دیا ہے۔ اس لیے ہم تمھیں واپس قطنا جیل بھجوار ہے ہیں۔

## مفاد پرستوں کی افواہیں

میں جیسے گئی تھی اسی صورت قطنا واپس آ گئی۔ یہاں پر میری ساتھی قیدیوں نے میرا بڑے والہانہ انداز میں استقبال کیا، انھوں نے کھڑکیاں بجا کر خوشی کے ترانے بھی گائے اور ان کی چیخوں سے پورا بلاک گونج اٹھا۔ اس وقت تک دروازے مقفل تھے وہ چڑیوں کی مانند چہچہاتی ہوئی آگے آ گئیں اور جھانک جھانک کر دیکھنے لگیں اور اس وقت تک خاموش نہ ہوئیں جب تک پولیس نے انھیں دھمکی نہ دے دی کہ اگر وہ خاموش نہ ہوئیں تو مجھے کسی اور جیل میں منتقل کر دیا جائے گا۔ اس پر وہ اپنی جگہوں پر بیٹھ کر شوق اور محبت سے میرے اندر آنے کا انتظار کرنے لگیں، میں جونہی اندر داخل ہوئی ہر جانب سے آوازیں سنائی دیں:

ادھر آ جاؤ، ہمارے پاس آؤ۔

اور ہر بلاک سے مطالبہ آنا شروع ہو گیا کہ پہلے ان کا دروازہ کھولا جائے، تاکہ وہ میرا پہلے استقبال کریں۔ آخر کار اسے سارے بلاک اکٹھے کھولنے پڑے اور ہمیں ایک رات اکٹھا گزارنے کی اجازت بھی مل گئی، تاکہ ہم جتنی باتیں کرنا چاہیں کر لیں، اس رات کو میں کبھی نہیں بھلا سکتی۔ میں کبھی نہیں بھول سکتی کہ ننھا معقل اور سمیہ کس طرح چھلانگیں لگاتے ہوئے میری جانب بڑھے اور میری گود میں بیٹھ کر مجھے پیار کیا اور ابھی ملاقات کی فرحت کم نہ ہونے پائی تھی جب مجھے پتا چلا کہ امیرہ زرکلی اور خاتون داروغہ ام جمیل نے جیل میں میرے بارے میں نہایت [illegible] سے افواہیں پھیلائی تھی کہ مجھے جیل میں اخوان سے رابطے کی بنا پر تحقیقات کے لیے لے جایا گیا ہے کیونکہ میں جیل میں ان کے رسائل اور پیسے تقسیم کرتی تھی۔ اسی سبب میری ساتھی میرے بارے میں حد درجہ پریشان رہیں تھیں، انھیں یقین نہیں تھا کہ میں کبھی لوٹ کر آؤں گی۔ لیکن میں اللہ کی مشیت سے پھر لوٹ آئی تھی۔

# نیلی گائے

میں قطنا لوٹ آئی تھی، جہاں کے آلام پہلے کی نسبت کم تھے، لیکن ختم نہیں ہوئے تھے۔ نئی بات یہ تھی کہ کچھ اور قیدیوں کو رہائی مل گئی تھی، جن میں ام معقل، ام ھیثم، ام باسط اور ان کی بیٹی عائدہ تھی۔ پھر کچھ ماہ بعد ام خالد اور ام زہیر کو بھی رہائی مل گئی اور ان کی رہائی کا طریقہ بھی وہی تھا۔ صبح ان کو رہائی کی خبر ملتی، انھیں سامان سمیٹنے کا موقع دیا جاتا، پھر انھیں فوجی تحقیقی مرکز لے جایا جاتا اور وہیں سے رہائی عمل میں آجاتی۔ معقل کی رہائی کا عمل تو واقعی بہت پر اثر تھا، وہ جیل کی ان ہی سلاخوں کے پیچھے پیدا ہوا تھا۔ وہیں اس کی پرورش ہوئی اور اب وہ تقریباً پانچ برس کا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ جب وہ جیل میں بیمار ہو گیا تو میرے بھائی غسان نے بڑے واسطوں سے اسے ڈاکٹر کو دکھانے کی اجازت مانگی۔ معقل پہلی بار جیل سے باہر گیا تھا۔ اس نے آزاد انسانوں کی دُنیا پہلی مرتبہ دیکھی تھی۔ وہ واپس آیا تو انسانی دُنیا کے مشاہدات بڑی حیرت سے بیان کرنے لگا:

ماما۔ ماما۔ میں نے ایک شخص کو چار ٹانگوں پر چلتے ہوئے دیکھا۔

جب میں نے اپنے بھائی سے استفسار کیا تو وہ ہنستے ہوئے بولا: اس نے گدھا دیکھا تھا بلکہ اس نے خود بھی اسی طرح چلنے کی کوشش کی۔ اس کو پتھر چبھ گیا تو خوب رویا اور جب جیلر نے اپنی موٹر سائیکل سٹارٹ کی تو وہ ڈر کر بھائی سے چمٹ گیا۔

اسی طرح جب وہ تین برس کا تھا، اسے ایک مرتبہ اس کے ددھیال میں بھجوایا گیا، تاکہ اسے بھی باہر کی دُنیا اور انسانوں سے تعارف ہو اور وہ اپنے بہن بھائیوں کو دیکھ لے، لیکن جتنا کچھ انھوں نے اسے دیکھانہ چاہتے انھوں نے اسے واپس کیسے کیا ہوگا۔ اس کی دادی نے بتایا، اسے پتھر ملتے تو وہ بھائیوں کے سروں کا نشانہ لے لے کر مارتا تھا۔ اسے احساس ہی نہ تھا کہ انھیں چوٹ لگ جائے گی۔ جب وہ واپس آیا تو ہم نے اسے پوچھا کہ اس نے کیا دیکھا، وہ

بڑی حیرت سے بولا: میں نے نیلی گائے دیکھی جو دودھ سے بھری ہوئی تھی۔

معقل ہمیں اداس چھوڑ کر چلا گیا اور چند ماہ بعد جب وہ اپنی ماں کے ساتھ ملاقات کو آیا، سب قیدی اس کے گرد جمع ہو گئیں۔ سب کی خواہش تھی کہ وہ پھر "طظ اسد" کا مشہور نعرہ لگائے، لیکن اس کی ماں نے اسے روک دیا۔ وہ چاہتی تھی کہ ہم دیکھیں کہ حریت کا اس پر کیا اثر پڑا ہے؟ اس نے بڑے پیار سے اسے کہا کہ وہ ہمیں بتائے کہ اس نے سکول میں کیا سیکھا ہے۔

معقل جس نے اس ظالمانہ نظام کے سبب زندگی کے پانچ برس ان آہنی فصیلوں کے پیچھے گزارے تھے، لہک لہک کر قائد حافظ اسد کے انقلابی پروگرام اور اس کی تمجید کے ترانے گانے لگا۔ اس کی والدہ نے بتایا کہ انھوں نے جیل میں ملاقات کے لیے جانے کا کہا تو معقل رونے لگا۔ جب اس سے سبب پوچھا تو وہ بولا:

ابو مصطفیٰ مجھے بلاک میں بند کر کے تالا لگا دے گا۔

معقل بڑے خوف اور ماں کے اطمینان دلانے کے بعد آیا تھا، اس کے باوجود وہ بلاک کے دروازے کے پاس ہی بیٹھ گیا کہ کہیں ابو مصطفیٰ اسے بند نہ کر دے کیونکہ وہ اب حریت کے معنی جان چکا تھا۔ وہ ہمیں بڑی حسرت اور افسوس سے دیکھ رہا تھا۔ اسے بند دروازے اور کھلی فضا کا فرق معلوم ہو چکا تھا۔

❖❖❖

# باب پنجم
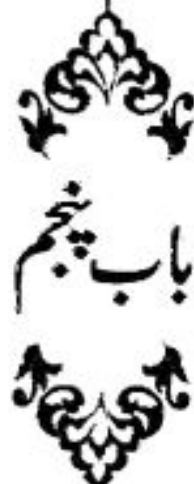
## سجن دوما: زمانے سے معرکہ

# نومبر ۱۹۸۵ء ـ اکتوبر ۱۹۸۹ء

ہمیں قطنا میں کچھ اور ہفتے گزر گئے، ہم پر اکتاہٹ چھا گئی تھی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ احساس پختہ ہو رہا تھا، کہ ہمیں زندگی کے آخری لمحوں تک یہیں رہنا ہے اور یہاں سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں۔ اسی دوران ہمیں دوسرے جیل میں منتقل کرنے کی خبریں آنے لگیں۔ بلکہ بعض ذمے داروں سے اشارے بھی ملنے لگے کہ ہم اپنے سامان ہلکے کر لیں، کیونکہ یہاں سے منتقل ہونا ہے۔ ہمارے کان رہائی کی خبر سننے کی آس میں تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہمیں انتقال بھی رہائی ہی کی مانند لگ رہا تھا اور ہم اسی چنگاری کی امید میں جینے لگے جو ہو سکتا ہے بھڑک کر رہائی کی نوید بن جائے، لیکن یہ چنگاری بھی بجھ گئی اور ہمارا سانس لینا بھی دوبھر ہو گیا۔ اس ٹھنڈی صبح مدیر سجن کچھ اہل کاروں سمیت آیا اور بلا کسی تمہید اندر آ کر کہنے لگا: احکامات آئے ہیں کہ اپنا سامان باندھ لو، کیونکہ کل صبح روانگی ہے۔

ہمارے ذہنوں میں ایک ہی سوال کلبلا رہا تھا: کہاں؟ ہمیں جواب ملا: سجن دوما مدنی میں۔ اگلا سوال تھا: کیوں؟ اور اس کا گھڑا گھڑایا جواب یہ تھا کہ اس جیل میں گنجائش سے زیادہ قیدی ہیں اور حکومت نے نئے جیل ''سجن عدرا'' کی تعمیر مکمل کر لی ہے۔ اس لیے دوما کے قیدی عدرا اور یہاں کے دوما منتقل کیے جائیں گے اور قطنا محض پولیس سٹیشن کے طور پر کام کرے گا۔

لیکن بعد میں خبریں پھیلیں کہ یہ انتقال میری وجہ سے ہوا تھا کیونکہ اتھارٹیز کو خدشہ تھا کہ میرا بھائی غسان مجھے طاقت سے رہا کروانے کی کوشش نہ کرے۔ یہ خبریں بھی غسان کی بیوی

اور اس کے سسرالیوں نے اڑائیں۔ جو خود خفیہ اداروں کے لیے کام کرتے تھے اور کئی افرادِ کنبہ حکومت کے جاسوس بنے ہوئے تھے بہر حال ہماری رخصتی کا وقت آ گیا۔ اگلی صبح ہمارے سامان اکٹھے کر کے گاڑی میں رکھے گئے۔ ہمیں دو دو کر کے ہتھکڑی لگائی گئی اور گاڑی میں سوار کر دیا گیا، مسلح پولیس مین بھی بیٹھ گئے اور ہماری نئی منزل کی جانب سفر شروع ہو گیا۔ ہم تیس قیدیوں کو دوما کے لیے سوار کیا گیا، دو گاڑیاں نگرانی اور مدد کے لیے ساتھ چل رہی تھیں۔ اس روز آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے، اس لیے دُنیا ہمیں تنگ و تاریک ہی نظر آ رہی تھی۔ جب ہم منزل پر پہنچے ہمارا تھکاوٹ، بھوک اور اضطراب سے برا حال تھا۔ انھوں نے بغیر کسی احتیاط کے ہمارا سامان جیل کے صحن میں اٹھا اٹھا کر پھینکنا شروع کر دیا۔ انھیں کسی چیز کے خراب ہو جانے یا ٹوٹنے کی بھی پروا نہیں تھی۔ اسی دوران خاصا سامان چوری بھی ہو گیا جن میں چولھے بھی تھے جنھیں ہم نے بڑی مشکل سے خریدا تھا۔ ہم نے پولیس سے گمشدہ سامان مانگا تو وہ جواب نگل گیا۔ بعض نے مدد کا وعدہ بھی کیا مگر عملاً کچھ نہ ملا۔ ہمیں سیاسی قیدیوں کے لیے مخصوص بلاکوں میں رکھا گیا اور بجائے اس کے کہ ہم خود اپنی جگہ کی تقسیم کرتے اسے ہمارے آنے سے قبل تقسیم کر دیا گیا، یہ جانے بغیر کہ کون کس کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔

## نئی رہائش

جن دوما تعمیر میں قدیم عربی گھروں سے مشابہ تھا۔ اس کی دیواریں پتھر کی تھیں، پانی کا پمپ صحن کے درمیان میں تھا، جس کے گرد کھیتوں کو سیراب کرنے والی نالیاں تھیں۔ کمروں کی بناوٹ بھی عربی طرزِ تعمیر کی مظہر تھی۔ اسی طرح باورچی خانہ، بیت الخلا اور کامن روم وغیرہ تھے۔ اس کے ساتھ تین کمرے تھے جو قیدِ تنہائی کے سیلوں کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ ایک جانب چھ بلاک تھے: پہلا دائیں جانب جو جنسی جرائم کی مجرموں کے لیے تھا، دوسرا بائیں جانب سے پہلا: حشیش کے مجرموں کے لیے، اس سے اگلا قتل اور پھر چوری کے مجرموں کے لیے۔

اسی طرح دوسرے بلاک بھی تھے۔ عمارت کے سامنے کی جانب سیاسی قیدیوں کے بلاک تھے۔ ہمارا بلاک کافی لمبا اور تنگ تھا، ان میں کچھ اونچے بنچ نما بنے ہوئے تھے، جن پر دری ڈال کر بیٹھنے کی جگہ بنائی ہوئی تھی۔ ان کے اوپر کچھ الماریاں تھیں جن میں قیدیوں کی اشیاء ضرورت رکھنے کی جگہ تھی۔

## ہر دور کے مخبر

دوما میں ہمیں ہر گھڑی کسی اچانک آنے والی خبر کا انتظار رہتا۔ قطنا کے آخری ایام میں ہم پر جو الزام لگا تھا وہ اخوان سے تعاون کا تھا۔ جب ہم دوما پہنچے تو ہمیں واقعی ایک ایسا شخص ملا لیکن ہمارا کبھی اس سے تعلق نہ قائم ہوا، بلکہ اس کی جگہ ایک دوسرا شخص ملا، جو جیل کا مدیر تھا۔ یہ عائلہ سبع سے تھا اور درزی تھا۔ اس نے واقعی ہماری زندگی میں زہر گھول دیا۔

پہلے ہی ہفتے میں اس نے ہم پر کئی پابندیاں عائد کر دیں اور ہمیں ان حقوق سے محروم کر دیا جو ہم نے بڑی جدوجہد کے بعد حاصل کیے تھے۔ اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ ایک روز جب ہم ہواخوری کے لیے بلاک سے باہر تھے، افسر السبع آیا، تو وہ بولا کہ ہمارے پاس جتنے بھی ہیٹنگ آلات ہیں لے کر باہر آ جائیں، کیونکہ ان کا جیل میں رکھنا ممنوع ہے۔ ہم نے سب کچھ اس کے حوالے تو کر دیا مگر احتجاجاً بلاکوں میں واپس جانے سے انکار کر دیا۔ ہمیں پھر بھی کوئی چیز نہ لوٹائی گئی۔ اسی طرح چند روز بعد پولیس نے آ کر دوبارہ بلاکوں کی تلاشی لی اور سٹیل اور شیشے کے تمام برتن واپس لے لیے اور جاتے ہوئے باہر سے دروازے مقفل بھی کر دیے تاکہ ہم کوئی احتجاج نہ کر سکیں۔ اب ہمارے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہ تھا کہ ہم جیلر کو تحریری طور پر ساری صورتِ حال لکھیں۔ افسر السبع آیا اور ہمیں ہماری چیزیں لوٹا دیں۔ لیکن اس نے اپنا وطیرہ نہ بدلا، وہ ہمیں تکلیف پہنچانے کا کوئی حیلہ نہ چھوڑتا اور ہر دور کی مخبرہ اور جاسوسہ امیرہ زرکلی اس کی بہترین آلہ کار تھی۔ وہ ہماری چھوٹی چھوٹی باتیں جا کر بتاتی۔ اسی دوران ہمارے لیے انتہائی

ظالمانہ قانون وضع کیا گیا کہ ہمارا کوئی ملاقاتی ''سول کورٹ'' کے خصوصی اجازت نامے کے بغیر ہم سے ملاقات نہیں کر سکتا اور اکثر قیدیوں کو اس فیصلے کا علم بھی نہ تھا، بلکہ یہ خفیہ احکامات کی قبیل میں سے تھا۔ کچھ دیر کے لیے تو ہم حیران و ششدرہ گئے، مگر پھر ہم نے اپنے حقوق کے حصول کے لیے جدوجہد کا راستہ اپنانے کا فیصلہ کر لیا۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ جب تک یہ قانون واپس نہیں لیا جاتا ہم بھوک ہڑتال کریں گے۔ ہڑتالی قیدیوں کی تعداد تقریباً بیس تھی، جنھیں ایک ہی نام دیا گیا اور وہ تھا ''اخوان المسلمون'' اور حقیقت بھی یہی تھی کہ سوشلسٹ قیدیوں کی ملاقات پر کوئی بندش نہ تھی اور یہ قانون امتیازی طور پر ہمارے خلاف برتا جا رہا تھا اور ملاقات کے وقت بھی ہمیں کھڑکی سے اتنا دور بٹھایا جاتا کہ ہمیں باہر کی کوئی خبر نہ مل پاتی۔ یہ ہڑتال بھی اکیس یا بائیس دن تک جاری رہی اور ہڑتال سے کتنی ہی قیدی موت کے دروازے پر دستک دینے لگیں۔ ہم ان کو اٹھا کر حمام کے پاس لے کر جاتے اور ان پر پانی ڈالتے تو انھیں کچھ ہوش آتا، ان میں سے کچھ تو حرکت کرنے یا آنکھیں کھولنے کے قابل بھی نہ رہیں۔ ہم بھی ان کی تیمارداری کرتے کرتے ہلکان ہو گئے۔ ہم چھپ چھپا کر تھوڑا بہت کھا لیتے، کیونکہ اگر ہم بھی مکمل ہڑتال رکھتے تو ان کا خیال کون رکھتا۔ کچھ ہڑتالیوں کا فشارِ خون بلند ہو گیا اور کچھ کے اعصاب مضمحل رہنے لگے۔ جب ان کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی تو جیل کے ڈاکٹر کو بلایا گیا جو سپاہیوں کے لیے مخصوص تھا۔ فوج سے اہل کار خود ان کی حالت دیکھنے آئے۔ ہم انھیں کمبلوں میں اٹھا کر ان کے سامنے لے کر گئے۔ ہمیں خود ایسے لگ رہا تھا جیسے ہم نے میتیں اٹھا رکھی ہوں۔

## زہر اور خون

افسر السبع ایک ماہ تک ہمیں ستاتا رہا، پھر اچانک اس کے تبادلے کے احکامات آ گئے، لیکن ابھی ہماری خوشی ماند نہ پڑی تھی کہ ہمارا نئے افسر کے مظالم سے سامنا ہو گیا۔ اس کا نام عماد تھا اور وہ سلمیہ کے اسماعیلی خاندان سے تھا۔ وہ کسی طور بھی کمینگی میں پہلے افسر سے کم نہ تھا۔

وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا، کبھی زہر کی مانند زرد اور کبھی خون کی طرح سرخ۔ وہ ہر ممکن طریقے سے تنگ کرتا، وہ مجرم خواتین کے ذریعے بھی ہمیں زک پہنچاتا۔ ایک صبح آتے ہی اس نے نئے حربے آزمانے شروع کر دیے اور ایک قیدی کے منہ پر تھپڑ مارا، جواباً قیدی نے بھی اسے تھپڑ جڑ دیا۔ یہ سب شاید اس کے لیے بالکل اچانک تھا۔ وہ ششدر رہ گیا، لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اسے سزا اور ٹارچر کی دھمکیاں دیں، جواباً ہم سب کھڑے ہو گئے اور ہم نے اسے کہہ دیا کہ اسے سزا دینے کا کوئی حق نہیں۔ لیکن وہ جاتے ہوئے سب کی ملاقات بند کرنے کا فیصلہ سنا گیا۔ لیکن جب معاملات اس کے ہاتھ سے نکل گئے اور کچھ ہڑتالی قیدی بالفعل موت کے منہ میں پہنچنے لگیں تو اس نے وعدہ کیا کہ وہ خفیہ والوں سے ملاقات کی بھی کی اجازت مانگے گا۔ ہڑتال کے ختم ہونے کے بعد اس نے کچھ پابندیاں نرم کیں، لیکن اور انداز میں تنگ کرنا شروع کر دیا۔ وہ ملاقات کے روز قیدیوں کے گھر والوں کو دو تین بجے تک طویل انتظار کرواتا، پھر جب وہ تھک ہار جاتے تو مختصر سی ملاقات کروا دیتا۔ ام ماجدہ نے ہمیں بعد میں بتایا کہ وہ کتنی مرتبہ سفر کر کے ملاقات کو آئیں اور جیل کے دروازے پر کتنی ایڑیاں رگڑیں اور اس کی منت سماجت کی کہ اگر مجھے نہیں ملنے دیتے تو یہ چیزیں ہی میری بیٹی کو بھجوا دو، مگر وہ انکار کر دیتا اور جب انھوں نے اپنی بیٹی کے اطمینان کے لیے ورق پر چند لائنیں لکھ کر دیں کہ اسے ہی اندر بھجوا دو، تو اس نے ان کے ہاتھ سے صفحہ لیا اور ان کی آنکھوں کے سامنے پرزے پرزے کر کے نیچے پھینکا اور بڑی بے رحمی سے پاؤں تلے مسل دیا۔

## سیاست سے اقتصاد کی جانب

دوما میں ہمارے بعد سب سے پہلے ایک فلسطینی طالبہ کو جیل میں لایا گیا۔ وہ تمیں کی دہائی میں تھی اور اس کا نام جمیلہ بطش تھا۔ وہ شام میں تعلیم حاصل کرنے آئی تھی۔ اس پر الزام تھا کہ اس نے سوشلسٹ گروپ کے ساتھ مل کر حلب میں ایک سیاحتی ہوٹل اور دمشق میں ایک سفارت

خانے اور کئی دوسری عمارتوں میں بم دھماکہ کرنے میں حصّہ لیا۔ اسے ۱۹۷۹ء میں گرفتار کیا گیا اور محکمہ امن دولہ نے اسے عمر قید کی سزا سنائی۔ اس نے تقریباً سات سال سجن مسلمیہ حلب میں گزارے اور سن ۸۶ء کی ابتدا میں دوما آئی۔ اسے ہمارے بھی دو سال بعد رہائی ملی۔ وہ ہمارے ساتھ دو سال سے زائد عرصہ رہی مگر وہ نہ ہم سے کوئی بات کرتی نہ کمیونسٹ قیدیوں سے، بس وہ تنہا رہتی تھی۔

جمیلہ کے آنے کے چند ہفتے بعد فرانسیسی ادب کی طالبہ ہلال کو دمشق سے لایا گیا۔ اس پر الزام تھا کہ اس نے ملکی معیشت کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے والد دمشق کی ایک بڑے صراف تھے، جب یہاں صرافوں پر برا وقت آیا تو بھاگ کر شام سے باہر چلے گئے۔ کچھ عرصے کے بعد انھوں نے اردن سے ساڑھے سات ملین لیرہ اپنی بیٹی کو بھجوایا کہ یہ رقم فلاں صراف کو دمشق میں دے دو۔ جب وہ مقررہ گھر پر پہنچی تو وہاں اخوان کے خلاف کریک ڈاؤن ہو رہا تھا کہ انھوں نے اپنے منشورات پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اسے بھی ان کی ساتھی سمجھ کر پکڑ لیا۔ جب انھوں نے گاڑی میں اتنی بڑی رقم دیکھی تو وہ منشورات اور اخوان کو بھول گئے اور اسے نقدی اور گاڑی سمیت پکڑ لیا اور اسے یہ دونوں چیزیں رہائی کے بھی تین برس گزر جانے کے بعد ملیں۔

## بزدلوں کے ہاتھ یرغمال

کچھ عرصہ گزرنے کے بعد جیل میں ایک نئی مہمان کو لایا گیا۔ یہ نقیب ابراہیم یوسف کی اہلیہ عزیزہ جلود تھی۔ عزیزہ کو پہلے حادثہ مدفعیہ کے بعد گرفتار کیا گیا۔ اسے بہت اذیت پہنچائی گئی، پھر اسے اس خیال سے رہا کر دیا گیا کہ اس کے ذریعے سے اس کے شوہر تک پہنچا جائے، جب شوہر تک نہ پہنچ سکے تو اسے ہی دوبارہ پکڑ لیا۔ ان دنوں وہ حاملہ تھی، اہل کار اسے مجبور کرتے رہے کہ وہ انھیں اپنے شوہر کا پتا بتائے کیونکہ یہ اس سے ملتی رہی ہے۔ عمر حمیدہ نہایت گھٹیا انداز

میں اس کے پیٹ پر مارتا اور جنین کو مخاطب کر کے کہتا:

گر جاؤ۔ گر جاؤ اور گواہی دو!

یہ اللہ کی شان تھی کہ اس نے بچے کو سلامت رکھا۔ انھوں نے اسے مار پیٹ کے بعد رہا کر دیا۔ رہائی کے بعد اس کے ہاں اسماعیل پیدا ہوا۔ ابھی اسماعیل ایک یا دو ماہ کا تھا کہ اسے پھر پکڑ لیا اور وہ تجن مسلمیہ میں اس کے ساتھ قیدِ تنہائی میں چار برس تک رہا۔

جیل کے ظلم وستم کے علاوہ عزیزہ کو ایک مرتبہ انتہائی مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑا، بلکہ اسے دوسرے قیدیوں کے جرم کی سزا بھی ملنے کو تھی۔ ہوا یہ کہ جیل میں کچھ قیدیوں نے ان پر ہونے والی بعض زیادتیوں، تعذیب اور ناروا رویے کے خلاف ردِعمل شروع کر دیا۔ انھوں نے بستوں کو آگ لگا دی اور علی اعلان حکام کے مطالبے ماننے سے انکار کر دیا، بلکہ ایک مرحلے پر یہ گمان بھی ہوا کہ ان قیدیوں کو باہر سے مسلح امداد فراہم کی گئی ہے، حکام جب شورش کچلنے میں ناکام ہو گئے تو وہ عزیزہ کو ان کے سیلوں کے سامنے لے گئے اور انھیں دھمکی دی کہ انھوں نے مزید کوئی اقدام کیا تو وہ اس کی سزا عزیزہ کو دیں گے، بلکہ اسے نوجوانوں کے سامنے لا کر کہا:

اگر تم نے اپنے آپ کو ہمارے حوالے نہ کیا تو ہم اسے قتل کر ڈالیں گے۔ پس وہ بے چاری دو دن تک ان بزدلوں کے ہاتھ میں یرغمالی بنی رہی اور آخرکار جب انھوں نے ان نوجوانوں پر قابو پا لیا تو ان سب کو ایک ایک کر کے اس کے سامنے گولی مار کر قتل کر دیا۔ گویا انھوں نے اس باب ہی کو بند کر دیا۔

اسے دمشق منتقل کیا گیا تو اس کے گھر والے اسماعیل کو لے گئے تا کہ وہ اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ اپنے باپ کے گھر میں رہے اور اس کے ددھیال والے بھی سب جیل ہی میں تھے۔ عزیزہ تجن تحقیق عسکری میں آٹھ ماہ تک رہی، پھر اسے دوما منتقل کر دیا گیا اور اسے بھی ہمارے ساتھ ہی رہائی ملی۔ حالانکہ اس کا نام معافی پانے والی فہرست میں موجود تھا۔ اس کے باوجود

اسے دو برس تک سجن مسلمیہ میں اضافی طور پر قیدِ تنہائی میں رکھا گیا۔ اسے جیل میں کسی سے ملنے بھی نہ دیا جاتا۔ اس پر اتنا ظلم کیا گیا کہ وہ بے چاری اعصابی مریضہ بن گئی۔ کافی عرصے بعد صرف اس کے بیٹوں کو ملنے کی اجازت ملی اور باقی گھر والوں پر پابندی قائم رہی۔ عزیزہ اپنی اولاد کے بارے میں بہت فکر مند رہتی، خاص طور پر رہائی سے قبل عمید حسن خلیل نے جس قدر نفرت اور غصے سے اس سے کہا تھا:

تمھارے شوہر نے جن لوگوں کو قتل کیا ان کا انتقام بھلایا نہیں جا سکتا اور نہ ہی مقتولین کے گھر والوں کے دل کی آگ ٹھنڈی ہوئی ہے۔ وہ تمھیں پکڑنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

پھر وہ مزید گویا ہوا: تمھیں اپنے بچوں کے ساتھ تو بالکل نہیں رہنا چاہیے۔ انھیں خود سے دور رکھو، تا کہ وہ تم سے یہ نفرت اور جرم نہ سیکھ جائیں۔

وہ ہمیشہ علویوں سے خائف رہتی، اسے سمجھ نہیں آتی تھی کہ اپنے بچوں کو ان سے کس طرح دور رکھے۔ اللہ نے اس کی اولاد کو محفوظ رکھا، بلکہ ایک عید پر اسماعیل اپنے دادا کے ساتھ عزیزہ کو عید ملنے آیا۔ وہ اس وقت سات آٹھ برس کا ہو چکا تھا اور ماشاء اللہ بہت ذہین تھا۔ جب وہ اندر آیا اور ہم نے اسے کچھ کھانے کو دیا اور میں نے پرس سے پیسے نکال کر اسے عیدی دینا چاہی، وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا:

ہمارے پاس تو باہر بہت پیسے ہوتے ہیں، آپ کے پاس تو یہاں کچھ نہیں ہوتا۔

اس نے قسم کھا کر کہا کہ وہ مجھ سے ہرگز عیدی نہ لے گا۔

## کمیونسٹ قیدیوں کے ساتھ

ہمارے بلاک میں نئی قیدیوں کا اضافہ ہوتا رہا، حتیٰ کہ ان کی تعداد ۲۴ تک پہنچ گئی اور ایک روز اکٹھی چودہ نئی کمیونسٹ قیدی آ گئیں۔ قید خانے کے مدیر نے کہا کہ ہم انھیں بھی اپنے ساتھ

ہی ٹھہرا لیں اور ہر اخوانی قیدی اپنے بستر میں ایک کمیونسٹ قیدی کو رکھے گی۔

یہ سب قیدی حکومت کے خلاف مسلح کاروائی کرتی ہوئی ایک ہی چھاپے میں گرفتار ہوئی تھیں۔ انھیں پہلے تحقیق عسکری لے جایا گیا اور وہاں لڑکے اور لڑکیوں کی ایک ساتھ پٹائی کی گئی اور انھیں شدید تعذیب کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ ان میں سے بعض کو اسی کرسی پر بٹھا کر تعذیب دی گئی جس سے ان کو اندرونی چوٹیں آئیں اور بعض کا نصف جسم مفلوج ہو کر رہ گیا اور کچھ کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ ہم ہر قیدی کو خوش آمدید کہتے اور اس کی سیاسی وابستگی کو نظر انداز کر کے اس سے حسنِ سلوک کرتے، لیکن ان کمیونسٹ قیدیوں نے جن کی تعداد تقریباً تیس تک پہنچ گئی تھی، ہمارے سابقہ رویے کو ناممکن بنا دیا؛ کیونکہ ان کی اکثریت کا رویہ عدم تعاون اور عدم احترام کا تھا، وہ دشمنی کا کھل کر اظہار کرتیں۔ وہ عادات اور مزاج میں بھی ہم سے یکسر مختلف تھیں، نہ وہ صفائی کا خیال رکھتیں نہ پاکیزگی کا۔ ہم نماز کے لیے اٹھتے تو وہ ٹانگیں پسارے اسی طرح سوئی رہتیں، ہم اپنی جانب کا بستر لپیٹ کر نماز کی جگہ بناتے۔ ایسی ناپاک لڑکیوں کے ساتھ ایک بستر میں سونا بہت مشکل کام تھا۔ میں نے اپنا بستر ماجدہ کے ساتھ والی قیدی کو دیا اور خود اس کے پاس آ گئی، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ہمارا ان کا ساتھ رہنا بہت مشکل ہو گیا۔ وہ اتنی گندی تھیں کہ ان کے جسم اور کپڑوں سے بدبو کے بھبھوکے اٹھتے، آخر کار ہم نے عافیت اسی میں جانی کہ بلاک کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ ان کو دے دیں۔ لیکن ہر شام ایک ہنگامہ کھڑا ہوتا جب وہ ہمارے بستر بدل کرلے جا رہی ہوتیں۔ میں اور ماجدہ تماشا دیکھتے رہتے اور جب سب لیٹ جاتیں تو ہم بچی کھچی جگہ پر لیٹ جاتے اور کئی مرتبہ ان امور کو سلجھانے کے لیے پولیس آ جاتی۔

## خلیہ

کمیونسٹ قیدیوں نے ایک نیا ڈھنگ اپنا لیا۔ انھوں نے بلاک میں اپنا اجتماع منعقد کرنا شروع کر دیا جسے وہ "خلیہ" کا نام دیتیں، تاکہ وہ ہمیں اپنی تاریخ سنائیں اور ہم سے مارکس اور لینن

کے بارے میں بحثیں کریں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ مجھے ٹائیفائڈ تھا اور اسی روز ان کا خلیہ تھا۔ میں تکلیف سے مسلسل کراہ رہی تھی اور مجھے کسی پل چین نہ آ رہا تھا۔ انھیں میرا کراہنا اپنے اجتماع میں دخل اندازی محسوس ہوا۔ ان میں سے ایک میڈیکل ڈاکٹر تھی۔ عبداللہ نے تجویز دی کہ وہ مجھے نیند آور انجکشن لگا دیتی ہے۔ میری اپنی ساتھیوں نے ڈسپنسری سے انجیکشن لا کر دیا، اس نے میری رگ میں پورا انجکشن اس تیزی سے لگایا، کہ کچھ لمحات کے لیے میں بالکل ساکت و جامد ہو گئی اور میری زبان بھی بولنے کے قابل نہ رہی۔ اس کے بعد مجھے کسی چیز کا ہوش نہ رہا۔ ہماری ساری لڑکیوں نے شور مچا دیا، وہ اسے برا بھلا کہنے لگیں اور الحاجہ مدیحہ نے غصے سے کہا:

تم یہ کیوں نہیں کہتیں کہ تم نے اپنے ملعون اجتماع کے لیے اسے قتل کرنے کی کوشش کی ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ہمارے اور ان کے درمیان کشیدگی بڑھتی چلی گئی اور ان کی زبانیں بھی ہمارے بارے میں بہت دراز ہو گئیں۔ وہ بڑی بے حیائی سے ہمیں کہتیں:

سن لو اخوانیو۔ اگر ہمیں حکومت ملی تو ہم دمشق کے وسیع میدان میں تم سب کو پھانسی پر لٹکائیں گے۔

## روزانہ حج

ایسی زندگی جس کا نہ کوئی مقصد ہو نہ امید ... ہم ایسی اکتاہٹ اور بوریت سے گزر رہے تھے کسی ٹکٹکی پر لٹکنے سے کم نہیں۔ روز بروز قیدیوں میں اضافے اور جیل حکام کی جانب سے ناروا پابندیوں نے ہمیں زچ کر کے رکھ دیا۔ ہم محسوس کرنے لگے کہ ہمیں قوت صبر کو بڑھانے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ سارا دن لڑائی جھگڑے اور گالیاں سن سن کر طبیعت بوجھل ہو جاتی تھی۔ کبھی جیل میں پانی کی کمی واقع ہو جاتی اور ہمیں غسل کرنے کے لیے پورے مہینے کا انتظار کرنا پڑتا، دوماہ میں ملاقات بھی ایک مشکل امر تھا، کبھی ملاقات پر پابندی لگ جاتی، کبھی گھر والوں کو تاخیری حربوں سے نمٹا دیا جاتا تھا۔ اگر گھر والے کھانے کی کوئی چیز لے آتے تو وہ تفتیش کے نام

پر اس میں ہاتھ ڈال کر اسے برباد کر دیتے کہ اس کے کھانے پر طبیعت ہی مائل نہ ہوتی۔

ہماری پریشانی اتنی بڑھی کہ ہم نے سوچا کہ ہم ہر روز مناسک حج ادا کیا کریں۔ صحن کے پانی کے پمپ کو ہم کعبہ تصور کرتے اور ایک اور جگہ سعی کے لیے مخصوص کر رکھی تھی۔ ہم سب بلا استثنا ہر روز صبح اٹھ کر طواف اور سعی کرتے اور تلبیہ کہتے۔ ایک مرتبہ ایک پولیس اہل کار اندر آیا اور اس نے ہم سب کو مشغول پایا، اس نے حیران ہو کر پوچھا:

یہ سب بھاگ کیوں رہی ہیں؟

ہم سب چلنے اور تلبیہ میں مصروف تھیں، ہماری ایک ساتھی نے کہا: ہم حج کر رہی ہیں۔

اس نے لاحول پڑھا اور بولا: اللہ کی قسم رہا ہونے پر تم سب کا ٹھکانا مستشفی ابن سینا للمجانین (ذہنی معذوروں کا ہسپتال) ہوگا۔

## ریمی

دوما کی یادوں کا تذکرہ ہو تو میں ''ریمی'' کو نہیں بھلا سکتی۔ ریمی بڑا پیارا بلا تھا، ایک مجرمہ کے گھر والے اس کے لیے لائے تھے اور ہم نے اس سے خرید لیا اور اس کی پرورش کی۔ بس وہ اس متوحش جگہ پر ہمارے لیے رحمت اور سکون کا باعث تھا۔ وہ ہم سب سے مانوس تھا اور ہم اس سے مزے سے کھیلتے۔ ریمی تھا بھی بڑا صاف ستھرا اور ذہین بلا۔ ہمیں اگر دوسرے بلاک سے کوئی چیز چاہیے ہوتی تو ہم ورقہ اس کی گردن میں لٹکا کر بھیج دیتے۔ وہ چلا جاتا اور جو مانگا ہوتا وہ لے کر آ جاتا بلکہ ملاقات کے دنوں میں بھی یہ ملاقاتیوں اور ہمارے درمیان رابطے کا کام دیتا تھا۔ وہ کبھی ایک کا پیغام منہ میں دبائے جا رہا ہوتا اور کبھی دوسری کا۔ اگر تہجد کے وقت ہماری آنکھ نہ کھلتی تو وہ ہمیں بیدار کر دیتا۔ وہ ہمارے قدموں میں کسی امین چوکیدار کی طرح سوتا۔ ایک مرتبہ دمشق پولیس کا افسر ہمارے جیل کی انسپکشن کے لیے آیا۔ اس نے ریمی کو دیکھا تو اس کا پارہ چڑھ گیا کہ جیل میں جانور رکھنے کی اجازت نہیں ہے، اس نے ایک اہل کار کو کہا کہ اسے

تھیلے میں ڈال کر دمشق سے باہر پھینک آؤ۔ ماتحت ملازم نے فوری طور پر حکم کی تعمیل کی اور ہمیں غم زدہ چھوڑ کر اسے لے کر چلا گیا۔ ہمیں ایسا لگ رہا تھا جیسے ہمارا کوئی بھائی یا قریبی عزیز ہم سے جدا ہو گیا ہو۔ تیسرے دن ظہر کے بعد دیکھا تو وہ چپکے سے بلاک میں داخل ہو رہا تھا۔ اگرچہ وہ کافی گندا ہو چکا تھا۔ اسے دیکھ کر ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی، بلکہ لڑکیوں نے تو اس طرح چھلانگیں لگائیں جیسے ان کے ماں باپ میں سے کوئی آ گیا ہو۔ ہماری رہائی کے بعد ایک ساتھی خاص طور پر دوما آئی اور اسے اپنے ساتھ حلب لے گئی۔

# باب ششم
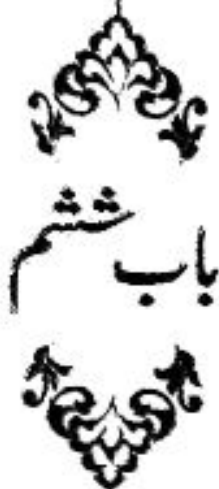
# کشادگی ــ اور رہائی

# دسمبر ۱۹۸۹

ہماری زندگی کے چار برس مزید اس حال میں گزر گئے جس کے نہ کوئی معنی تھے نہ زندگی پر اثر۔ دوما میں سردی ایک بار پھر ڈیرے ڈال چکی تھی۔ اب تو ہمیں موسموں اور برسوں کے گزرنے کا بھی پتا نہ چلتا تھا۔ ہم اس ہلکی آگ پر سلگنے والی زندگی کو خاموشی سے گزار رہے تھے، بالکل ٹھہرے ہوئے پانی کی مانند اور اس پانی کی خاموش سطح پر پہلا پتھر اس وقت پڑا جب اکتوبر ۸۹ء کی ایک ٹھنڈی شام عزیزہ جلود اور غزوہ کو کوچ کے لیے سامان باندھ لینے کی پکار سنائی دی۔ لیکن کیوں، کہاں اور کس کے حکم پر؟ ہمیں کسی نے جواب نہ دیا۔ ہم نے یہی سمجھا کہ نئے سرے سے تحقیقات ہونے لگی ہیں یا سول کورٹ نے کچھ احکامات دیے ہوں گے اور وہ پھر لوٹ کر ہمارے ہی پاس آجائیں گی۔ لیکن کئی ہفتے بیت گئے اوان کے بارے میں کوئی خبر نہ ملی۔ ایک مرتبہ پھر ندا دینے والے نے ام حسان اور ان کی دو بیٹیوں سلویٰ اور یسریٰ کے نام پکارے۔ خفیہ والوں کی گاڑی انھیں بھی لے کر چلی گئی اور پھر ان کی کوئی خبر ہمیں نہ مل سکی۔

## خواب اور خوش خبری

میں کتنے برسوں سے امی کو ایک ہی خواب میں دیکھتی، وہ زچگی کی تکلیف میں مبتلا ہیں لیکن ولادت عمل میں نہیں آرہی، لیکن اس رات میں نے دیکھا کہ ان کے ہاں ولادت ہوگئی ہے۔ میں نے خواب الحاجہ کو سنایا تو انھوں نے مجھے رہائی کی خوش خبری سنائی اور ابھی ان کی بات بھی

پوری نہ ہوئی تھی کہ مدیر جیل خود بلاک میں آیا اور ہم میں سے ۱۲ قیدیوں کے نام پڑھنے لگا: میں اور ماجدہ، ام یاسر، لمیا، رغداء، منتھی، نجوی اور دونوں حاجنیں اور سب کے نام پڑھ کر بولا: رہائی

لیکن ہمارے ساتھ رہائی کا مذاق اتنی بار رچایا جا چکا تھا کہ کسی کو بھی اپنے کانوں پر یقین نہ آیا اور ہم سب بلا حرکت وہیں بیٹھے رہے اور مجھے یاد ہے کہ میں اور ماجدہ پمپ کے پاس بیٹھی قرآن کی تلاوت کر رہی تھیں جب وہ دوبارہ آیا اور چلا کر بولا:

اٹھو۔ چلو۔

لیکن ہم میں سے کوئی بھی نہ ہلا اور ہم نے کہہ دیا:

بس ہم سے جھوٹ مت بولو۔ ہمیں مزید جھوٹ کی حاجت نہیں۔

وہ قسمیں کھا کر یقین دلانے لگا کہ آج وہ سچ کہہ رہا ہے۔ اس نے ہمیں ناموں کی فہرست دکھائی جو سرکاری طور پر چھپ کر آئی تھی، لیکن ہم اب بھی یقین کرنے کو تیار نہ تھے۔ وہ زور دے کر بولا: میں خفیہ والوں کو گاڑی اندر لے آتا ہوں جو تم لوگوں کو لانے کے لیے آئی ہے تا کہ تم یقین کر لو۔

جب ہم نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، تو ہمیں خبر کی صداقت کا یقین آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی نعرۂ تکبیر کی آوازیں بلند ہوئیں، آنکھیں کسی جھرنے کی طرح بہنے لگیں اور ہونٹوں پر خوشی کے ترانے آ گئے۔ سب نے ایک دوسرے کو گلے لگایا اور گال چوم لیے۔ ہم سب ایک ساتھ اٹھے اور سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ میں نے اور ماجدہ نے ایک بڑے تھیلے میں سامان اکٹھا کیا اور بلا ارادہ ہی کندھے پر اٹھا لیا، اس میں سے کئی چیزیں گر گئیں مگر ہمیں ان کی پروا نہیں تھی۔ ہم ابھی تک یقین اور بے یقینی کی درمیانی کیفیت میں تھے۔ جیل میں جس نے بھی یہ خبر سنی وہ کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ مجرم قیدی خواتین بھی ہمیں مبارک دینے باہر نکل آئیں، وہ پکار کر کہہ رہی تھیں ... بھی قیدی رہا ہو گئیں۔

کئی سپاہی اور جیل کے نیک اہل کار بھی ہم سے خبر کی صحت کا یقین کرنے آگئے۔ وہ بھی خوشی سے عورتوں کی مانند آنسو بہا رہے تھے۔ یہ فرط و انبساط کی ایسی گھڑی تھی جسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا لگتا تھا مجھے کسی چیز کی پروا نہیں رہی۔ میں بتا نہیں سکتی کہ میں گاڑی تک کیسے پہنچی۔ بلکہ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ وہ گاڑی کیسی تھی یا سفر کیسا تھا۔ لیکن میں یہ نہیں بھول سکتی کہ ہم اپنے بلے ریمی سے کس طرح جدا ہوئے۔ بخدا وہ رو رہا تھا اور اس کے آنسو کسی انسان کی طرح بہہ رہے تھے۔ ہمیں جس گاڑی میں سوار کروایا گیا وہ ہمیں لے کر ذیلی شاخ تحقیق عسکری کے دروازے پر آ گئی۔ ہم ابھی تک اپنے خواب کے سحر میں کھوئے ہوئے تھے!

## ہم یہاں ہیں

فرع کے دروازے سے کمرۂ معلومات تک اہل کاروں نے ہماری رہنمائی کی۔ ہمیں ہتھکڑیاں لگائی گئی تھیں۔ ہماری امانتیں بھی وصول کر لی گئیں اور ہماری آمد کا اندراج بھی کر لیا گیا۔ پھر ہمیں تنگ و تاریک راستوں سے گزار کر کوٹھڑی میں داخل کر دیا، اس مرتبہ شمالی حصے کے ایک بلاک میں ہم سب کو اکٹھا رکھا گیا۔ جب ہم گزر رہے تھے ہم نے راستے میں اپنے سے پہلے آنے والیوں کی آوازیں سنیں۔ وہ دروازے پر ہاتھ مار کر کہہ رہی تھیں: ہم یہاں ہیں۔ ہم انھیں کوئی جواب نہ دے سکے کیونکہ اہل کار ہمیں خاموش رکھنے کے لیے چلا رہے تھے۔ ہم نے ترحیب، شوق اور تبریک کی کئی آوازیں سنیں۔ آخر کار ہم نے اپنے آپ کو ایک نئے بلاک میں پایا، جس میں ۱۴ قیدیوں کی موجودگی میں سانس بھی نہ آ رہا تھا۔ ہم نے دروازہ کھٹکھٹایا، اہل کار آیا تو ہم نے جگہ کی تنگی کا ذکر کیا، بولا:

یہ بلاک جسے تم تنگ کہہ رہی ہو اس سے پہلے اس میں ۲۹ نوجوان رہتے تھے۔

اس بلاک میں چھت پر مسجد کا نشان بنا ہوا تھا، جو کہ اخوان قیدی عادتاً بناتے تھے۔ اس کے نیچے لکھنے والے کا نام تھا۔ ہم حیران ہو رہے تھے کہ وہ اتنا اوپر کیسے چڑھا ہوگا، کیونکہ چھت

کافی اونچی تھی۔ الحاجہ بولی: ظاہر ہے ایک دوسرے پر چڑھ کر وہ اوپر پہنچا ہوگا۔ اور مسجد کا نشان بنا دیا۔ مجھے یہ سن کر ہی جھرجھری آگئی۔

## فقط مزاح

پہلی رات گزر گئی، پھر دوسری، تیسری۔ ہم اب تک بلاک میں منتظر بیٹھے تھے، ہماری نگاہیں دروازے پر لگی تھیں اور ہر کھٹکے پر چونک جاتیں۔ آہستہ آہستہ یہ رہائی ایک سراب نظر آنے لگی۔ ہماری خوشی دب گئی تھی اور امیدیں دم توڑنے لگی تھیں۔ جیل کے احکامات دیکھتے ہوئے ایسا لگتا تھا کہ ہم پھر خفیہ والوں کے چنگل میں پھنس گئے ہیں، ہمیں عجیب سے خوف اور رعب نے گھیر لیا۔

تحقیق عسکری میں ہمارے دن ایسے ہی تھے جیسے نئی سزا کا دور ہو۔ وہ ہم سے نہایت قساوت کا برتاؤ کرتے اور ہمیں اسی طرح تنگ کرنا شروع کر دیا جس طرح کفر السوسہ کے دن لوٹ آئے ہوں۔ کھانا اتنا کم ہوتا کہ آدھی تعداد کو بھی پورا نہ ہوتا، سیلوں کے دروازے تمام دن بند رہتے اور ہمیں ہوا خوری کے لیے بھی بروقت باہر نہ نکالا جاتا اور اہل کاروں کے مزاج کے مطابق کبھی دس منٹ اور کبھی چوتھائی گھنٹہ پورے دن میں باہر جانے کی اجازت ملتی۔ صحن بھی بلند و بالا دیواروں والا تھا، جس میں ہوا کا مشکل ہی سے گزر ہوتا۔ یہ سب تکلیفیں مل کر بھی اس تکلیف سے کم تھیں جو قیدیوں کی چیخوں اور ان پر تعذیب کے دوران سنائی دیتیں۔ جب نوجوانوں کو ہوا خوری کے لیے باہر نکالا جاتا تو وہ بھی بڑا الم ناک وقت ہوتا۔ تعذیب کے باعث وہ سیدھے کھڑے بھی نہ ہو سکتے، ٹارچر سے ان کے پاؤں اس قدر سوج چکے ہوتے کہ اس سردی میں بھی وہ جوتا نہ پہن سکتے اور ننگے پاؤں چل رہے ہوتے۔ ان کو ہانکنے کے لیے مسلسل کوڑا برستا رہتا، جیسے وہ جانور ہوں۔ ان کے رنگ اتنے زرد ہو چکے تھے کہ ان کے جسموں سے روشنی نکلتی محسوس ہوتی تھی۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ ایک نوجوان نے بیت الخلا میں ذرا دیر لگا دی۔

اہل کار نے اسے وہیں مارنا شروع کر دیا اور اس سے مطالبہ کیا کہ وہ گندگی اپنے منہ میں ڈالے، وہ اسے مسلسل زنجیروں سے مار بھی رہا تھا اور انتہائی گندے مطالبات بھی کر رہا تھا۔ وہ اس کا منہ زمین پر بھی رگڑ رہا تھا، بیچارہ قیدی مدد کے لیے فریاد کر رہا تھا مگر اسے بچانے والا کوئی نہ تھا، آخر الحاجہ نے چیخ کر کہا:

کیا تم یہودی ہو؟ کیا تمھارے دل میں کوئی رحم کا جذبہ نہیں؟

اور ہم سب نے بآوازِ بلند کہنا شروع کیا:

اگر تمھارے پاس رحم نام کی کوئی چیز نہیں تو خدا کے لیے ہم پر رحم کھاؤ اور اسے کسی اور جگہ لے جاؤ، یہ تعذیب اور گندگی ہم سے برداشت نہیں ہو رہی۔ وہ احمق تمسخرانہ ہنسی ہنستے ہوئے بولا:

کچھ نہیں.....بس ایسے ہی ہم کبھی کسی سے مذاق کر لیتے ہیں۔

اسی طرح جب کھانا تقسیم ہوتا تو ایک قیدی کھانا اٹھائے ہوئے ہوتا، وہ کھانا ہمارے بلاک کے طاق میں رکھ دیتا تھا۔ پھر اہل کار آتا اور اس طاق کو کھول دیتا اور ہم کھانا اٹھا لیتے۔ ایک روز عزیزہ نے کہا کہ اس سے پوچھنا، اگر اسے معلوم ہو کہ میرے شوہر کے خاندان کے افراد کو کہاں رکھا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے اسے معلوم ہو اور وہ اسی جیل میں ہوں۔ اس روز میری باری تھی، میں نے قیدی سے پوچھا:

کیا تمھیں یوسف کے گھر والوں کا پتا ہے؟

وہ بولا: ہاں۔ وہ انھیں بلاک جنوبی میں لے کر آئے تھے۔ ابھی اس نے جملہ بھی پورا نہ کیا تھا کہ اہل کار اس کے پاس پہنچ گیا، اس نے اسے پکڑ کر مارنا شروع کر دیا۔ وہ بے چارہ مسلسل چلا رہا تھا:

میرا کوئی قصور نہیں۔ اسی نے مجھ سے پوچھا تھا۔ میں نے تو ابھی جواب بھی نہیں دیا۔

الحاجہ کھڑی ہو کر چیخیں:

واقعی اس کا کیا قصور ہے۔ اس نے اس سے کھانے ہی کے بارے میں پوچھا تھا۔
لیکن اس کی تسلی نہ ہوئی۔ وہ اسے اس وقت تک مارتا رہا جب تک اس کا دل نہ بھر گیا۔

## صدر صاحب کو خبر نہ تھی

کچھ اور دن بیت گئے۔ ارد گرد کے حالات سے لگتا تھا کہ راستہ کھلنے والا ہے اور آزادی کا جام ملنے والا ہے۔ وہ ہمیں کوٹھڑی سے مختلف دفاتر میں لے جاتے اور ہمیں آفیشل پیپرز دیتے تاکہ ہم اس میں مکمل معلومات درج کریں، بلکہ اپنی زندگی کی پوری تاریخ رقم کر دیں اور وہ اس کی مختلف کاپیاں کر کے مختلف سمتوں میں روانہ کر دیتے۔ ہر وقت ہمارے ہاتھ میں کاغذ قلم رہتا۔ تقریباً پندرہ روز بعد ہمیں سرکاری طور پر معافی نامہ موصول ہو گیا۔ الحاجہ مدیحہ نے اسے پا کر متعلقہ دفتر کے سربراہ سے پوچھا:

سر۔ آپ کو اتنے برس گزرنے کے بعد ہماری یاد کیسے آ گئی۔ اس کی مناسبت کیا ہے؟

وہ بولا: اللہ کی قسم صدر صاحب (حافظ اسد) کو آپ کی خبر ہی نہ تھی۔

وہ بولی:

یعنی اب انھیں ہمارے بارے میں پتا چل گیا ہے؟

بولا: ہاں۔

وہ حیرت سے بولی: تجھے اللہ کا واسطہ۔ ہمیں اس حال میں نو برس گزر گئے اور اسے خبر ہی نہ تھی۔

کہنے لگا: ہاں اللہ کی قسم۔ بخدا اگر انھیں پہلے پتا چل جاتا تو اسی وقت آپ کو رہا کر دیتے، لیکن انھیں جوں ہی پتا چلا انھوں نے فوراً کہا کہ انھیں رہا کرو!

الحاجہ معصومیت سے بولی: پھر آپ اب کیوں دیر لگا رہے ہیں، ہمیں چھوڑ کیوں نہیں دیتے!

تو اس نے بتایا کہ شام میں ملکی سطح پر اپنے حلیف لبنان کے صدر کے قتل پر سوگ منایا جا رہا ہے۔ اسی وجہ سے ملک میں سرکاری طور پر چھٹیاں ہیں اور واقعی ہمیں دو یا تین ہفتے مزید انتظار کرنا پڑا۔ اس دوران انھوں نے ہمیں دو مرتبہ ایک کمیٹی کے سامنے پیش کیا، جس کی سربراہی ڈائریکٹر حسن خلیل کر رہا تھا اور اس کے ساتھ کمال یوسف اور دوسرے فوجی بھی تھے۔ جب میری باری آئی، مجھ سے کمال یوسف ملا۔ میری آنکھوں پر بھی دوسروں کی مانند پٹی بندھی تھی وہ بولا:

یہ نہ سمجھ لینا کہ ہم نے تمھیں چھوڑ دیا ہے اور اب جو چاہے کرتی پھرو۔ میں نے تمھارے خاندان کو بھی خفیہ والوں سے گھیر دیا ہے۔

میں نے کہا: چاہے میں نے واقعی کچھ نہ کیا ہو۔

وہ مجھے برا بھلا کہنے لگا اور مغلظات بکنے لگا۔ اس نے کہا کہ میں مجرمہ ہوں خواہ میں کتنا ہی انکار کروں۔ اس نے مجھے تاکید کی کہ اگر کوئی بھی ایسا شخص جو حکومت کو مطلوب ہے مجھ سے ملے، یا مجھے نظر بھی آئے تو میں اسے اطلاع دوں۔ اسی طرح انھوں نے عزیزہ جلود سے سفاکانہ برتاؤ کیا اور اس کی اولاد کے بارے وہ کچھ کہا جس کا پہلے ذکر کر چکی ہوں۔ اس کمیٹی میں پیشی کا مطلب یہی تھا کہ ہم جان لیں کہ ہم اصلاً تو رہائی کے حق دار نہیں تھے، یہ حکومت کا کرم ہے اور ہم ابھی تک مجرموں کے دائرے سے باہر نہیں نکلے۔ بلکہ یہ تو صدر صاحب کا خصوصی کرم اور ان کا عفو ہے کہ ہم باہر آ رہے ہیں۔

## تاخیر یا بناوٹ

اصحاب فضل کے رویے میں حاتم جیسے کرم کے جو مظاہرے نظر آئے، وہ کچھ یوں تھے کہ ہمارے محترم جلادوں نے جب دیکھا کہ ہم رہا ہونے والے ہیں تو ان کی آنکھیں ہی بدل گئیں۔ سلویٰ کی بیٹی سمیہ جیل ہی کی فضاؤں میں پیدا ہوئی تھی اور اس کی پرورش حمص اور قطنا اور دوما

کے جیلوں کے درمیان چکر لگاتے ہوئے ہوئی تھی اور عسکری جیل میں اس کی عمر سکول جانے کی ہوگئی تھی، جیل کی دیواروں نے اس پر وہ ستم ڈھائے تھے کہ وہ ابھی تک کمزوری کے باعث سال دو سال سے زیادہ کی نہ لگتی تھی ۔ بلکہ اسے پہلی مرتبہ دیکھنے والا تو اس کے جسم کی کمزوری اور چہرے کی پیلاہٹ دیکھ کر کانپ جاتا۔ جیل کی انتظامیہ اس کے بارے میں مجرمانہ غفلت پر کافی پریشان نظر آئی، انھیں خوف تھا کہ یہ بچی شام کی آزاد فضاؤں پر اپنے خلاف ہونے والی زیادتیوں کے ان مٹ نقوش لے کر نہ جائے۔ اب آتے جاتے جیل کے حکام اس کا حال احوال پوچھنے لگے، بلکہ ایسا لگتا تھا کہ ہماری رہائی میں تاخیری حربے کا ایک سبب سمیہ بھی تھی۔ وہ اس کی حالت بہتر بنانا چاہتے تھے۔ وہ ہر روز سمیہ کو اس کی ماں کے ساتھ بیرونی باغ میں لے جاتے، تاکہ وہ اس کے ساتھ کھیلے اور اسے بھی باہر کی دُنیا کی کچھ چیزوں کا پتا چل جائے، اس کے لیے خصوصی طور پر زائد خوراک بھیجی جاتی، اسے چاکلیٹس کھلائی جاتیں، جیل انتظامیہ اس کے لیے مختلف طرح کے کھلونے لاتی، گویا کہ وہ اس کی بچپن کی محرومیوں کا تدارک کرنا چاہتے ہیں۔ ایک روز جیلر آیا اور اس نے اپنی گاڑی وہیں پارک کی جہاں سمیہ کھیل رہی تھی۔ ڈرائیور نے اتر کر اس کا دروازہ کھولا اور اس کا بریف کیس اٹھا کر اس کے دفتر تک اس کے پیچھے گیا۔ اس نے سمیہ کو دیکھا تو اس کے پاس آ گیا، اسے آواز دے کر بلایا اور اس سے کھیلنے لگا، اس سے باتیں کرتے ہوئے اسے اپنے دفتر لے گیا، جب وہ واپس آئی تو اپنی ماں سے کہنے لگی:

ماما۔ میں بھی بڑی ہو کر جیلر بنوں گی!

سلویٰ نے حیرت سے پوچھا: وہ کیوں؟

وہ توتلی آواز میں بولی: تاکہ میرے پاس بھی گاڑی ہو، ڈرائیور ہو، جو میری گاڑی چلائے اور میرا بیگ اٹھا کر میرے پیچھے پیچھے چلے اور العقید کمال جیسے کمرے میں لے آئے۔

ماں نے پوچھا: عقید کمال کا کمرہ کیسا ہے؟

سمیہ نے پوری آنکھیں کھول کر بتایا: یعنی اس کے پورے فرش پر قالین ہے اور فانوس ہے اور بہت مزے کی چیزیں ہیں، جو ہمارے پاس نہیں۔

اور سمیہ نے جب دیکھا کہ قیدیوں نے جیل کی دیواروں پر اپنے نام لکھے ہیں تو اس نے بھی یادگار کے طور پر ایک دیوار پر لکھا۔ اس معصوم سی ذہین بچی نے جو کچھ لکھا وہ پڑھنے والوں کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ اس نے لکھا: میں تدمر میں پیدا ہوئی۔ میں فلاں جیل میں رہی۔ پھر فلاں میں اور پھر فلاں میں۔ اس نے ہر جیل میں اپنی رہائش کو تاریخ اور مدت کی وضاحت کے ساتھ لکھا اور آخر میں لکھا...... میں فلاں تاریخ کو اپنی والدہ کے ساتھ یہاں آئی۔

## شرابی افسر

جیلر کمال یوسف اپنی درشتی اور سخت مزاجی کے سبب مشہور تھا، لیکن جب رات کی تاریکی چھا جاتی اور وہ پینے پلانے میں مصروف ہو جاتا تو اس کی نا سمجھی بچوں سے بھی بڑھ جاتی۔ وہ کئی مرتبہ غزوہ کو بلا کر اپنے دفتر میں بٹھا لیتا اور اس سے باتیں کرتا رہتا حالانکہ وہ پوری طرح ہوش میں بھی نہ ہوتا۔ یا نیچے اتر کر بلاک کے طاق کے پاس آ کر کھڑا ہو جاتا اور اس سے باتیں کرنے لگتا۔ وہ بے چاری اکثر اوقات خاموش رہتی اور اسے کوئی جواب نہ دیتی۔

ایک مرتبہ ہم رات کو سوئے ہوئے تھے اور ایک سے زائد وقت ہو چکا تھا، ہمیں محسوس ہوا کہ طاق کا دروازہ کھلا ہے اور اس سے ایک سر نے اندر جھانکا ہے۔ جیل کا قانون یہ تھا کہ آنے والا طاق پر دستک دے گا اور اپنا تعارف کروائے گا، کسی کو بھی یوں اندر جھانکنے کی اجازت نہ تھی، لیکن اس نامعلوم آنے والے نے بلا کسی اجازت دروازہ کھول دیا۔ اس کے بعد طاق میں سے خون کی مانند دو سرخ آنکھیں دکھائی دیں، ہم سب یکبارگی چلائے:

اللہ تمھیں عافیت نہ دے۔

ہم میں سے کچھ نے اس کی طرف دیکھ کر تھوک دیا، اور کچھ نے غصے سے کہا:

طاق بند کرو اور دفع ہو جاؤ۔ تمھیں اس کی اجازت کس نے دی ۔ او بدتمیز انسان۔ او بدذوق۔

وہ اس افتاد سے گھبرا گیا اور غیر ارادی طور پر پیچھے ہٹ گیا، پھر شاید اسے یاد آ گیا کہ وہ تو جیلر ہے، اس نے پھر سر آگے بڑھایا اور بولا:

یہ کون بدتمیز ہے جو یوں چلا رہی ہے۔

اس کی آواز نشے سے بھاری ہو رہی تھی اور اس کے الفاظ ٹوٹ رہے تھے، اس لیے ہم میں سے کوئی بھی اسے پہچان نہ سکی۔ ہم میں سے ایک اٹھی اور پوری طاقت سے طاق کا دروازہ بند کر دیا۔ ہمارا غصہ ہنوز باقی تھا، اسی لیے الحاجہ مدیحہ نے ایک اہل کار کو شکایت لگائی:

جناب۔ ہم جیلر کے نام درخواست لکھنا چاہتے ہیں۔

وہ بولا: کس بارے میں؟

وہ بولیں: یہاں ایک بہت بدتمیز اہل کار ہے، اس نے گزشتہ رات ہمارا طاق کھولا اور اس سے اندر جھانکا۔

اس نے پوچھا: کتنے بجے؟

جب انھوں نے بتایا تو وہ بولا: چھوڑو۔ اب میں آپ سے کیا کہوں۔ جو کچھ ہوا ہے اس بارے میں کسی سے کچھ مت کہنا، کیونکہ وہ خود جیلر تھا۔

الحاجہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی: اللہ اسے ہلاک کرے۔

جب ہم ہوا خوری کے لیے باہر نکلے تو پتا چلا کہ وہ یہاں سے دوسرے بلاک میں چلا گیا اور بے چاری غزوہ سے باتیں کرنے لگا اور اس کے رعب سے اسے سمجھ نہ آتی تھی کہ اس سے کیسے بھاگے۔

## مدو جزر

دن گزرتے رہے، گویا ہم سراب کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔حتیٰ کہ دسمبر کے آخری دن آگئے۔ایک روز اہل کار آئے اور ہم سب کے نام پکار کر کہا، فوراً تیار ہو جاؤ۔ہم بجلی کی سی تیزی سے تیار ہو گئے۔ایک مرتبہ پھر ہمارے چہروں پر خوشی جھلکنے لگی، لیکن پورا دن گزرنے کے بعد بھی کوئی نہ آیا۔ہم نے تنگ آکر خود ہی دروازہ کھٹکھٹایا اور پوچھا:

کیا ہوا ہے؟

وہ بلا کوئی سبب بتائے بولے: کل تک تاخیر ہو گئی ہے۔

اگلی صبح وہ آئے اور ام حسان، ان کی دونوں بیٹیوں سلوئی اور یسریٰ اور نواسی سمیہ کا نام پکارا اور انھیں بھی ایک اور بلاک میں لے گئے۔انھیں انھوں نے رہائی کے بارے میں کچھ نہ بتایا۔ ہمیں گمان ہوا کہ اب وہ ہمیں بھی کسی اور بلاک میں بھجوا دیں گے۔جب ہم نے ان سے ان سب کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا کہ وہ رہا ہو گئی ہیں۔ہمارا دل تنگ ہو گیا اور ہم نے سوچا کہ کیا صدر نے صرف ان کے لیے احکام عفو دیے تھے کہ وہ تو چلی گئیں اور ہماری ٹرین چھوٹ گئی۔ہماری آس ٹوٹ گئی اور ہماری زبانوں پر گلے شکوے آگئے۔عزیزہ رو رو کر کہہ رہی تھی:

میرا دل کہتا ہے کہ میں تو آپ سب کے ساتھ بھی رہا نہ ہوں گی۔آپ دیکھ لینا۔

اور واقعی وہ مسکینہ ہمارے ساتھ بھی نہ نکل سکی بلکہ اسے مزید دو برس قید بے گناہی میں اسی ظلم اور عذاب کو سہنا پڑا۔دو روز بعد انھوں نے دوسرے بلاک سے صرف غزوہ کو پکارا اور رہا کر دیا اور آخر میں جب ہم اپنے خدشات سے لڑ رہے تھے اور ہمارے دل کے سمندر میں مدو جزر برپا تھا، وہ ۲۴ دسمبر کی صبح آئے اور کہا کہ اب واقعی رہائی کی گھڑی آگئی ہے۔ہم یقین و بے یقینی کی کیفیت میں تھے جب انھوں نے ہمیں باہر نکالا، ہماری امانتیں ہمارے سپرد کیں اور ہمیں واپس بلاک بھجوا دیا کہ شام تک یہیں انتظار کریں۔

شام کو وہ آئے اور کہنے لگے روانگی رات کو ہوگی۔ پھر وہ ہمیں دوبارہ امانات کے کمرے میں لے گئے اور ہمیں لائن میں کھڑا کر دیا۔ ہم اکتا دینے والے انتظار میں تھے، ہمارے اعصاب چٹخنے لگے، میرے ساتھ کھڑی لڑکی نے جھک کر مجھے کہا:

بخدا ایسا لگ رہا ہے جیسے ہم بینک میں رقم کے انتظار میں کھڑے ہیں۔

ایک اہل کار نے سن لیا اور افسر عمر سے کہنے لگا:

سر۔ سن رہے ہیں یہ کیا کہہ رہی ہے؟

وہ بولا: کیا کہہ رہی ہے؟

بولا: سر یہ اب تک تائب نہیں ہوئی ہیں اور اب تک سیاسی گفتگو کر رہی ہیں۔

اس نے اس کی بات کو اپنے انداز میں توڑ مروڑ کر بیان کر دیا۔ افسر کو ایسے لگا جیسے اسے کسی سانپ نے ڈس لیا ہو، وہ جھاگ اڑاتا اور گالیاں بکتا آ گیا:

اللہ کی قسم تمھیں رہائی نہیں ملنی چاہیے۔ تمھیں موت تک ان ہی قبروں میں رہنا چاہیے۔

آخر کار جب اس کی ڈکشنری میں موجود ساری گالیاں ختم ہو گئیں، تو ہماری چیزیں ہمارے سپرد کی گئیں اور ہمیں بتایا گیا کہ باہر موسم کی خرابی اور دھند کی بنا پر سفر کل صبح ہی ہو سکے گا۔ ہمیں اسی بلاک میں لایا گیا جہاں پہلے سے لڑکیاں موجود تھیں اور اب اس میں لیٹنے کی گنجائش نہ تھی۔ ہم نے اسی طرح ایک دوسرے سے ٹیک لگائے آنکھوں میں رات گزار دی۔ ہمارے گلے شکووں کی پٹاری پھر سے کھل گئی۔ ہمیں یاد آ گیا کہ کس طرح کفر السوسہ میں نوجوانوں کے ایک گروہ سے معافی کا وعدہ کیا گیا اور پھر انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ہم ساری رات اسی حالت میں رہے، کبھی مایوسی ہمیں ڈھانک لیتی اور کبھی ہم اسی سے امید کی کرنیں تلاش کرنے لگتے۔ ہم سب باری باری بتاتے کہ باہر نکل کر کیا کریں گے، لیکن میں اس معاملے میں بالکل خاموش تھی۔ میں خود بھی یہ سوچنے سے عاجز تھی کہ میں باہر نکل کر کیا کروں گی۔ بلکہ میں تو

یہ بھی سوچنے سے قاصر تھی کہ میں یہاں سے نکل کر کہاں جاؤں گی ...یا باہر کون میرا منتظر ہوگا۔ ...کون ہوگا اور کون نہیں ہوگا؟ باقی سب ساتھی اپنے منصوبے بیان کر رہی تھیں۔ کسی نے کہا: میں اپنی تعلیم مکمل کروں گی یا میں اپنی ملازمت پر چلی جاؤں گی۔ بعض نے قسم کھا کر کہا کہ وہ کبھی بھی حکومت کا وظیفہ قبول نہیں کریں گی اور اپنے گھر والوں اور اقارب کے بیچ زندگی گزار دیں گی۔ میں اسی طرح گنگ بیٹھی رہی۔ میں اپنے آپ کو اس جانب سوچنے پر مائل ہی نہ کر سکی۔ بس ایسی ہی باتیں تھیں جو فجر تک ہوتی رہیں۔

## حتیٰ کہ صبح طلوع ہوگئی

یہ ۲۵ دسمبر بروز بدھ کی صبح تھی۔ میں اس رات کو بھی بھلا نہیں سکتی جس میں ہمارے مقابل بلاک کے نوجوانوں نے ساری رات تلاوتِ قرآن اور تسابیح اور اذکار میں گزاری تھی کیونکہ انھیں معلوم ہوا تھا کہ انھیں بھی رہائی ملنے والی ہے۔ وہ ہمارے لیے کشادگی اور سہولت کے لیے دعا گو تھے، انھوں نے ہمیں اشارے سے بتایا کہ وہ ہمارے لیے دعا گو رہیں گے اور اپنے سے بھی بڑھ کر ہمارے لیے دعا کریں گے۔ وہ اس طرح بے خودی سے تلاوت اور دعا میں مصروف تھے، گویا رات کی تاریکی میں آسمان سے نور اتر کر ہمارے راستے میں روشنی کرے گا۔ اللہ نے انھیں چوکیداروں سے بھی محفوظ رکھا اور وہ طلوعِ فجر تک اسی طرح عبادت میں مصروف رہے۔

قبل فجر ہم تھکاوٹ، نیند اور بھوک سے بے حال ہو چکی تھیں۔ لیکن رہائی کی پکار کی آہٹ ان سب پر غالب تھی۔ ہم بار بار دروازہ بجا کر داروغہ سے اپنے پروگرام کے بارے میں پوچھتے کہ آزادی کا دروازہ ہم پر کب کھلے گا۔ آخر کار اہل کار کا صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہوگیا اور وہ قدرے چڑ کر بولا: اب کوئی دروازہ نہ کھٹکھٹائے، جب کوئی اطلاع ہوگی میں خود دروازہ کھول کر سب کو اکٹھا باہر نکالوں گا۔ جب دروازہ کھلا تو ہم سب کسی بے تاب موج کی مانند باہر لپکے۔ ہم اس طرح ایک دوسرے پر گرے ہوئے باہر نکلے جیسے کوئی ہمیں دوبارہ اندر نہ دھکیل دے۔ ہم

کوٹھڑی سے باہر راستے میں انتظار کر رہے تھے۔ ایک ایک کر کے ہم سب کے نام پکارے گئے اور ہم نے دیکھا کہ وہ ہماری آنکھوں کے سامنے الحاجہ مدیحہ اور ریاض اور نجویٰ اور سلسبیلہ کو بلا کچھ بتائے دوسرے بلاک میں لے گئے، وہاں جا کر انھیں بتایا گیا کہ ان کی رہائی کا وقت ابھی نہیں آیا، ان کی حالت ایسی تھی جیسے ابھی ان کی روح فنا ہو جائے گی اور الحاجہ ریاض کے اعصاب پر شدید دباؤ پڑا، کیونکہ وہ سمجھ رہی تھیں کہ انھیں سب سے پہلے رہائی ملے گی۔ ہم چودہ لوگ رہائی پانے والی لائن میں رہ گئے۔ سات کا تعلق حلب سے تھا اور سات کا حمات سے۔

انھوں نے ہمیں باہر نکالا تو سورج طلوع ہو رہا تھا اور آسمان سے اس کی کرنیں پوری کائنات کو ضیاء بار کر رہی تھیں۔ یہ اشراق کا وقت تھا۔ ہم نے سورج کی روشنی میں ایک دوسرے کو دیکھا تو ہمارے چہرے اس طرح زرد نظر آ رہے تھے گویا کسی قبر سے مردے نکلے ہوں۔ ہم سب سورج کو دیکھنے لگیں اور اپنا ایمان تازہ کرنے کے لیے کلمہ شہادت پڑھنا شروع کر دیا۔ بعض پھوٹ پھوٹ کر رو دیں، ڈیوٹی افسر حیرت سے ہمیں دیکھ رہا تھا، بولا:

کیا ہوا ہے؟ تم سب یہاں رک کیوں گئی ہو؟

اُم زبیر بولیں: نو برس بعد پہلی مرتبہ ہم نے سورج طلوع ہوتے دیکھا ہے۔ تم کیا چاہتے ہو کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے!

فوراً ہی ہمارے لیے ہتھ کڑیاں اور زنجیریں آ گئیں، ہم سب حیران رہ گئے؟ اب یہ پابندیاں کیوں، اب تو ہم رہا ہو گئے ہیں؟

بولا: یہی قانون ہے۔ آپ کو زنجیر یا دمشق کا علاقہ پار کرنا ہے۔

ہماری خوشی ماند پڑ گئی اور ایک بار پھر ہمیں خوف نے گھیر لیا۔ ایسا لگا کہ وہ ہمیں کسی دوسری جیل میں منتقل کرنے لگے ہیں، لیکن سب کچھ اتنی تیزی سے ہو رہا تھا کہ سوچنے کا موقع بھی نہ تھا۔ ایک مرتبہ پھر ہمارے نام پکارے گئے۔ ہماری تعداد اور ہمیں شخصی طور پر پہچانا گیا اور پھر

ہمیں اسی طرح زنجیروں میں بند "میکرو" پر سوار کروایا گیا۔ ہمارے ساتھ مخابرات کے تین اہل کار بھی سوار ہوئے۔ دو آگے بیٹھ گئے اور تیسرا پچھلے دروازے کے پاس۔ جب گاڑی چلی تو ماجدہ نے اہل کار سے پوچھا، کیا ہمیں واقعی ہمارے گھر لے جایا جارہا ہے، یا یہ مجرد ایک جیل سے دوسری جیل تک کا سفر ہے۔ اس نے اسے یقین دلایا کہ یہ واقعی رہائی ہے۔ اخراج حقیقی۔

اس نے پھر پوچھا:

کیا نوجوانوں کی بھی رہائی کی کوئی امید ہے؟

وہ بولا: بخدا میں نہیں جانتا۔

لیکن وہ اس سے پوچھتی رہیں، حتیٰ کہ اس نے کہا: ہاں۔ امید تو ہے، لیکن شاید ابھی کچھ وقت لگے۔ انھوں نے پہلے آپ کو رہا کیا ہے تاکہ آپ کے غم سے تو نجات ملے۔

## سالِ نو مبارک

بس منزل کی جانب رواں دواں تھی، ہمارا دل چاہتا تھا کہ وہ بادلوں سے بھی تیز چلے اور ہمیں فوراً ہمارے گھروں میں پہنچادے اور ہم سب یہ بھی سوچ رہے تھے:

ہم آج کا دن کیسے گزاریں گے اور کل اپنے گھر والوں سے نو برس بعد دوہری عید (مراد سالِ نو اور رہائی) کیسے ملیں گے۔ انھیں اپنی آسانیوں اور عسرتوں کے کیا قصے سنائیں گے؟ ہم کہاں جائیں گے؟ ہم سے ملنے کون کون آئے گا؟ ہمارے پیاروں میں سے کون کون مر چکا ہوگا، یا قتل ہو چکا ہوگا۔ حمات کیسا ہوگا، جسے برباد کر دیا گیا تھا اور وہ زندہ ہستیاں کیسی ہوں گی جو زمین کی خاک بن گئیں اور ان کے پیچھے بچ جانے والے احباب۔ میرے سر میں سوالات کے جھکڑ چلنے لگے، حتیٰ کہ ہم حمات پہنچ گئے، انھوں نے ہماری زنجیریں کھول دیں اور حمات کی باسیوں سے کہنے لگے کہ وہ اترنے کی تیاری کر لیں، گاڑی آگے حلب جائے گی۔ ہم ایک

دوسرے سے ملے اور جیل کی کوتاہیوں پر ایک دوسرے سے معافی مانگی اور ایک دوسرے سے پھر ملنے اور رابطہ رکھنے کے وعدے کیے۔ بس ذیلی شاخ امن عسکری کے سامنے رک گئی، ڈرائیور نے دروازہ کھولا اور ڈیوٹی افسر نیچے اترا، اس نے ذمہ داران سے کچھ بات کی اور پھر ہمیں اترنے کا حکم دیا۔ باقی اہل کار ہمیں مبارک دے کر بس میں سوار ہو گئے، جاتے ہوئے وہ خوشگوار لہجے میں بولے:

الحمدللہ تم سے اور تمھیں عذاب دینے سے جان چھوٹی۔ سدا خوش اور سلامت رہو۔

گاڑی حلب کی جانب چل پڑی اور کچھ دوسرے اہل کاروں نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ابھی ہم بیٹھے بھی نہ تھے کہ سال نو کی مبارک بادیں اور ترانے ہمارے کانوں میں رس گھولنے لگے۔ سب ایک دوسرے کو مبارک دے رہے تھے۔ انھوں نے ہمیں یاد کروایا کہ نئے سال کی ابتدا ہم اپنے گھروں سے کریں گے۔ لیکن ہمیں نہیں معلوم تھا کہ ہمیں مزید کچھ وقت انتظار کرنا ہوگا، تاکہ ڈائریکٹر سالِ نو کی رسومات سے فارغ ہو کر ادھر آئے۔ ہم کمرۂ انتظار میں ٹھنڈک میں ایک دوسری سے چمٹی بیٹھی تھیں، بہر حال ہمیں انتظار کرنا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک اہل کار آیا اور سب کے ٹیلیفون نمبر مانگے۔ ہمارے گھر والے تو رہائی کی خبر سن کر دوما پہنچے تھے۔ تب انھیں بتایا گیا تھا کہ انھیں بجن "عدرا" منتقل کر دیا گیا ہے! اور وہاں بھی انھیں ہمارے بارے میں کوئی خبر نہ ملی تھی۔ اس کے بعد سے انھیں ہمارے بارے میں کچھ خبر نہ تھی۔ جب انھیں فون کیے گئے تو وہ یقین و بے یقینی کی کیفیت میں بھاگتے ہوئے ذیلی شاخ امن عسکری کے دروازے پر پہنچ گئے۔ اکثر لڑکیوں کے والد انھیں لینے آئے یا بھائی، مجھے لینے کوئی بھی نہ آیا۔

ایک اہل کار نے آ کر مجھ سے فون نمبر پوچھا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کیا جواب دوں۔ میں اسے کوئی پتا بھی نہیں دے سکتی تھی، بلکہ مجھے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کوئی زندہ بھی ہے جس کا میں نام لوں۔

انھوں نے ماجدہ کے گھر فون کیا کہ آ کر اپنی بیٹی کو لے جائیں۔انھوں نے اسے مذاق سمجھا اور فون بند کر دیا! اہل کار انھیں گھر جا کر لے کر آئے مگر وہ اب تک اسے ان کی چال ہی سمجھ رہے تھے۔ جب انھوں نے اسے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا، تو ان پر غشی چھانے کو تھی۔ انھوں نے اسے گلے لگالیا اور میری جانب دیکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیے، وہ ہولے سے بولے:

اور تم۔ تمھیں کون لینے آئے گا؟

اہل کار بھی مجھ سے پوچھنے لگا بلکہ سب ہی یہی سوچ رہے تھے میں کس کے ساتھ جاؤں گی، میں نے ہولے سے کہا: ماجدہ کے والد کے ساتھ۔

اتنی دیر میں ایک لڑکی کے بھائی نے کہا: اسے ہم اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔

جب میں نے ماجدہ کے والد کے ساتھ جانے کا کہا، اسی وقت میرے چچا کا فون بھی مل گیا، لیکن میری چچا اور چچی حمص میں تھے اور میری پھوپھی اپنے بچوں کے ساتھ ان کے گھر میں تھیں۔ ان کو خبر ملی کہ ہبہ رہا ہو گئی ہے اور اسے آ کر لے جاؤ، تو میری چچی ان سے کہنے لگیں:

یہ جھوٹ کہہ رہے ہیں، بلکہ اب فون آئے تو بند کر دینا!

انھوں نے دوبارہ فون کر کے کہہ دیا: ہبہ اپنی دوست ماجدہ کے گھر ہے، جا کر اسے لے آؤ۔

انھوں نے اہل کار کو حمص کا نمبر دے دیا تا کہ وہ ان سے خود بات کر لے، جب اس نے فون کیا تو میری چچی نے پوچھا:

آپ کون؟

بولا: بہی خواہ۔

چچا کے گھر والے ڈر گئے اور شک کا شکار ہو گئے۔ لیکن فون رکھ کر انھیں خیال آیا کہ ماجدہ کے گھر فون کر لیں، تا کہ خبر کا یقین ہو جائے، چچی نے فون کیا تو مجھ سے بات کرنا چاہی، لیکن میں نو برسوں میں فون پر بات کرنا ہی بھول چکی تھی۔ میری آواز سن کر وہ دوڑے چلے آئے،

انھوں نے مجھے گلے لگایا اور خوب پیار کیا۔ میں جامد کھڑی تھی، خوشی اور غم میں فرق کرنا مشکل تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اب کہاں جاؤں۔ گھر پہنچے تو سارا محلہ جمع تھا۔ عورتیں بچے اور مرد، سب مبارک باد اور دعائیں دے رہے تھے۔ ان کے چہروں پر کتنے ہی سوال تھے مگر وہ صرف الحمد للہ کہہ رہے تھے۔ میری چچی مجھے کھینچ کر اپنے قریب لے گئیں۔ ام ماجدہ بھی پیچھے کھڑی تھیں، ان کی خواہش تھی کہ میں آج رات ان کے ساتھ گزاروں۔ میرا دل بھی یہی چاہتا تھا۔ وہ میری ماں کی جگہ تھیں اور ان کی سہیلی بھی (رحمہا اللہ)۔ بلکہ انھوں نے ایک روز قبل ہی مجھے خواب میں دیکھا تھا کہ میں نے انھیں ایک کارڈ بھیجا ہے جس پر مسجدِ اقصیٰ بنی ہوئی ہے اور اس کے نیچے لکھا ہے:

**”سبحان الذی اسری بعبدہ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ“۔**

وہ شیخ صاحب سے اس کی تعبیر لینے گئیں تو انھوں نے بتایا کہ ہماری رہائی قریب ہے اور دوسرے ہی روز اس کی تعبیر مل گئی۔

## ظلم کے سائے

اور سن ۸۹ء کی اس تاریک اور ٹھنڈی رات جب میں اپنی چچی کے ساتھ ان کی گاڑی میں بیٹھی تو تقریباً تین بجے کا وقت تھا۔ میں شدید ٹھنڈ سے بچنے کے لیے سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔ گاڑی کبھی ایک جانب مڑ رہی تھی کبھی دوسری۔ میں جس جانب بھی نظر ڈالتی مجھے وحشت کے سائے نظر آتے۔ جو لوٹ مار اور قتل و غارت سات برس قبل ہوئی تھی اس کی تباہی کے آثار اب بھی نظر آ رہے تھے۔ ویران سڑکیں اپنے ویران دل کا حال سنا رہی تھیں۔ دور تک بکھری ہوئی خاک بتا رہی تھی کہ اس راکھ میں کتنے دلوں کی شجاعت دفن ہے۔ ان طوفانوں نے کتنے درخت جڑوں سے اکھاڑ ڈالے، کتنے کھیت خشک کر دیے اور اب وہاں کچھ نہیں اگتا۔

شہر کی ہر چیز بدل گئی تھی، بھرپور زندگی موت کے منظر میں بدل گئی تھی۔ اب جو زندگی تھی،

کیا وہ زندگی کہلانے کے قابل تھی، سب کچھ بدل گیا تھا۔ اتنے سال گزرنے کے بعد بھی صرف ایک چیز نہیں بدلی: مخابرات کی گاڑیاں۔ وہ اب بھی سڑکوں پر اسی طرح دوڑتی نظر آتیں، یا کسی بھی شکار کی تلاش میں بلا کسی تمہید اس کے سر پر جا پہنچتیں اور کسی بھی گھڑی سونے والوں کو ان کے خوابوں سمیت اچک لیتیں۔

اسی وقت مجھے سن ۸۰ء کی دمشق کی وہ آخری رات یاد آ گئی، جب میں نو برس پہلے برامکہ میں اپنے ہاسٹل کے کمرے میں امتحان کی تیاری میں مصروف تھی۔ ہاں پورے نو برس پہلے۔ اس رات جب مخابرات کی گاڑیوں نے آدھی رات کو پوری سڑک بلاک کر دی تھی اور ان کے سربراہ نے مجھ سے کہا تھا کہ میں صرف پانچ منٹ کے لیے ان کے ساتھ چلوں۔ صرف پانچ منٹ کے لیے...... پھر انھوں نے میری زندگی سے پورے نو برس کھسوٹ لیے اور میں آج تک نہیں جان پائی کہ کیوں!

میمونہ حمزہ فطری طور پر ایک معلّمہ ہیں۔ انھوں نے لاتعداد خواتین کو فکری طور پر بدل کر رکھ دیا ہے۔ انھوں نے اسلامیات اور عربی میں ماسٹرز کے بعد عربی لٹریچر میں ایم فل کیا اور اب عربی لٹریچر میں ہی پی ایچ ڈی کے آخری مراحل میں ہیں۔ ابتدا میں ڈگری کالج [ برائے خواتین ] مظفرآباد میں لیکچرار رہیں، بعدازاں جامعہ محصنات' اسلام آباد میں پرنسپل کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔ کچھ عرصہ عالمی اسلامی یونی ورسٹی' اسلام آباد میں اعزازی لیکچرار رہیں۔ ہمہ جہت مصروفیات کی وجہ سے وہ تدریس کا سلسلہ یک سوئی کے ساتھ جاری نہ رکھ سکیں۔اس کے باوجود تحقیق وجستجو کا کام انھوں نے ترک نہیں کیا۔ اگرچہ بہترین لکھنے والوں کی فہرست میں ان کا نام نیا نہیں،لیکن عربی لٹریچر سے بہترین شہ پاروں کو اردو میں منتقل کرکے انھوں نے اپنی مہارت کا لوہا منوالیا ہے۔ عربی زبان وبیان کی تمام تر اثر آفرینیوں کوانہوں نے اسی جذبے اور احساس کے ساتھ اردو میں ترجمہ کیا ہے کہ قاری پڑھتے ہوئے ذرا بھی تشنگی محسوس نہیں کرتا۔

دارالکفر میں حجاب ،کشمیری خواتین کی حالت زار ان کی معروف تصنیفات ہیں۔ عربی زبان کے شہرہ آفاق ناولوں سونے کا آدمی ، نور اللّٰہ ، ترکستان کی سیاہ رات کا ترجمہ اردو ادب میں نہ صرف قابل قدر اضافہ ہے بلکہ ان میں میمونہ حمزہ کی محنت کے نقوش بولتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

صرف ۵ منٹ: اسی محنت کا ایک اور منہ بولتا ثبوت ہے۔

محمد صغیر قمر _ کالم نگار

❖❖❖

# آپ کی لائبریری کے لیے منشورات کی کتب

قرآن پر عمل سے
خواتین کے معاشرتی مسائل کا حل:
منفرد تجربے، خواتین کی اپنی زبانی

سمیہ رمضان

قیمت: 110 روپے

۵۵ صحابہؓ کی
زندگیوں کے
ایمان افروز واقعات
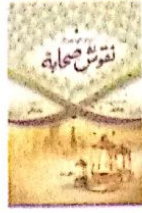
خالد محمد خالد

قیمت مجلد: 490 روپے

48 نومسلموں کے
قبول اسلام کے ایمان افروز واقعات

مرتب
خالد حامدی فلاحی

قیمت: 300 روپے

اخوان المسلمون کی ۱۶ مجاہد خواتین جنھوں نے ایک نئی تاریخ رقم کی۔
عصر حاضر میں غلبۂ دین کے لیے کام کرنے والی ہر اسلامی تحریک سے
وابستہ ہر فرد کے لیے ایک رہنما کتاب ـــــــ

ہر گھر کی ضرورت

مریم السید ہنداوی

قیمت: 210 روپے

اخوان المسلمون کے رہنما
حسن البناء شہید کی داستان حیات
جو داعیانِ حق کے لیے راہِ عمل ہے

ڈاکٹر اختر حسین عزمی

قیمت: 220 روپے

مُراد کرناز کی رودادِ اسیری
عبرت ناک ـــــ لرزہ خیز

تقریظات

الطاف حسن قریشی، اوریا مقبول جان، عظیم سرور

مُراد کرناز

قیمت: 250 روپے

پاکستان کے پہلے آمر مطلق جنرل ایوب خان کے اس
عہدِ ستم کی داستان جب سید مودودیؒ کی قیادت میں قافلہ
سخت جاں پابند سلاسل کر دیا گیا۔
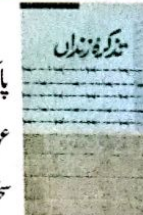
پروفیسر خورشید احمد

قیمت: 320 / 450 روپے

خُرّم مُراد
کے ان خطوط کا مجموعہ جو انھوں نے
ایامِ اسیری میں ڈھاکہ جیل سے تحریر کیے
ہر تحریک کے ہر کارکن کے لیے قیمتی یادداشتیں

خُرّم مُراد

قیمت: 60 روپے

مسلم اُمّہ اور وطن عزیز کے سلگتے مسائل
حکمرانوں کی بے حسی اور کم ہمتی کا ذکر
صغیر قمر کے دل نشیں انداز میں

صغیر قمر

قیمت مجلد: 390 روپے

خطۂ جنت نظیر کشمیر کی سیاحت کا دل چسپ سفرنامہ

جموں اور سری نگر کا جذبات انگیز اور معلومات افزا تذکرہ

ظفر حسین ظفر

قیمت: 250 روپے

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور۔ 54790، فون: 042-3543 4909، فیکس: 042-3543 4907

manshurat@hotmail.com

04214